خطباتِ حجاز

جلد دوم

مؤلف

مولانا جنید احمد سیوانی قاسمی

سابق استاذ دار العلوم، دیوبند

خطباتِ حجاز

جلد دوم

تاثرات و دعائیہ کلمات

محبوب العلماء والصلحاء، حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب
نقشبندی مجددی مدظلہ العالی

مقدمہ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم دیوبند، انڈیا

مؤلف

مولانا جنید احمد سیوانی قاسمی

سابق امام وخطیب مسجد الرضوان، جدہ، سعودی عرب
سابق استاذ دارالعلوم، دیوبند

ناشر

AL-HARAM

مکتبہ الحرم، دیوبند، انڈیا

جملہ حقوق محفوظ ہیں ©

کتاب کا نام	:	خطباتِ حجاز
مؤلف	:	مولانا جنید احمد سیوانی قاسمی
طبع اول	:	۱۴۴۵ھ=۲۰۲۴ء
صفحات	:	۳۶۵
قیمت	:	......
ناشر	:	مکتبہ الحرم، دیوبند، انڈیا Mob: 8859220801

Book's Name	:	Khutbat – e – Hijaz
Author	:	Maulana Juned Ahmad Siwani
First Published	:	2024
Published by	:	Maktaba Al Haram Deoband, INDIA Mob: 8859220801

فہرست

○ تأثرات اور دعائیہ کلمات ـــــ محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی مدظلہ العالی ـــــ ۱۵
○ مقدمہ ـــــ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ العالی ـــــ ۱۶
○ حرفِ آغاز ـــــ مؤلف ـــــ ۱۸

اخلاصِ نیت ۲۳

○ قبولیتِ اعمال کی دو بنیادی شرطیں ـــــ ۲۳
○ اخلاص نیت کی تاثیر ـــــ ۲۴
○ اخلاص کی وجہ سے جائز خواہشات کی تکمیل بھی باعث اجر ـــــ ۲۶
○ اخلاص کی ضد ریا ہے ـــــ ۲۷
○ ریاء کے ساتھ کیا ہوا عمل ناقابل قبول ـــــ ۲۹
○ اگر خالق و مخلوق دونوں کی رضا مقصود ہو؟ ـــــ ۳۰
○ مخلص شخص گم نامی کو شہرت پر ترجیح دیتا ہے ـــــ ۳۱
○ داہنے ہاتھ سے دیا ـــــ بائیں کو خبر نہ ہوئی ـــــ ۳۲
○ کثرت عمل سے زیادہ اہم نیت کی درستگی ـــــ ۳۴

ایک مسلمان کے حقوق دوسرے مسلمان پر... ۳۶

○ عبادت کا وسیع مفہوم ـــــ ۳۶
○ مسلمان بھائی کے حقوق کی ادائیگی بھی عبادت ہے ـــــ ۳۶
○ مسلمان کی خیر خواہی اور اس کی نصرت ـــــ ۳۹

○ ایذا رسانی حرام ہے ۴۱
○ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ تواضع اور انکساری کا معاملہ ۴۳
○ قطعِ تعلق کی ممانعت ۴۴
○ نفرت وعداوت کا سدباب ۴۵
○ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت ۴۹

استغناء اور معاشی استحکام ۵۱

○ تمہید ۵۱
○ استغناء اور عزتِ نفس ۵۲
○ انبیائے کرام علیہم السلام کا استغناء اور رزق حلال کے لیے (پیشے سے وابستگی) ۵۳
○ صحابۂ کرامؓ کا استغناء اور کسبِ حلال کے لیے شوقِ عمل ۵۵
○ حضرت فاطمہ بنت محمد ﷺ کی خانگی زندگی ۵۷
○ جائز پیشہ اختیار کرنا بے روزگاری اور ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے ۵۹
○ ایک محنت شعار گورنر صحابی کا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ۶۱
○ ناداری سے اللہ کی پناہ ۶۲

انسانی زندگی پر ایمان ویقین کا اثر ۶۵

○ قانونِ قدرت ۶۵
○ اہلِ حق کی آزمائش ۶۶
○ مصائب کے مقابلے میں ”ایمان“ کا معجزانہ کردار ۶۸
○ اسی سے زمین وآسمان قائم ہیں ۷۰
○ ایمان کی کرشمہ سازی ۷۳

○ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا ______ ۷۵

بداخلاق "بزرگ" ۷۶

○ عبادات میں اخلاق کا پہلو ______ ۷۶
○ بعثتِ نبوی کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل ______ ۸۰
○ بداخلاق عبادت گزار کا بدترین انجام ______ ۸۰
○ پیغمبرِ اسلام کی نظر میں اخلاق کا مقام و مرتبہ ______ ۸۳

مالِ حرام کی نحوست ۸۸

○ نادار انسان ______ ۸۸
○ "مُعاملات" سچے مسلمان کے لیے کسوٹی ______ ۹۰
○ حرام کمائی کا انجام ______ ۹۲
○ حرام مال کے مختلف ذرائع ______ ۹۵
○ لقمۂ حلال ـــــــ تقوے کی اعلیٰ مثال ______ ۱۰۱
○ خلاصۂ گفتگو ______ ۱۰۲

انسانی معاشرے کا نہایت قابلِ احترام گروہ . ۱۰۴

○ سن رسیدہ لوگ ______ ۱۰۴
○ سن رسیدہ مسلمان کے لیے بشارت ______ ۱۰۷
○ صالح تربیت اور بڑوں کا احترام ______ ۱۰۹
○ عمر رسیدگی کے مثبت پہلو ______ ۱۰۹
○ درازیٔ عمر اور حسنِ عمل کی فضیلت ______ ۱۱۲

○ بڑھاپا تادیر باقی رہنے کی آرزو ۱۱۳
○ بدترین پیرانہ سالی سے پناہ کی دعا ۱۱۵
○ مذکورہ بالا دعا کی قبولیت کے دو واقعے ۱۱۵

تنگ دستی اور مال داری — شریعت کی نظر میں ۱۱۷

○ تنگ دستی — شریعت کی نظر میں ۱۱۷
○ تنگیٔ معاش اور تسکینِ قلب ۱۱۹
○ تنگ دستی کے اسباب و عوامل ۱۲۱
○ تنگ دستی کا علاج ۱۲۵
○ مال و دولت کی فراوانی — شریعت کی نظر میں ۱۲۸

اتحادِ امت ۱۳۱

○ عزت وذلت کے اسباب و عوامل ۱۳۱
○ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "امتِ واحدۃ" قرار دیا ہے ۱۳۲
○ تفریقِ ملت کے اسباب و عوامل ۱۳۴
○ عہدِ نبوی میں ایک یہودی کی شرارت اور فتنہ انگیزی ۱۳۴
○ اجتماعیت کی بنیاد "حبلُ اللّٰہ" ۱۳۷
○ خبردار! اختلافات سے بچے رہنا ۱۳۹
○ ہمارا آپسی اختلاف، دشمنوں کے لیے مزدۂ جاں فزا ۱۴۰
○ فرقہ واریت کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ۱۴۱
○ خلاصۂ گفتگو ۱۴۲

حبشہ کی پہلی ہجرت ــــــ اسباب ونتائج ... ۱۴۳

- ہجرت کے اسباب ۱۴۳
- مہاجرین کی روانگی اور کفارِ مکہ کی بے چینی ۱۴۴
- قریش کے نمائندوں کی شاہِ حبشہ کے دربار میں حاضری ۱۴۵
- دربارِ شاہی میں مہاجرین کی پیشی ۱۴۶
- شاہ نجاشی کی مجلس میں حضرت جعفر بن ابی طالب کا بے باک خطاب ۱۴۷
- سورۂ مریم کی تلاوت اور نجاشی پر اس کا رقّت انگیز اثر ۱۴۸
- دوبارہ نجاشی کے دربار میں حاضری اور قریش کے نمائندوں کی نئی چال ۱۴۹
- بادشاہ کا سوال اور حضرت جعفرؓ کا جواب ۱۵۰
- دس سال بعد مسلمان مہاجرین کی مدینہ منورہ واپسی ۱۵۱
- اس قصے کے سبق آموز پہلو ۱۵۲

خوش گوار زندگی ۱۵۶

- پر لطف زندگی بسر کرنے والے لوگ ۱۵۶
- خوش گوار زندگی کے اسباب ووسائل ۱۵۷
- ایک صحابیؓ کا نماز کے ساتھ والہانہ شغف ۱۵۸
- خوش گوار زندگی کا ایک عظیم سرچشمہ قرآن کریم ۱۶۰
- حیاتِ سعیدہ اور دعوت الی اللہ ۱۶۲
- ضرورت مندوں کی حاجت روائی ۱۶۳
- قناعت اور راضی بہ رضائے الٰہی ۱۶۴
- لوگ کیا کہیں گے...؟ ۱۶۵

○ کینہ اور حسد ۱۶۶

اعتدال اور میانہ روی ۱۶۷

○ اقتصادی قوت کی اہمیت ۱۶۷
○ قرآن کریم کی واضح تعلیمات ۱۶۷
○ فضول خرچی کی تباہ کاریاں ۱۶۸
○ مؤمن، اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرتا ہے ۱۶۹
○ اسراف کے مظاہر ۱۷۲
○ روشنی وغیرہ کے استعمال میں اسراف ۱۷۲
○ تقریبات اور دعوتیں ۱۷۳
○ ملبوسات میں اسراف ۱۷۴
○ گھروں کی سجاوٹ میں سادگی ۱۷۶
○ خلاصۂ گفتگو ۱۷۷

غصہ — اسباب ونتائج اور علاج ۱۸۰

○ «لَا تَغْضَبْ» غصہ نہ کرو ۱۸۰
○ غصہ پینے کے فوائد ۱۸۱
○ غصے کی دو قسمیں ۱۸۳
○ محض غصے کا آنا قابل مذمت نہیں ۱۸۴
○ حضرت عمرؓ کے غصے کی حرارت کو قرآن کی آیت نے ٹھنڈا کر دیا ۱۸۶
○ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا حِلم ۱۸۷
○ غصّے کا علاج ۱۸۹

رنج وغم ــــ ایک جائزہ اور حل ۱۹۳

- رنج وغم کے سلسلے میں دو نظریے ۱۹۳
- دنیا اور آخرت کی فکروں کے درمیان توازن ۱۹۵
- اپنے فکری رجحان کو کیسے معلوم کریں ۱۹۶
- رسول اللہ ﷺ کی فکر وسوچ اور مقصد زندگی ۱۹۷
- صحابۂ کرامؓ کا دائرۂ فکر ونظر ۲۰۰
- دنیاوی ہموم وغموم کا علاج ۲۰۳

ظلم اور اس کا بدترین انجام ۲۰۶

- اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے ۲۰۶
- ظلم کی تین قسمیں ۲۰۷
- ملازمت کے باب میں ظلم وستم ۲۰۹
- ایک ظالم حکمراں کا عبرت ناک انجام ۲۱۰
- مظلوم کی بددعا سے بچو ۲۱۱
- ایک مظلوم کی بددعا اور اس کی قبولیت کا واقعہ ۲۱۳
- ظلم کی مزید صورتیں ۲۱۵
- دوسروں پر کیے گئے مظالم کا کفارہ ۲۱۶
- ظلم کی تیسری قسم "اپنی ذات پر ظلم" اور اس کا کفارہ ۲۱۸

انسان کی قدر وقیمت اسلام کی نظر میں ۲۲۰

- تکریم کی پہلی بنیاد ۲۲۰
- دوسری بنیاد: تکریمِ انسانی ۲۲۲

- انسان کی تکریم جنین سے جنازے تک ۲۲۵
- بلاتفریق ہر انسان قابلِ احترام ہے ۲۲۶
- اسلامی عدالت اور انسانی قدر وقیمت ۲۲۸
- اپنی قوم سے خطاب ۲۳۰

توبہ واستغفار کی اہمیت ۲۳۲

- زندہ دل انسان ۲۳۲
- بڑے گناہوں سے اجتناب، چھوٹے گناہوں کا کفارہ ۲۳۴
- کِفل کی توبہ اور اعلانِ مغفرت ۲۳۵
- انسان سے گناہ کا ارتکاب باعث تعجب نہیں... ۲۳۶
- ایک شخص کی توبہ کا دلچسپ قصہ ۲۳۸
- گناہوں سے کیسے بچیں؟ ۲۴۱
- غائبانہ خشیتِ الٰہی اور اس کا صلہ ۲۴۱

علم حاصل کیجیے! ۲۴۴

- پہلی وحی ۲۴۴
- علم اور اہل علم کی فضیلت ۲۴۵
- تحصیلِ علم کے لیے مجاہدہ اور قربانی ۲۴۷
- علم میں برکت کے لیے دعاء ۲۴۹
- علم سے مراد کون سا علم ہے؟ ۲۵۰
- علم اور اہل علم کے سلسلے میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے زرّیں اقوال ۲۵۳
- ضرورت کے لیے مختلف زبانوں میں مہارت ۲۵۴

○ بقائے علم بقائے علماء سے ۲۵۵

نیکی میں تعاون اور برائی میں عدمِ تعاون ۲۵۷

○ نیکی اور تقویٰ میں تعاون ۲۵۷
○ صنعتی شہروں کا قیام ...۲۵۹
○ صلح وصفائی کی کوشش ۲۶۰
○ ہر شخص اپنے دائرۂ حیات میں نیکی میں تعاون کا مکلَّف ہے ۲۶۲
○ گناہ اور ظلم وزیادتی میں عدم تعاون ۲۶۳
○ اہلِ باطل کا دفاع، برائی میں تعاون ہے ۲۶۵
○ جھوٹی گواہی — گناہ پر اعانت ۲۶۶
○ ناجائز امور میں باہمی تعاون پر سخت وعید ۲۶۷
○ خلاصۂ گفتگو ۲۶۸

مشکل حالات اور اسلامی تعلیمات ۲۶۹

○ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی سخت آزمائشیں اور ان کا صبر ۲۷۱
○ صبر — فضائل اور اجروثواب ۲۷۵
○ بیماریاں گناہوں کا کفارہ ۲۷۷
○ صبر کی قسمیں ۲۷۸
○ اہل صبر کے لیے اللہ کی خصوصی عنایت ورحمت اور ہدایت ۲۸۰
○ دعائے کرب وبلا ۲۸۱

خلیفۂ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ — سیرت وکردار ۲۸۳

○ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کا اعلان ۲۸۴

○ حضرت عمر اور ان کی خدا ترس بیوی فاطمہ ۲۸۵
○ صالح فرزند کی اپنے والد گرامی کو نصیحت ۲۸۶
○ ظالم وزراء کی معزولی ۲۸۷
○ مغصوبہ جائدادوں کی بازیابی ۲۸۷
○ ہزار درہم کی انگوٹھی کا واقعہ ۲۸۸
○ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ذاتی زندگی ۲۸۹
○ حضرت عمرؒ کی زاہدانہ زندگی ۲۹۱
○ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تقویٰ ۲۹۲
○ رسول اکرم ﷺ داعی بنا کر مبعوث کیے گئے تھے نہ کہ مال جمع کرنے کے لیے ۲۹۴
○ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت اور عدل وانصاف ۲۹۵
○ مرض الموت اور حسنِ خاتمہ ۲۹۷

تقدیر پر ایمان ۳۰۰

○ تقدیر پر ایمان کے چار مراتب ۳۰۱
○ تقدیرِ مُبرم اور مُعلّق ۳۰۳
○ تقدیرِ مُجمل اور تقدیرِ مُفَصَّل ۳۰۴
○ تقدیر الٰہی اور انسان کے اختیارات ۳۰۶
○ تقدیر کے مسئلے میں غلط فہمی ۳۰۶
○ معصیت کو تقدیر سے جوڑنا نامعقول ۳۰۸
○ تقدیر پر ایمان کے فوائد ۳۰۹
○ ایک وضاحت ۳۱۲

تین قسم کے انسان ۳۱۴

○ پہلی قسم کے لوگ ۳۱۴
○ خوش حالی میں اللہ کو پکارنے کا ثمرہ ۳۱۷
○ صحابۂ کرامؓ کا معاملہ رب ذوالجلال کے ساتھ ۳۱۸
○ دوسری قسم کے لوگ ۳۱۹
○ سرکشی اور آخرت فراموشی کی وجہ ۳۲۲
○ تیسری قسم کے لوگ ۳۲۳

ماہِ رمضان کی بشارت اور حسنِ استقبال ۳۲۶

○ نبوی بشارت ۳۲۶
○ روزے دار کا خصوصی اکرام ۳۲۹
○ رمضان میں پانچ انعامات کا اعلان ۳۲۹
○ مہمان خصوصی کے لیے مراسم استقبال ۳۳۰
○ نماز باجماعت ۳۳۵
○ کینہ، حسد، عداوت اور قطع رحمی سے باطن کی صفائی ۳۳۵

رمضان کے روزے ــــــ منافع وآداب ... ۳۳۹

○ روزے کا اثر انسانی روح اور جسم پر ۳۳۹
○ روزہ اور صبر ۳۴۰
○ روزہ اور نفس امّارہ کی ہزیمت ۳۴۱
○ روزہ اور نعمتوں کی قدر دانی ۳۴۲
○ روزہ اور صدقات وخیرات ۳۴۳

○ روزہ اور تواضع وانکساری ۳۴۴
○ روزہ اور وحدتِ امت ۳۴۵
○ روزہ اور طاعات کی رغبت ۳۴۶
○ روزہ اور جسمانی صحت ۳۴۶
○ روزے کے آداب ۳۴۷
○ سحر میں تاخیر اور افطار میں جلدی ۳۴۹
○ مبارک راتیں ۳۵۰

اِسراء اور معراج کی حقیقت ۳۵۲

○ ایک عجیب سوال ۳۵۲
○ اسراء اور معراج دو چیزیں ہیں ۳۵۳
○ شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی ۳۵۵
○ طائف کا دعوتی سفر اور اہل طائف کی سنگ دلی ۳۵۵
○ اکرامِ مصطفیٰ ﷺ اسراء اور معراج کے ذریعہ ۳۵۹
○ معراج جسمانی تھی یا روحانی؟ ۳۶۰
○ قصۂ اسراء و معراج کے دروس ونتائج ۳۶۱
○ تحفۂ نماز اور ہماری ذمے داری ۳۶۲

* * *

تاثرات اور دعائیہ کلمات

از محبوب العلماء والصلحاء حضرت اقدس مولانا پیر
ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

جمعۃ المبارک کے بیانات و خطبات، دعوتِ دین اور اسلامی تعلیمات کو معاشرہ میں پھیلانے اور ہر خاص وعام تک پہنچانے کا وہ مقبول و معروف سلسلہ ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ الحمد للہ مولانا جنید احمد سیوانی صاحب کے نہایت محنت و اخلاص سے دیے گئے یہ بیانات جو کہ دین کے تقریبًا تمام شعبوں سے متعلق ہیں، کافی جامع اور مفید ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت انہیں صدق و اخلاص اور اپنی رضائے کاملہ عطا فرمائیں اور ان خطبات کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر ان کے لیے ذریعہ نجات بنائیں اور پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے، آمین۔

كان الله له عوضًا عن كل شيء

(حضرت مولانا پیر) فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

۱۸/ جنوری ۲۰۲۴ء

مقدمہ

حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب نعمانی مدظلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماشاء اللہ خطباتِ حجاز کی جلد دوم اور سوم بھی منظرعام پہ آگئی، تینوں جلدوں کے عناوین اور مضامین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ مؤلف کتاب جناب مولانا جنید احمد صاحب نے ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور معاشرت کے موضوعات پہ نہایت خوب صورتی کے ساتھ مؤثر انداز میں خطبات پیش کیے ہیں، جو تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے ان شاء اللہ مفید اور معاون ثابت ہوں گے۔

ہماری دعاء ہے کہ مولائے کریم اس خدمت و کاوش کو مؤلف موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، قبول فرمائے اور امت کو اس سے نفع پہنچائے۔

جلد اول کے مقدمے میں تحریر کیا گیا تھا:

"خطباتِ حجاز" کے نام سے تذکیر و موعظت پر مشتمل معتبر مضامین کا مجموعہ سامنے آیا، جو اپنے نام کا صحیح مصداق ہے کہ وہ اُن خطبات کا خلاصہ ہے جو اس کے مؤلف محترم نے حجاز مقدس کے مشہور شہر "جدہ" کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز سے پہلے پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کی فہرست سے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ

ضرورت کے بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، یہ جلد جو مؤلف موصوف کے بیان کے مطابق اس کتاب کی پہلی جلد ہے، تقریباً تیس عنوانات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں خاص بات یہ ہے کہ متعلقہ موضوع پر آیات واحادیث اور معتبر واقعات ایک ایسے انداز میں جمع کیے گئے ہیں، جو قاری اور سامع پر اثرانداز ہوتا ہے، کتاب پر نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرسری تقاریر کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ محنت سے تیار کیے گئے عربی خطبات کا وہ خلاصہ ہے جسے صاحبِ خطبات نے خود سلیقہ کے ساتھ اردو کا جامہ پہنایا ہے، کتاب کی زبان میں سلاست اور بیان میں تاثیر ہے۔

مؤلف کتاب جناب مولانا جنید احمد صاحب سیوانی زید مجدہ، جدہ میں امامت وخطابت سے پہلے، دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ شعبۂ عربی کے استاد کی حیثیت سے کئی سال تدریسی خدمت انجام دے چکے ہیں، پھر جدہ منتقل ہو گئے اور پچیس سال سے وہاں ایک مسجد کے امام وخطیب ہیں۔

میری دعاء ہے کہ اللہ رب العزت موصوف کی اس کتاب کو مقبولیت عطاء فرمائے اور اُن کو مزید علمی ودینی خدمات کی توفیق سے نوازے۔ آمین

والسلام

(مولانا ومفتی) ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۵/ شوال ۱۴۴۵ھ

۱۵/ اپریل ۲۰۲۴ء بروز پیر

بسم الله الرحمن الرحيم

حرفِ آغاز

الْحَمد لله رب الْعَالمين، وَالصَّلَاة وَالسَّلَام على سيدنَا ونَبِيّنا مُحَمَّدٍ وعَلى آله وَأَصْحَابه أَجْمَعِينَ.

"خطباتِ حجاز" کی جلد اول کی طباعت کے بعد یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ جلد ہی دوسری اور تیسری جلد کا کام ایک ساتھ مکمل کر کے بیک وقت دونوں کی طباعت کرائی جائے، لیکن قدرتی طور پر ان کے ترجمے اور مسوّدے کی تیاری میں اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا، جس کے پیچھے ناگہانی اور غیر متوقع اسباب تھے، تاہم دیگر مصروفیات کے باوجود محض اللہ کی توفیق سے ان دونوں جلدوں کا کام پورا ہو گیا اور کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر کر اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جلدِ اول کے پیش لفظ میں لکھا گیا تھا:

"راقم الحروف ۱۴۱۷ھ = ۱۹۹۶ء سے سعودی عرب کے مشہور شہر جدہ کی ایک جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہا ہے، سینکڑوں موضوعات پہ خطبے پیش کیے، عام طور پر بیس پچیس منٹ خطبے کا وقت ہوتا ہے، ہر سال کی مخصوص عبادتوں کی مناسبت سے کچھ خطبوں کے موضوعات تومکرر ہوتے ہیں، ان کے علاوہ

سارے خطبے متنوّع اور جدید موضوعات پر دیے جاتے ہیں: عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور معاشرت وغیرہ کے موضوعات ان میں شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح اس عاجز کے پاس مختلف عناوین کے سینکڑوں خطبات جمع ہو گئے۔

متعدّد مخلص دوستوں اور بزرگوں نے بارہا تقاضا کیا کہ ان خطبات کی عربی (جس زبان میں پیش کیے گئے) اور اردو، دونوں زبانوں میں طباعت ہونی چاہیے، تاکہ ان کا نفع مزید عام ہو جائے۔ اللہ کی توفیق سے عربی سے قبل ہی اردو زبان میں ترجمے اور طباعت کی ابتدا ہو رہی ہے۔

راقم نے خود ہی ان خطبات کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے... ہر خطبے کے شروع میں مفصل حمد وصلاۃ اور تقوے کی تلقین کے ساتھ اس سے متعلق چند آیات کی تلاوت کی جاتی ہے، جن کو طوالت کے اندیشے سے حذف کر دیا گیا ہے، نیز، ہر جمعے میں دو خطبے دیے جاتے ہیں جن کو ترجمہ کرتے وقت مضمون کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے ایک کر دیا گیا ہے۔

ان خطبات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی مقدس آیات تو ذکر کی ہی گئی ہیں، ساتھ ہی مستند اور قابل اعتماد روایات بھی ذکر کی گئی ہیں، غیر مستند اور ناقابل اعتماد روایات سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے...“۔

۲۰۲۱ء میں پہلی جلد کی طباعت ہوئی تھی، اس وقت سے اب تک قارئین کرام کے بہت سارے مثبت اور حوصلہ افزا تبصرے موصول ہوئے، بالخصوص مساجد کے ائمۂ کرام نے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کتاب کی افادیت اور حسن اسلوب کی پذیرائی کی، عمومی طور پر کتاب کے دلچسپ عناوین، سہل اسلوب، حسنِ کتابت وطباعت اور قرآن وسنت کے

نصوص سے مُدلّل مضامین کا ذکر ان تبصروں میں ملتا ہے، جس کے لیے میں ان سبھی حضرات کا شکرگزار ہوں۔

ان حوصلہ افزا تبصروں کے ضمن میں ایک ایسی مبارک اور ہر دل عزیز شخصیت کا تبصرہ بھی ہے جسے یہاں نقل کرنے کے لیے دل بے تاب ہے:

۴/ رمضان المبارک ۱۴۴۳ھ کی شام میں مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین پر حاضری ہوئی، وہاں عالم اسلامی کی معروف روحانی شخصیت محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار صاحب نقشبندی مجددی (حفظہ اللہ تعالیٰ ومتّعہ بالصحۃ والعافیۃ وبارک فی عمرہ) سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ ملاقات پہلی نہ تھی، بلکہ پچھلے کئی سالوں سے حضرت والا کی زیارت اور فیض یابی کی سعادت مل رہی ہے، چناں چہ حضرت والا کی خدمت میں اپنی کتاب خطباتِ حجاز کی پہلی جلد پیش کی، تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر جدہ واپس ہوگیا۔

رات میں میرے مخلص ومحسن دوست حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زید مجدہ استاذ دارالعلوم دیوبند کا فون آیا، جو اس وقت مکہ مکرمہ میں تشریف رکھتے تھے، فرمایا کہ حضرت (پیر صاحب) نے آپ کو طلب فرمایا ہے، کل شام کی مجلس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔

چناں چہ ۵/ رمضان المبارک کو شام کی خصوصی مجلس میں حاضر ہوگیا، جس میں دس سے زائد شرکا موجود تھے، جو تقریباً سارے ہی حضرت کے خلفا اور مُجازِ بیعت تھے۔

اس طلب کا اصل مقصود تو عقیدہ وسلوک، دعوت وارشاد اور اصلاحِ امت کے راہ نما اصولوں پر روشنی ڈال کر ان کی اہمت کو بیان کرنا اور ان کی ذمے داری

ہمارے کاندھوں پر ڈالنا تھا، لیکن آغازِ مجلس میں ہی ان تمام حضرات کے سامنے حضرت نے اس کتاب کے حوالے سے گفتگو فرمائی اور خوب صورت انداز میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوے اس کے مطالعے کا بھی مشورہ دیا، جسے میں اپنے لیے باعثِ صد افتخار اور کتاب کی قدر وقیمت کے لیے بڑی سند سمجھتا ہوں۔

دوسری اور تیسری جلد کی طباعت سے قبل حضرت نے راقم پر مزید احسان فرمایا اور خطبات سے متعلق اپنے قیمتی تاثرات اور دعائیہ کلمات تحریری شکل میں عنایت فرمائے جس کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

ترجمے کا کام نہایت دقیق، لطیف اور نازک کام ہے، اصل زبان اور ترجمے والی زبان دونوں پر مترجم کی بھرپور گرفت ہونا ناگزیر ہے، ورنہ اصل مفہوم کی ادائیگی کما حقہ نہیں ہوپائے گی۔ راقم نے اپنی کم مائیگی کے باوجود حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہے، بلکہ آزاد ترجمہ کرکے اصل زبان کی روح کو برقرار رکھتے ہوے، اردو زبان کے قالب میں نہایت آسان، شستہ اور سلیس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ مشکل الفاظ وتعبیرات سے پرہیز کرنے کے ساتھ کتاب کو غیر معیاری اسلوب سے بھی محفوظ رکھنے کی اپنی بساط کی حد تک سعی کی ہے۔ املا نویسی کے حوالے سے بھی اس کتاب میں اردو کے جدید رسم الخط کا بہت حد تک پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

کتاب کی طباعت کے سلسلے میں جن کرم گستروں نے تعاون کیا ہے ان کا تہہ دل سے شکر گزار اور ان کے لیے دعا گو ہوں، بالخصوص عزیز القدر مولانا ڈاکٹر قمر الدین صاحب قاسمی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کتابت وطباعت کے سلسلے میں نہ صرف رہنمائی کی، بلکہ اپنا قیمتی وقت فارغ کرکے عملی طور پر بے لوث ہوکر ہر مرحلے میں اس عاجز کے لیے دست وبازو

بنے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور تمام معاونین کو اجر عظیم اور دارین کی سعادتیں عطا فرمائیں۔

مولائے کریم اس کاوش کو قبول فرما کر اسے میرے لیے اور میرے والدین کے لیے صدقۂ جاریہ، ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے، والدین کی قبروں پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، نیز پوری امت مسلمہ کے ساتھ عفو و عافیت اور رحم و کرم کا معاملہ فرمائے۔

جنید احمد سیوانی قاسمی

۲۰/جنوری ۲۰۲۴ء

موبائل:00966,551446792

ای میل:j.ahmad68@gmail.com

❋ ❋ ❋

۲۴/صفر ۱۴۲۷ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

اخلاصِ نیت

قبولیتِ اعمال کی دو بنیادی شرطیں

ہمارے اعمال کی قبولیت کے لیے دو بنیادی شرطیں ہیں، ایک یہ کہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوں، دوسرے یہ کہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہوں، اگر ان دونوں میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہوگئی تو کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوگا۔ اسی لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ» [متفق عليه]

”بلاشبہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کو نتیجہ میں وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی، لہٰذا اگر کسی کی ہجرت (ترک وطن) اللہ اور اس کے رسول کی رضا

کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی، اور اگر کسی کی
ہجرت دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہوگی تو اس کی
ہجرت ان ہی کاموں کے لیے ہوگی" [متفق علیہ]

اخلاص نیت کی تاثیر

اخلاصِ نیت بھی عجیب وغریب شئ ہے، جس عمل میں اخلاص ہوتا ہے وہ اس عمل کو خوب صورت، طاقت ور، عظیم المرتبت، بابرکت اور نورانی بنادیتا ہے، اور جو عمل اخلاص سے خالی ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے جسم بغیر روح کے ہو اور انسانی ڈھانچہ بغیر جان کے ہو۔ حضرت عبداللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں:

«رُبَّ عَمَلٍ صَغِيرٍ تُعَظِّمُهُ النِّيَّةُ، ورُبَّ عَمَلٍ كَبِيرٍ تُصَغِّرُهُ النِّيَّةُ»

"بعض دفعہ چھوٹے سے عمل کو نیت بہت بڑا بنادیتی ہے اور بعض دفعہ بڑے عمل کو نیت (کی خرابی) چھوٹا بنادیتی ہے"۔

انسان جو خیر و بھلائی کے کام کرتا ہے یا عبادات انجام دیتا ہے ان کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا پیمانہ اخلاص ہے، اگر ان میں اخلاص ہے تو وہ اللہ کے لیے ہوں گے اور اگر اخلاص کے بغیر ہیں تو مردود ہوں گے، خواہ وہ مقدار میں پہاڑ کی طرح ہوں یا ظاہری شکل وصورت میں دیدہ زیب اور پرفریب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اخلاص کے سلسلہ میں واضح طور پر فرمایا:

﴿وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ﴾[البينة: ٥]

"اور انھیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں،

اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں"۔[سورۃ البینۃ:۵]

چوں کہ اخلاص کا تعلق باطن سے ہے نہ کہ ظاہری زیب وزینت سے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ دل میں تم نے کیا چھپا رکھا ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔

﴿ قُلْ إِن تُخْفُوا۟ مَا فِى صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ ٱللَّهُ ﴾

[سورة آل عمران: ٢٩]

"اے رسول! لوگوں کو بتادیجیے کہ جو تمہارے دلوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، (بہرحال) اللہ اسے جانتا ہے"۔[سورۃ آل عمران:۲۹]

امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَامِكُمْ وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ»

"اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور شکلوں کو نہیں دیکھتے؛ بلکہ تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتے ہیں"۔

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے تین طرح کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا اور دریافت کیا گیا کہ ان میں سے اصل مجاہد کون ہے جس کا جہاد "فی سبیل اللہ" کہلانے کا مستحق ہو: ایک شخص دلیری اور بہادری کی نمائش کے لیے لڑتا ہے، دوسرا شخص قومی یا خاندانی عصبیت کے تئیں، اور تیسرا شخص نام ونمود کے حصول کے لیے۔ تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِي سَبِيلِ

اللهِ». [متفق علیہ]

”جو شخص صرف اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے جہاد کرے گا وہی ”فی سبیل اللہ“ کہلائے گا“۔[متفق علیہ]

اخلاص کی وجہ سے جائز خواہشات کی تکمیل بھی باعث اجر

ہر وہ عمل جس میں اخلاص کی آمیزش ہو، اخلاص کے پاکیزہ پانی میں دھلا ہوا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے، اس پر اجرِ عظیم ملتا ہے اور دخولِ جنت کا سبب بنتا ہے۔ اس کا تعلق صرف نماز، روزہ اور حج وزکاۃ سے ہی نہیں ہے؛ بلکہ تمام اعمالِ صالحہ، یہاں تک کہ کسبِ حلال، حلال مال کو اپنی جان پہ اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پہ خرچ کرنا بھی اسی میں شامل ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِيْ بِهَا وَجْهَ اللهِ إِلَّا أُجِرْتَ عليْهَا، حَتَّى مَا تَجْعَلُه فِي فَمِ امْرَأَتِكَ» [متفق عليه]

”اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تم جو کچھ خرچ کروگے، تمہیں اس پر ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ میں ڈالوگے (اس پر بھی ثواب ملے گا)۔

[متفق علیہ]

بلکہ جو شخص اپنی بیوی سے صنفی میلان میں عفتِ نفس اور اپنے دین کی حفاظت کی نیت کرتا ہے تو اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«وفِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ» ”تم میں کا کوئی صحبت کرتا ہے اس پر

بھی اسے صدقہ کا ثواب ملتا ہے"۔ [مسلم شریف]

ایک روایت میں ہے:

«مَا أَطْعَمْتَ نَفْسَكَ فَهُوَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَمَا أَطْعَمْتَ وَلَدَكَ فَهُوَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَمَا أَطْعَمْتَ زَوْجَكَ فَهُوَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَمَا أَطْعَمْتَ خَادِمَكَ فَهُوَ لَكَ صَدَقَةٌ» [مسند الإمام أحمد]

"جو تو اپنے آپ کو کھلائے گا، وہ تیرے لیے صدقہ ہوگا، جو تو اپنی اولاد کو کھلائے گا، وہ تیرے لیے صدقہ ہوگا، جو تو اپنی بیوی کو کھلائے گا، وہ تیرے لیے صدقہ ہوگا اور جو تو اپنے خادم کو کھلائے گا، وہ بھی تیرے لیے صدقہ ہوگا"۔ [مسند احمد]

اللہ اکبر! یہ ہیں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں، اس کی کرم نوازیاں، اس کی عنایتیں اور اس کی مہربانیاں۔ جب ایک شخص اس کی ذات اقدس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور نیت خالص کر لیتا ہے تو اس کی حرکات و سکنات، اس کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا یہاں تک کہ مقام مباح میں شہوت پوری کرنا بھی باعث اجر و ثواب اور موجب رضاء الٰہی بن جاتا ہے۔ اس کی بنیاد دراصل وہی اخلاص ہے جس کی برکت سے تھوڑا سا عمل بھی پہاڑ بن جاتا ہے۔

ایک نیکی کا ثواب دس گُنے سے بڑھتے بڑھتے سات سو گُنے تک جو پہنچ جاتا ہے، اس کا راز بھی اسی اخلاص میں مُضمر ہے جو سینوں میں چھپا رہتا ہے اور جسے سوائے رب ذوالجلال، عالم الغیب والشہادۃ کے کوئی نہیں جانتا۔

اخلاص کی ضد ریاء ہے

کوئی عمل اگر اللہ کی رضا کے لیے نہ کیا جائے؛ بلکہ اس کے پیچھے دوسرے اغراض

ومقاصد ہوں، مثلاً کسی مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنا، یا دنیا کمانا یا لوگوں کی نگاہ میں پارسا اور نیک بننا یا لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا وغیرہ تو اسے ریاء کہتے ہیں، ریاء کے ساتھ کیا ہوا عمل بارگاہِ الٰہی میں نہ صرف ناقابل قبول ہے؛ بلکہ غضبِ الٰہی کا سبب ہے۔

ایک شخص نام نمود کے لیے، یا لوگوں کا اعتماد واحترام حاصل کرنے کے لیے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے، بہت ممکن ہے کہ علمائے شریعت یہ فتویٰ دیں کہ اس کی نماز ادا ہوگئی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخلاص سے عاری اس نماز کی ''میزان الٰہی'' میں نہ کوئی وزن ہوگا نہ کوئی قدر وقیمت ہوگی؛ بلکہ ریاء کی وجہ سے اس کا یہ عمل ایک ایسا مجرمانہ فعل ہوگا جس پر وہ ''وَیل'' یعنی تباہی وبربادی کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ ارشاد باری ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ﴿٤﴾ ٱلَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴿٥﴾ ٱلَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ ﴿٦﴾﴾ [سورة الماعون: ٤ – ٥]

ترجمہ: ''پھر بڑی خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کی جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو دکھاوا کرتے ہیں''۔ [سورۃ الماعون:۴-۵]

ریاء کے طور پر کیا ہوا عمل ایک طرح کا شرک (خفی) ہے جو اسلام کی نظر میں نہایت مبغوض اور ناپسندیدہ عمل ہے؛ کیوں کہ ریاکار شخص اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو شریک کرتا ہے، اسی لیے رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

«مَنْ صَلَّى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ» [رواه أحمد]

''جس شخص نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے

کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ خیرات کیا اس نے شرک کیا“۔[رواہ احمد]

ریاء کے ساتھ کیا ہوا عمل ناقابل قبول

بہ ظاہر نیک اعمال کسی کے اتنے ہو جائیں جو پہاڑوں کے برابر ہوں، لوگ اس پر رشک کر رہے ہوں اور ہر ایک کی زبان پر اس کا چرچا ہو؛ لیکن ان میں اخلاص نہیں ہوگا تو وہ ناقابل قبول ہوں گے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ اور مخلصانہ عمل ہی قبول فرماتے ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے مسند بزار سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تُعْرَضُ أَعْمَالُ بَنِي آدَمَ بَيْنَ يَدَيِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي صُحُفٍ مُخَتَّمَةٍ، فَيَقُولُ اللهُ: أَلْقُوا هَذَا، وَاقْبَلُوا هَذَا، فَتَقُولُ الْـمَلَائِكَةُ: يَا رَبِّ، وَاللهِ مَا رَأَيْنَا مِنْهُ إِلَّا خَيْرًا، فَيَقُولُ: إِنَّ عَمَلَهُ كَانَ لِغَيْرِ وَجْهِي، وَلَا أَقْبَلُ الْيَوْمَ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا أُرِيدَ بِهِ وَجْهِي». [تفسير ابن كثير]

”قیامت کے روز بارگاہِ الٰہی میں بنی آدم کے اعمال سربمہر صحائف میں پیش کیے جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس عمل کو پھینک دو اور اس عمل کو قبول کر لو، فرشتے عرض کریں گے: اے پروردگار! بخدا ہم نے اس شخص کے اندر خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا، تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: اس کا عمل میرے علاوہ کسی اور کے لیے تھا، اور آج میں صرف وہی عمل قبول کروں گا جو میری رضا کے لیے کیا گیا ہوگا“۔[ابن کثیر]

تقویٰ اور پارسائی، ریاضت و مجاہدہ اور کارِ خیر میں سرگرمی اور قربانی اگر دنیاوی

شہرت اور نیک نامی کے لیے ہے تو نہ صرف یہ کہ نامۂ اعمال صالحہ میں اس کا کوئی وزن اور وجود نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کی وجہ سے قیامت کے دن رسوائی بھی ہوگی۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللهُ بِهِ، وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللهُ بِهِ» [متفق عليه] ”(کسی نیک کام کے نتیجہ میں) جو شہرت کا طالب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی بدنیتی قیامت کے دن سب کو سنادیں گے۔ اسی طرح جو کوئی لوگوں کو دکھانے کے لیے نیک کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو لوگوں کو دکھادیں گے (یعنی رسوا فرمادیں گے)“۔[متفق علیہ]

اگر خالق و مخلوق دونوں کی رضا مقصود ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو تباہ و برباد کرنے اور انھیں کھوکھلا کرنے میں ریا سے زیادہ کسی چیز کو دخل نہیں ہے، وبائی جراثیم سے بھی زیادہ خطرناک چیز ریا ہے، جراثیم اور وائرس جس طرح نظر نہیں آتے؛ لیکن فرد اور جماعت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح ریا بھی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ!

«إِنِّي أَقِفُ الْمَوْقِفَ أُرِيدُ بِهِ وَجْهَ اللهِ، وَأُرِيدُ أَنْ يُرَى مَوْطِنِي، فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا حَتَّى نَزَلَتْ: ﴿فَمَن كَانَ يَرْجُواْ لِقَآءَ رَبِّهِۦ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَٰلِحًا وَلَا

يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًا (سورة الكهف: ١١٠)﴾»

[رواه الحاكم والبيهقي بسند ضعيف]

"یا رسول اللہ! میں ایک کام کرتا ہوں جس کے ذریعہ اللہ کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور یہ بھی کہ لوگ مجھے دیکھیں (یعنی دونوں نیتیں ہوتی ہیں) رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہیں عنایت فرمایا، یہاں تک کہ آیت کریمہ نازل ہوئی: فمن كان يرجوا.... "تو جسے بھی اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے"۔

[رواہ الحاکم والبیہقی]

مخلص شخص گم نامی کو شہرت پر ترجیح دیتا ہے

جو شخص مخلص ہوگا وہ خیر و بھلائی کے کام کر کے لوگوں کی تعریف اور ستایش کا منتظر نہیں ہوگا، مخلص انسان گم نامی کو شہرت پر اور پوشیدہ عمل کو اعلانیہ عمل پر ترجیح دیتا ہے، ریا وسمعہ سے دور رہ کر، شرکِ خفی سے اپنا دامن بچا کر خدائے پاک کے ان سعادت مند، تقویٰ شعار اور پاک باز بندوں میں شامل ہونا چاہتا ہے، جنھیں اللہ محبوب رکھتے ہیں، انھیں دکھاوے سے نفرت ہوتی ہے، وہ پوشیدہ اور رازدارانہ طور پر اس طرح نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے خالق و مالک کے سوا کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی، تاہم نیکی اور خیر کے ایسے کام انجام دے رہے ہوتے ہیں کہ جن سے پوری سوسائٹی فائدہ اٹھا رہی ہوتی ہے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی سایہ دار اور پھل دار درخت کی جڑیں ہوتی ہیں، اس کی جڑیں زیر زمین ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں؛ لیکن باہر پھیلے ہوئے سایے اور ٹہنیوں پہ لدے ہوئے پھلوں کا

سرچشمہ وہ جڑیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کی مثال پر شکوہ اور خوب صورت عمارت کی بنیاد کی طرح ہے، جو نظر نہیں آتی؛ لیکن ساری عمارت کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔

داہنے ہاتھ سے دیا ـــــ بائیں کو خبر نہ ہوئی

جہاں تک ممکن ہو اپنے اعمال کو پوشیدہ طور پر انجام دینے کی کوشش کریں، اس طرح اخلاص پیدا ہوگا اور عمل قابل قبول ہوگا، اسی لیے حدیث پاک میں جن سات خوش بخت لوگوں کا ذکر ہے جنھیں اللہ پاک قیامت کے خوف ناک دن میں اپنے سایے میں جگہ عنایت فرمائیں گے جس وقت ان کے عرش کے سایے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں ایک سعادت مند وہ مخلص شخص بھی ہوگا جس نے راہِ خدا میں صدقہ اس طرح پیش کیا ہوگا کہ جب اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے دیا تو اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہوئی، یعنی نہایت رازدارانہ طور پر دیا؛ تاکہ یہ عمل ریا سے پاک رہے۔

البتہ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اگر ریا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور کارِ خیر پر دوسروں کو ابھارنا اور حوصلہ افزائی کرنا مقصود ہو تو اعلانیہ طور پر خیر کا عمل کیا جاسکتا ہے، شریعت نے اسے روا رکھا ہے، تاہم اخفائے عمل بہ ہر حال زیادہ بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِن تُبْدُوا۟ ٱلصَّدَقَـٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا ٱلْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾﴾ [سورة البقرة: ٢٧١]

”اگر تم صدقات ظاہر کرکے دو تب بھی اچھا ہے، اور اگر ان کو چھپا کر فقرا کو دو تو

یہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کردے گا، اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے"۔[سورۂ بقرہ:۲۷۱]

لہٰذا اگر نفس کے محاسبے سے یہ اندازہ لگ جائے کہ اعلانیہ طور پر کارِ خیر کا مقصد صرف دوسروں کی ترغیب ہے اور اس میں نام و نمود اور طلب شہرت کو دخل نہیں ہے تو اعلانیہ عمل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اگر نفس کے پھسلنے کا خدشہ ہو، اخلاص کے ضائع ہونے کا ڈر ہو تو پھر پوشیدہ عمل ہی بہتر ہے۔

موجودہ زمانہ میں دکھاوے کے عمل کو اس قدر رواج ہوگیا ہے کہ اس کو بعض لوگ غلط سمجھتے ہی نہیں، ضرورت مندوں کے درمیان چیزیں تقسیم کی جاتی ہیں اور اس کی تصویریں اور ویڈیو بناکر ان غریبوں کی غربت کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور خود ستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح اپنا عمل ضائع اور تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

«إِذَا جَمَعَ اللهُ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ، نَادَى مُنَادٍ: مَنْ كَانَ أَشْرَكَ فِي عَمَلٍ عَمِلَهُ للهِ، فَلْيَطْلُبْ ثَوَابَهُ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ تَعَالَى، فَإِنَّ اللهَ أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ» [رواه الترمذي، مُسند أحمد، وابن ماجه)

"جب اللہ تعالیٰ اگلوں اور پچھلوں کو ایسے دن میں جمع فرمائیں گے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قیامت کے دن) تو ایک پکارنے والا پکارے گا: جس نے کوئی کام اللہ تعالیٰ کے لیے کیا اور اس میں کسی کو شریک کیا، تو وہ اپنا بدلہ غیر اللہ سے طلب کرے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمام شریکوں کی شرکت سے بے نیاز ہے"۔[ترمذی، مسند احمد، ابن ماجہ]

کثرت عمل سے زیادہ اہم نیت کی درستگی

حضرت سفیانِ ثوریؒ فرماتے ہیں:

”میرے نزدیک تصحیح نیت سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کی تصحیح کرتا ہوں، پھر الٹ جاتی ہے“۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ کا قول ہے:

«لَيْسَ عَلَى النَّفسِ شَيءٌ أَشَقَّ مِن الإِخْلَاصِ، لِأَنَّه لَيْسَ لَهَا فِيْهِ نَصِيْبٌ»

”نفس کے لیے سب سے زیادہ گراں بار چیز اخلاص ہے؛ کیوں کہ اخلاص میں نفس کا کوئی حصہ نہیں ہے“۔

حضرت یوسف بن الحسین الرازیؒ نے فرمایا:

”اس دنیا میں اخلاص کا حصول مشکل ترین کام ہے، میں اپنے دل سے ریا کو دور کرنے کی انتھک کوشش کرتا ہوں؛ لیکن پھر بھی اپنا رنگ بدل کے ابھر جاتی ہے“۔

اخلاص اور ریا کے درمیان نہایت لطیف اور باریک پردہ حائل ہے جس کو سمجھنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے، اس کے لیے مجاہدۂ نفس کے ساتھ دعاؤں کا بھی اہتمام کرنا ناگزیر ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عام طور پر یہ دعا فرماتے تھے:

«اللهُمَّ اجْعَلْ عَمَلِيْ كُلَّهُ صَالِحًا، وَاجْعَلْهُ لِوَجْهِكَ

خَالِصًا، وَلا تَجْعَلْ لِأَحدٍ فِيْهِ شَيْئًا».

”اے اللہ! میرا ہر عمل نیک بنادے، اور اسے صرف اپنی رضا کے لیے خالص کردے، اور اس میں کسی دوسرے کے لیے کوئی حصہ نہ رکھ“۔

* * *

۱۴۳۱/۶/۲۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک مسلمان کے حقوق دوسرے مسلمان پر

عبادت کا وسیع مفہوم

اسلام میں عبادت کا کیا مفہوم ہے؟ کیا عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ ساری مخلوقات سے کٹ کر اور پورے معاشرے سے ہٹ کر تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے رہنا؟ یا کسی جنگل اور بیابان میں جا کر یا کسی غار میں چھپ کر اللہ کی عبادت کرتے رہنا؟ حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے عبادت کے وسیع ترین مفہوم کو نہایت تنگ دائرے میں مخصوص کر دیا ہے؛ حالاں کہ عبادت کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور اس کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے، آپ اپنے مسلمان بھائی کے لیے کوئی بھی خیر و بھلائی کا کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کریں گے تو یہ بھی عبادت ہے؛ بلکہ حیوانات کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کرنا اسلام میں عبادت ہے؛ اسی لیے پیاسے کتے کو پانی پلانے والی عورت کو جنت کی بشارت سنائی گئی۔

مسلمان بھائی کے حقوق کی ادائیگی بھی عبادت ہے

ایک مسلمان شخص دوسرے مسلمان کو جب سلام کرتا ہے اور مصافحہ کرتا ہے، پھر

دوسرا شخص اسے بہترین انداز میں سلام کا جواب دیتا ہے تو ان دونوں کو عبادت کا ثواب ملتا ہے؛ کیوں کہ ان دونوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پیروی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾﴾ [سورة النساء: ٨٦]

ترجمہ: ”جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو، یا انہی الفاظ کو لوٹا دو...“۔[سورۃ النساء:۸۶]

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَتَقْرَأُ السَّلَامَ، عَلَى مَنْ عَرَفْتَ، وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ»

[صحيح البخاري]

ترجمہ: ”اور تم سلام کرو اُسے جسے پہچانتے ہو اور اسے بھی جسے نہیں پہچانتے“۔

[بخاری شریف]

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ، إِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَتَفَرَّقَا». [أبو داود والترمذي وابن ماجه وأحمد]

”دو مسلمان ایک دوسرے سے ملاقات اور مصافحہ کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے جدا ہونے سے قبل ہی ان دونوں کی مغفرت ہو جاتی ہے“۔

[ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، احمد]

کسی شخص کو چھینک آئے، پھر وہ الحمد للہ کہے تو اس کے الحمد کی آواز سننے والے پہ

اس کا حق ہے کہ وہ «يَرْحَمُكَ اللهُ» کہے، اس کے بعد چھینکنے والا «يَهْدِيْكَ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكَ» کہے۔ اس طرح کے دعائیہ کلمات کا تبادلہ بھی عبادت ہے۔

اسی طرح کوئی مسلمان بیمار ہوجائے تو اس کی مزاج پرسی کے لیے جانا اور اس کی شفایابی کے لیے دعا کرنا، اسلامی حقوق میں سے ہے، اس پہ شریعت نے اجرِ عظیم کی بشارت بھی سنائی ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعِيَادَةِ الْمَرِيضِ، وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَتَشْمِيتِ الْعَاطِسِ، وَإِبْرَارِ الْمُقْسِمِ، وَنُصْرَةِ الْمَظْلُومِ، وَإِجَابَةِ الدَّاعِي، وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ». [صحيح البخاري]

”ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیمار کی عیادت، جنازے کی مُشایَعت، چھینکنے والے کو جواب دینے، قسم کھانے والے کی قسم پوری کرنے، مظلوم کی مدد، قبولِ دعوت اور سلام کو عام کرنے کا حکم فرمایا ہے“۔[بخاری شریف]

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر کے کسی بیمار کی عیادت فرماتے تو اپنا دایاں ہاتھ اس پر پھیرتے اور یہ دعائیہ کلمات پڑھتے:

«اللهُمَّ رَبَّ النَّاسِ، أَذْهِبِ الْبَاسَ، اشْفِ وأَنْتَ الشَّافِي، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا» [ابوداود وأحمد]

ترجمہ: ”اے اللہ، لوگوں کے پروردگار! بیماری کو دور فرما، تندرستی عطا فرما، اور تندرستی دینے والے تو آپ ہی ہیں، آپ کے سوا کوئی شفا نہیں دے سکتا، آپ ایسی شفا عطا فرمادیں جو کسی بیماری کو باقی نہ رہنے دے“۔[ابوداود واحمد]

لہٰذا اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی بھائی انتقال کر جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو اور اگر قسم کھالے تو اس کی قسم پوری کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ پر قسم کھائی کہ آپ کو فلاں کام کرنا ہوگا، لہٰذا اگر اس کام میں شرعی قباحت نہ ہو تو آپ اسے کر ڈالیں تاکہ آپ کے بھائی کی قسم پوری ہو جائے۔

مسلمان کی خیر خواہی اور اس کی نصرت

اگر کوئی مسلمان بھائی آپ سے خیر خواہی کی امید رکھے، یا آپ سے مشورہ طلب کرے تو آپ کا اسلامی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کے ساتھ خیر خواہی کریں، اسے وہی مشورہ دیں جو آپ کے نزدیک اس کے لیے نفع بخش اور فائدہ مند ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا اسْتَنْصَحَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيَنْصَحْ لَه».

[صحيح البخاري]

ترجمہ: ”جب تم میں کا کوئی اپنے بھائی سے خیر خواہی کا طلب گار ہو تو اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہیے“۔ [بخاری شریف]

اسلامی بھائی چارے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے، اسی طرح جو چیز اپنے لیے ناپسند ہو وہی اپنے بھائی کے لیے بھی ناپسند سمجھے۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ»

[صحيح البخاري]

”تم میں کا کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو“۔

یہ روایت بخاری شریف میں ہے اور مسند امام احمدؒ میں یہ اضافہ ہے:

«وَتَكْرَهَ لَهُ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ» ”جس چیز کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو اسے اپنے بھائی کے لیے بھی ناپسند کرو“۔

اسلامی حقوق میں سے ایک اہم حق یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی نصرت ومدد کرے، اس کے لیے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اس کا بھائی اس کی مدد کا محتاج ہو اور وہ اسے بے یار ومددگار چھوڑ دے۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا» [صحيح البخاری]

”اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو“۔

جب آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی نصرت کا مطلب تو سمجھ میں آرہا ہے؛ لیکن اگر ظالم ہو تو اس کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو ظلم سے روک دو، یہ اس کی نصرت ہے“۔

ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ رَدَّ اللهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [الترمذی وأحمد]

”جس شخص نے اپنے بھائی کی عزت وآبرو کا دفاع کیا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جہنم کی آگ اس کے چہرے سے دور کردیں گے“۔[ترمذی واحمد]

اللہ تعالیٰ اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے، ان سعادت مندوں کو جو اس اسلامی اخوت کی قدر کرتے ہیں اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کی نصرت کے لیے اپنے تن، من، دھن کی بازی لگادیتے ہیں۔

ایذارسانی حرام ہے

اس اسلامی رابطے کا ایک حق یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کی ایذارسانی کا سبب نہ بنے، خواہ اپنے کردار سے یا اپنے گفتار سے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ»

[رواه مسلم]

”ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت وآبرو حرام ہیں“۔

[مسلم شریف]

ایک روایت میں ہے:

«لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُرَوِّعَ مُسْلِمًا» [أحمد وأبو داود]

ترجمہ: کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو ہراساں کرے۔[احمد وابوداود]

سبحان اللہ! شریعت نے اس اُخُوّت کو اس قدر تقدُّس دیا ہے کہ ایک مسلمان کا

دوسرے مسلمان کی طرف ایسی نظر سے دیکھنا بھی ناجائز قرار دیا جس کی وجہ سے اسے تکلیف پہنچے۔

رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھے جس سے اسے اذیت پہنچے"۔

ایک مشہور حدیث پاک میں ہے:

«الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ»

[صحيح البخاري]

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں"۔[بخاری شریف]

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان بھائی کے تئیں یہ معاملہ ہونا چاہیے جو مذکورہ بالا احادیث میں بیان کیا گیا؛ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی بدزبانی، دست درازی اور ایذا رسانی سے لوگ تنگ رہتے ہیں، ایسے لوگ مسلم معاشرے کے لیے باعث ننگ و موجب عار ہیں، یہ لوگ اسلام اور مسلم معاشرے کی بدنامی کا ذریعہ تو ہیں ہی، ساتھ ہی اپنے سر، سیّآت اور بداعمالیوں کا بڑا گٹھر بھی لاد رہے ہیں جس کی حقیقت قیامت کے روز کھل جائے گی، ایسے لوگوں کو حدیث پاک میں "مفلس" یعنی نادار کہا گیا ہے جن کی حقیقی مفلسی قیامت کے دن عیاں ہو جائے گی، وہ سارے لوگ اپنے حقوق کا اور انصاف کا مطالبہ کریں گے جنھیں ان کی زبان سے یا کردار سے اذیت پہنچی تھی، پھر ان کے نیک اعمال سے (اگر ہوں گے) دوسروں کے حقوق ادا کیے جائیں گے، اور

اگر نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو دوسروں کے گناہ ان پر ڈال دیے جائیں گے۔ العیاذ باللہ

اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ تواضع اور انکساری کا معاملہ

ایک مسلمان، دوسرے مسلمان کے ساتھ انکساری اور تواضع سے پیش آئے، اس کے لیے ہرگز جائز نہین کہ کبر و غرور سے پیش آئے، کبریائی صرف رب ذوالجلال کو ہی زیب دیتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی، سرکار دوعالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو فرمایا:

﴿وَٱخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٨٨﴾﴾ [الحجر: ٨٨]

"اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، ان کے لیے شفقت کا بازو پھیلا دو"۔

[سورۃ الحجر:۸۸]

ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمۡشِ فِي ٱلۡأَرۡضِ مَرَحًاۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٖ فَخُورٖ ﴿١٨﴾﴾ [لقمان: ١٨]

"اور لوگوں کے سامنے (غرور سے) اپنے گال مت پھیلاؤ، اور زمین پر اتراتے ہوئے مت چلو، یقین جانو اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا"۔

[سورۂ لقمان:۱۸]

رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ». [أبوداود وابن ماجه]

ترجمہ: "اللہ نے مجھ کو وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ

تم میں سے کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے اور کوئی کسی پر فخر نہ کرے"۔

[ابوداؤد وابن ماجہ]

جب کوئی شخص دوسرے بھائی کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ پاک اس کا رتبہ بلند فرماتے ہیں، اس باب میں رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت پاک سے سبق لینا چاہیے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ساری مخلوقات میں افضل ہیں؛ لیکن کبھی کسی کے سامنے فخر وغرور سے پیش نہیں آئے، بیواؤں، مسکینوں اور فقیروں کے ساتھ ساتھ چلنے اور ان کی حاجت روائی میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بلند وبالا شخصیت کبھی مانع نہیں ہوئی؛ بلکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ دعا فرماتے تھے کہ یا اللہ! مجھے مساکین کی محبت عطا فرما۔ [ترمذی شریف]

کسی مجلس میں لوگ بیٹھے ہوں، کوئی دوسرا شخص آکر کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اگر بیٹھ جائے تو اس میں پہلے سے بیٹھے ہوئے شخص کی توہین بھی ہے اور اٹھانے والے کا کبر وغرور بھی۔ اسی لیے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«لَا يُقِيمَنَّ أَحَدُكُمْ رَجُلاً مِنْ مَجْلِسِهِ، ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ، وَلَكِنْ تَوَسَّعُوا وَ تَفَسَّحُوا» [مسلم]

"تم میں کا کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر نہ بیٹھے، اور لیکن کشادگی پیدا کردو"۔ [مسلم شریف]

قطعِ تعلق کی ممانعت

آپسی بھائی چارے اور ہمدردی کے بقا کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کا احترام کیا جائے، کینہ، حسد، بغض اور کبر وغرور سے دلوں کو پاک رکھا جائے، اگر خدانخواستہ

کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے تو ایک دوسرے کو درگزر کرنے کی عادت ڈالی جائے، اللہ کے لیے ایک دوسرے کو معاف کیا جائے، دلوں میں کینہ رکھنا اور تعلقات منقطع کرلینا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے، اسی لیے شریعت نے تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«لَا تبَاغَضُوا، وَلَا تحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ».

[صحيح البخاري]

”آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منھ نہ موڑو، اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو، اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تک بات چیت بند رکھے“۔[بخاری شریف]

دوسری روایت میں ہے:

”ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے“۔[بخاری شریف]

نفرت وعداوت کا سدباب

اسلام نے ان تمام باتوں کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے جن کی وجہ سے آپسی بھائی چارے پر ضرب پڑتی ہے، یا جن کی وجہ سے باہمی اخوّت متأثر ہوتی ہے اور نفرت وعداوت پیدا ہوتی ہے؛ لہٰذا کسی مسلمان کی غیبت کرنا، اس کی توہین وتحقیر کرنا، اس کی عیب جوئی میں لگنا، اس کا مسخرہ اڑانا، برے لقب سے پکارنا اور اس کی چغلی کرنا ناجائز قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٞ مِّن قَوۡمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُواْ خَيۡرٗا مِّنۡهُمۡ وَلَا نِسَآءٞ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيۡرٗا مِّنۡهُنَّۖ وَلَا تَلۡمِزُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُواْ بِٱلۡأَلۡقَٰبِۖ بِئۡسَ ٱلِٱسۡمُ ٱلۡفُسُوقُ بَعۡدَ ٱلۡإِيمَٰنِۚ وَمَن لَّمۡ يَتُبۡ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ١١﴾ [الحجرات: ۱۱]

”اے ایمان والو! نہ تو مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑا رہے ہیں) خود ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑا رہی ہیں) خود ان سے بہتر ہوں۔ اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو، اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو — ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بری بات ہے — اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں، تو وہ لوگ ظالم لوگ ہیں“۔ [سورۃ الحجرات:۱۱]

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ».

[صحيح مسلم]

”کسی آدمی کے برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے“۔ [مسلم شریف]

انسداد نفرت وعداوت کے باب میں اسلام نے ہر مسلمان کو سختی سے منع کیا کہ وہ کسی بھائی کو گالی دے، برا بھلا کہے، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ» [صحيح البخاري]

”مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے“۔[بخاری شریف]

ایک جگہ ارشاد ہے:

«الْمُتَسَابَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئِ مِنْهُمَا، مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُومُ»

[صحيح مسلم]

ترجمہ: ”دو گالی گلوچ کرنے والوں کا گناہ اس کے سر پر ہوگا جس نے گالی دینے میں پہل کی ہے، جب تک کہ مظلوم حد سے تجاوز نہ کر جائے“۔

[مسلم شریف]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ؛ فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا»

[صحيح البخاري]

”مُردوں کو برا نہ کہو؛ کیوں کہ انھوں نے جو عمل کیا تھا اس کا بدلہ پالیا“۔[بخاری شریف]

کسی مسلمان کے لیے یہ روا نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ فریب اور دھوکہ کا معاملہ کرے، فریب دینا اتنا بدترین عمل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے:

«مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا» [مسلم]

”جو شخص ہمارے خلاف ہتھیار اٹھالے وہ ہم میں سے نہیں، اور جو شخص ہمیں

(یعنی کسی مسلمان کو) دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں"۔ [مسلم شریف]

کسی کی ازدواجی زندگی کو خراب کرنا، اس کی خوشگوار زندگی کو برباد کرنا نہایت ہی ناپسندیدہ عمل ہے؛ بلکہ ایک معاشرتی جرم ہے، جس کے نتیجے میں باہمی منافرت اور دشمنی پیدا ہوگی؛ اسی لیے رسول کرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ خَبَّبَ زَوْجَةَ امْرِئٍ أَوْ مَمْلُوكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا» [أبوداؤد]

ترجمہ: "جو کسی کی بیوی یا غلام ولونڈی کو (اس کے شوہر یا مالک کے خلاف) ورغلائے وہ ہم میں سے نہیں"۔ [ابوداؤد شریف]

جن چیزوں سے باہمی الفت ومحبت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اسلام نے ان سے سختی سے منع کیا ہے: امانت میں خیانت، عہد وپیمان کو توڑنا، دروغ گوئی سے کام لینا اور بلاوجہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَوۡفُواْ بِٱلۡعُقُودِۚ﴾ [المائدة: ١]

ترجمہ: "اے ایمان والو! عہد وپیمان پورے کرو" [سورۃ المائدہ:۱]

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَأَوۡفُواْ بِٱلۡعَهۡدِۖ إِنَّ ٱلۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔولٗا﴾ [الإسراء: ٣٤]

"اور عہد کو پورا کرو، یقین جانو کہ عہد کے بارے میں تمہاری باز پرس ہونے والی ہے"۔ [بنی اسرائیل:۳۴]

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا

ائْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ» [صحيح البخاري]

"چار عادتیں جس کسی میں ہوں تو وہ خالص منافق ہے اور جس کسی میں ان چاروں میں سے ایک عادت ہو تو اس میں نفاق کی ایک عادت پائی گئی جب تک اسے چھوڑ نہ دے؛ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کسی سے عہد کرے تو پورا نہ کرے (یعنی غداری کرے) اور جب کسی سے جھگڑے تو گالیوں پر اتر آئے"۔ [بخاری شریف]

ایک سچا مؤمن جب کسی کے ساتھ معاملہ کرتا ہے تو اس کے معاملے میں سچائی، وفاداری، عہد و پیمان کی پاسداری، امانت داری اور دیانت داری ہوتی ہے، یہ وہ مبارک تعلیمات ہیں جن پر عمل کرنے کی وجہ سے بندہ رب ذوالجلال کی نگاہ میں بھی محبوب بنتا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں بھی معزز اور مکرم اور محبوب بن جاتا ہے۔

بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت

اسلامی حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ معاشرے میں جو عزت واحترام کے مستحق ہیں ان کی عزت و تعظیم کی جائے اور جو شفقت و پیار کے مستحق ہیں انھیں شفقت و پیار دیا جائے۔ اس کی وجہ سے فیملی، خاندان اور پورے معاشرے میں استحکام پیدا ہوگا۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيرِنَا»

[أبوداؤد والترمذي وأحمد]

ترجمہ: ”وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت ومہربانی نہ کرے اور جو ہمارے بڑوں کے حق کو نہ پہچانے“۔[ابوداؤدوالترمذی واحمد]

ایک جگہ ارشاد نبوی ہے:

«إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللهِ إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ...»

[رواه أبوداؤد]

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں یہ بھی شامل ہے کہ سن رسیدہ مسلمان کا اکرام کیا جائے“۔[ابوداؤد]

کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نومولود بچہ لایا جاتا، تاکہ آپ اس کو دعائے صحت ودرازئ عمر سے نوازیں اور اس کا نام تجویز فرمادیں، توآپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنی گود میں لے لیتے، بعض دفعہ بچہ آپؐ کی گود میں پیشاب وغیرہ کردیتا جسے آپؐ نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے۔۔۔صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔۔۔

کیا ہی عمدہ تعلیمات ہیں، کتنی مبارک ہدایات ہیں، اگر ہر مسلمان ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرے، ان مذکورہ آیات واحادیث کو اپنی عملی زندگی میں داخل کرے تو ہر اسلامی گھرانہ قابل تقلید نمونہ اور ہر اسلامی معاشرہ قابل رشک معاشرہ بن جائے گا۔

***

۱۴۲۶/۵/۱۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استغناء اور معاشی استحکام

تمہید

دنیا میں بسنے والے انسانوں کے طبقات مختلف ہیں، ان کی زندگی کے معیارات بھی مختلف ہیں، سارے کے سارے یکساں حالت اور ایک مرتبے میں نہیں ہیں، کوئی بیمار ہے اور کوئی تندرست ہے، کوئی فقیر ہے اور کوئی امیر ہے، کوئی کمزور ہے اور کوئی طاقت ور ہے، یعنی ان کے درمیان فرقِ مراتب ہے، حکمتِ الٰہی اسی طرزِ زندگی کی متقاضی تھی؛ اس لیے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی رہنا چاہیے، حسد اور اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے:

﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٣٢﴾ [الزخرف: ۳۲]

”بھلا کیا یہ لوگ ہیں جو تمہارے پروردگار کی رحمت تقسیم کریں گے؟ دنیوی زندگی میں ان کی روزی کے ذرائع بھی ہم نے ہی ان کے درمیان تقسیم کر رکھے ہیں، اور ہم نے ہی ان میں سے ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے؛ تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تمہارے پروردگار کی رحمت تو اس (دولت)

سے کہیں بہتر چیز ہے جو یہ جمع کررہے ہیں"۔[سورۃ الزخرف:۳۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد باہمی تعاون کے ساتھ زندگی گزاریں گے؛ کیونکہ اس فرقِ مراتب کی وجہ سے انسانوں کی ضرورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہیں؛ لیکن اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ ضرورت مند لوگ تماشائے اہل کرم دیکھتے رہیں، یا دوسروں پر بوجھ بن کر زندگی گزاریں؛ بلکہ عزتِ نفس کے ساتھ محنت وجاں فشانی کرکے اپنا حق حاصل کریں اور سرفرازی کی زندگی گزاریں، ہاں اس ضابطے سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے حقوق شریعت نے کسی کے اوپر عائد کیے ہیں اور ان کی کفالت کی ذمہ داری کسی کے سر رکھی ہے۔

اسلام نے اوپر والے ہاتھ کو نیچے والے ہاتھ سے بہتر قرار دیا ہے:

«الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى» [متفق عليه]

"اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے"۔[متفق علیہ]

استغناء اور عزتِ نفس

اسلام نے استغناء اور بے نیازی کی تعلیم دی ہے، عزت نفس کے ساتھ جینے کا حوصلہ دیا ہے، دستِ سوال دراز کرنے سے حتی الامکان بچنے کی تاکید کی ہے، قناعت کو ایک قابل تعریف وصف قرار دیا ہے۔ یہ تعلیمات افراد کے لیے بھی ہیں اور جماعتوں بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے لیے بھی، ہرایک کی کوشش ہونی چاہیے کہ خود کفیل بنے، دوسروں کا محتاج نہ بنے، اور یہ خود کفیلی زندگی کے تمام میدانوں میں ہو، خواہ وہ تجارت وزراعت ہو، صناعت وحرفت ہو، معاشی امور میں بھی، اجتماعی، سیاسی اور دفاعی

امور میں بھی، الغرض زندگی کے تمام شعبوں میں خود کفیل بننے کی کوشش ہونی چاہیے؛ تاکہ کسی دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنا پڑے اور دوسری طاقت ور قوموں کی غلامی میں رہ کر انھیں کے منشاء کے مطابق اپنی سیاست کی تعیین نہ کرنی پڑے۔ اسی لیے حدیث پاک میں وارد ہے:

«الْـمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْـمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ» [رواه مسلم]

”طاقت ور مؤمن بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے کمزور مؤمن سے، اور بھلائی ہر ایک ایمان والے میں ہوتی ہے“۔ [مسلم شریف]

اور اس طاقت کا تعلق صرف جسمانی طاقت سے نہیں؛ بلکہ جسمانی بھی ہے، معاشی، صنعتی، سیاسی، دفاعی اور حربی اور روحانی ہر اعتبار سے قوت مطلوب ہے، جس کے لیے عیش وآرام اور رفاہیت پسند طبیعت کو خیرباد کہہ کر خشونت، محنت ومجاہدہ اور جاں فشانی کو اختیار کرنا ہوگا، بے کار وقت ضائع کرنے، لایعنی امور میں مشغول رہنے اور دوسروں پر بوجھ بن کر زندگی بسر کرنے کے بہ جائے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو سامنے رکھ کر ان کی تکمیل کے لیے تگ ودَو اور انتھک محنت ومشقت برداشت کرنے کا عادی بننا ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کا استغناء اور رزق حلال کے لیے پیشے سے وابستگی

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا، اس لیے انھیں دینی اور دنیوی دونوں امور میں عملی نمونہ بھی بنایا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مخلوق خدا کو توحید الٰہی اور اپنی نبوت ورسالت کی دعوت دیتے تھے اور انھیں اللہ تعالیٰ سے وابستہ فرماتے تھے، دوسری طرف محنت ومشقت کرکے رزقِ حلال کماتے اور عزتِ نفس کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، نہ کسی پر بوجھ بنتے تھے، نہ ہی کسی کے سامنے اپنا دامن پھیلاتے تھے۔ چناں چہ حضرت داؤد علیہ السلام لوہار کا کام کرتے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے گزر بسر کرتے تھے، حضرت زکریا علیہ السلام کارپنٹر کا کام کرتے تھے، کسی نبی نے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کیا اور کسی نے درزی کا اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے بکریاں چرائیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الغَنَمَ»، فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: «نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ»

[صحيح البخاري]

”اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا اس نے بکریاں چرائیں، صحابۂ کرام نے عرض کیا: کیا آپ نے بھی بکریاں چرائیں؟ فرمایا: ہاں! میں بھی کبھی مکہ والوں کی بکریاں چند قیراطوں کی اجرت پر چرایا کرتا تھا“۔ [بخاری شریف]

ان عظیم اور برگزیدہ ہستیوں سے اللہ نے بکریاں چرانے کا متواضعانہ اور عاجزانہ کام لے کر انھیں تواضع اور خاکساری جیسے اعلیٰ وصف سے بہرہ مند کرکے امتوں اور قوموں کی قیادت کا کام لیا۔

سب سے اعلیٰ اور ارفع نمونہ رحمتِ دوعالم، سرورِ عالم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے، جو نبوت ورسالت کے تمام فرائض بحسن وخوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ضروری کام بھی خود ہی کیا کرتے تھے؛ بلکہ اہل خانہ کے کاموں میں بھی ان کا تعاون فرماتے تھے؛

چناں چہ اپنی بکری کا دودھ خود اپنے دست مبارک سے دوہتے تھے، اپنے جوتے خود ہی گانٹھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا گھر میں کیا معمول تھا؟ انھوں نے کہا کہ آپ ﷺ جب گھر میں ہوتے تو گھر والوں کے کام کرتے تھے، ان کی مدد کرتے تھے اور جب نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لیے مسجد تشریف لے جاتے"۔[بخاری شریف]

بعض لوگ ایک گلاس پانی تک خود سے لے کر نہیں پیتے، اس کے لیے بھی کسی کی خدمت کے منتظر رہتے ہیں؛ بلکہ دوسروں کے محتاج رہتے ہیں، جب کہ سید الاولین والآخرین ﷺ کا حال یہ تھا نہ صرف اپنے کام خود سے انجام دیتے تھے؛ بلکہ اہل خانہ کے کاموں میں ان کا تعاون بھی فرماتے۔

صحابۂ کرامؓ کا استغناء اور کسبِ حلال کے لیے شوقِ عمل

رسولِ اکرم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کی تربیت اس طرح فرمائی تھی کہ ان کے اندر استغناء کوٹ کوٹ کر بھر گیا تھا، آپ ﷺ نے انھیں ہمیشہ یہ تعلیم دی کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے سے بہتر ہوتا ہے، ایک موقع پر اسی استغناء، بے نیازی اور عزت نفس کی طرف اشارہ کرتے ہوے ارشاد فرمایا:

«لَأَنْ يَحْتَطِبَ أَحَدُكُمْ حُزْمَةً عَلَى ظَهْرِهِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ أَحَدًا، فَيُعْطِيَهُ أَوْ يَمْنَعَهُ» [صحيح البخاري]

"تم میں کا کوئی لکڑیوں کا گٹھر اپنی پشت پر لاد کر (بیچنے کے لیے) لائے وہ اس سے بہتر ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے، پھر وہ دے یا نہ دے"۔[بخاری شریف]

آپ ﷺ انھیں شریفانہ عمل، محنت وجاں فشانی اور مجاہدانہ زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے تھے، رفاہیت اور عیش پرستی اور آرام طلبی سے دور رہنے کی تعلیم دیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ عزت وشرافت اوراستغناء کی زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد، محنت ومشقت اور عمل پیہم کے خوگر ہوگئے تھے اور کسی دوسرے کرم نواز کے رحم وکرم پر جینے کے بہ جائے جہدِ مسلسل کے ذریعہ خود کرم نواز بننے کی کوشش کرتے تھے۔

جب صحابۂ کرامؓ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو چوں کہ وہ اپنا سارا مال اور ساز وسامان مکّے میں چھوڑ کر گئے تھے؛ اس لیے مدینے میں ان کی آباد کاری کا مسئلہ تھا، اس کے لیے رسول ﷺ نے ''مواخاۃ'' یعنی بھائی چارہ اور اسلامی اخوّت کا اصول مرتب فرمایا اور مہاجری صحابی کو انصاری صحابی کے رشتہ اخوّت سے منسلک فرمادیا، چناں چہ مدینہ منورہ کے انصار نے اس رشتے کو اس قدر ایثار، محبت اور قربانی کے ساتھ نبھایا جس کی مثال انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے تھے، حضور ﷺ نے ان کا بھائی چارہ حضرت سعد بن الربیع انصاریؓ کے ساتھ قائم فرمادیا، چناں چہ حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کو مخاطب کرکے فرمایا: میرے ان دونوں باغوں میں سے جو آپ کو پسند ہو وہ لے لیجیے، اور دونوں بیویوں میں سے جو آپ کو پسند ہو، بتلادیجیے تاکہ میں اسے طلاق دے دوں، پھر آپ اس سے نکاح کرلیجیے گا۔ حضرت عبدالرحمن تو محنت وعمل کے رسیا تھے، استغناء کا درس حضور ﷺ سے لے کر دل میں سموچکے تھے، انھوں نے اپنے اسلامی بھائی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بھائی! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے، آپ اس کی زحمت ہرگز گوارا نہ فرمائیں، مجھے تو بازار کا راستہ بتلادیجیے، جہاں جاکر میں کاروبار شروع

کردوں، چناں چہ بازار جاکر خرید وفروخت شروع کی، گھی اور پنیر سے اپنی تجارت کا آغاز کیا اور دیکھتے دیکھتے تجارت میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ ان کا شمار مدینہ منورہ کے مال دار ترین صحابۂ کرام میں ہونے لگا۔ پھر کیا تھا؟ اللہ کے راستے میں بے دریغ مال خرچ کرنے لگے، اپنے خرچ پر مجاہدین اسلام کا لشکر تیار کرکے اللہ کے راستے میں بھیجنے لگے، یتیموں اور بیواؤوں کی کفالت کرنے لگے۔

اسلام، اس طرح معاشرے میں معزز ومکرّم رہ کر زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، دوسروں کے دست نگر رہ کر ان کے احسان تلے دب کر زندگی بسر کرنے کے بہ جائے اپنے دست وبازو کو حرکت میں لاکر خود اعتماد اور خود کفیل بننے کو پسند کرتا اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ، خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلاَمُ، كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ» [صحيح البخاري]

"کسی شخص نے اس سے بہتر روزی نہیں کھائی جو خود اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھاتا ہو، اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام بھی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے روزی کھاتے تھے"۔[بخاری شریف]

حضرت فاطمہ بنت محمد ﷺ کی خانگی زندگی

امت مسلمہ کی خواتین کے لیے سیدہ فاطمہؓ کی زندگی بہترین اسوہ اور نمونہ ہے، مخلوقات میں سب سے افضل اور اشرف نبی کی لخت جگر ہیں، جنتی عورتوں کی سردار ہیں، اگر رسول اکرم ﷺ چاہتے تو ان کے اوپر دنیاوی نعمتوں کی ایسی بارش برساتے کہ ان کا گھر

حشم وخدم اور ناز ونعمت کے وسائل سے بھر جاتا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ امت کو، بلکہ انسانیت کو استغناء اور محنت وجفاکشی کا درس صرف زبان سے نہیں دیتے تھے؛ بلکہ زبان وعمل اور قول وفعل دونوں میں یکسانیت کے ساتھ تعلیم وتربیت اور دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے، چناں چہ حضرت فاطمہؓ کی تربیت بھی اسی طرز پہ ہوئی تھی کہ گھر کے کام کاج خود ہی انجام دیتی تھیں، گھر میں کوئی نوکر یا خادم نہیں تھا، وہ گھر کے سارے کام خود ہی کیا کرتی تھیں، نتیجہ یہ تھا کہ ہاتھ پر چکی کے نشانات پڑ گئے تھے، کھردری چٹائی پر سونے کی وجہ سے پہلو داغ دار ہو گیا تھا—— ایک روز حضرت علیؓ کے اصرار پر والد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ اپنے گھر کے لیے ملازم کی درخواست کریں؛ لیکن ان کی زبان نہیں کھل سکی، خود ہی بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے سمجھ لیا تھا کہ میں کسی غرض سے حاضر ہوئی تھی؛ لیکن عرض نہیں کر سکی، اس لیے آپ ﷺ رات میں جب ہم اپنے بستر پر جا چکے تھے تو تشریف لائے، میں اٹھنے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”مکانکما“ یعنی اپنی جگہ پر ہی رہیں، پھر آپ ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گئے، یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی، پھر فرمایا:

«أَلَا أَدُلُّكِ عَلَى مَا هُوَ خَيْرٌ لَكِ مِنْ خَادِمٍ؟ تُسَبِّحِينَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَتَحْمَدِينَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَتُكَبِّرِينَ أَرْبَعًا وَثَلَاثِينَ، حِينَ تَأْخُذِينَ مَضْجَعَكِ» [مسلم]

”کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں جو تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے؟ جب تم بستر پر جاؤ تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہو“۔

[مسلم شریف]

حقیقت یہ ہے کہ اگر خواتین ان کی پیروی کریں اور ان تعلیمات پر عمل کریں تو منجملہ دیگر منافع کے ان کی صحت و تندرستی بھی برقرار رہے گی، محنت کش خواتین چست اور پھرتیلی رہتی ہیں، جب کہ عیش وعشرت پسند خواتین کی صحت بہت جلدی گرجاتی ہے اور بیماریاں ان کو اپنے نرغے میں لے لیتی ہیں — عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے — اسی طرح فراغت اور بے کاری کی وجہ سے جو دیگر نقصانات ہوتے ہیں، مثلاً غیبت ولغویات اور نفسیاتی امراض وغیرہ ان سے بھی حفاظت رہتی ہے۔

جائز پیشہ اختیار کرنا بے روزگاری اور ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے

محنت ومشقت کے ذریعہ حلال کمائی میں نہ صرف یہ کہ برکت ہوتی ہے؛ بلکہ انسان کے لیے باعث راحت واطمینان اور عزت وافتخار بھی ہے؛ جب کہ بے کاری اور بے روزگاری، یا دست سوال پھیلانا یا کسی پر بوجھ بننا باعث ذلت واحتقار ہے۔

اسلام نے اللہ پر توکل اور بھرپور اعتماد اور وثوق کی تعلیم ضرور دی ہے؛ لیکن رزق حلال کے لیے اسباب اختیار کرنے کی بھی ترغیب دی ہے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِي ٱلْأَرْضِ وَٱبْتَغُواْ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝١٠ ﴾ [الجمعة: ١٠]

”پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی روزی کماؤ) اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو“۔

[سورۃ الجمعہ:۱۰]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿هُوَ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ ذَلُولًا فَٱمْشُواْ فِى مَنَاكِبِهَا وَكُلُواْ مِن رِّزْقِهِۦ ۖ وَإِلَيْهِ ٱلنُّشُورُ ﴿١٥﴾﴾ [الملك: ١٥]

”وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو پست کردیا ہے؛ لہٰذا تم اس کے راستوں میں چلو پھرو، اور اس کی روزی کھاؤ، اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے“۔[سورۃ الملک:۱۵]

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور آسمان سے روزی برسنے کی امید کرنا، یا کسی اور کے رحم وکرم کی آس لگائے رکھنا باوجود کمانے کی قدرت واستطاعت کے اسلامی روح اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ» [صحيح البخاری]

”کام کرتے رہو؛ کیوں کہ جس کام کے لیے جسے پیدا کیا گیا ہے وہ کام اس کے لیے آسان کردیا گیا ہے“۔[بخاری شریف]

حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے:

«لَا يَقْعُدَنَّ أَحَدُكُمْ عَنْ طَلَبِ الرِّزْقِ، وَيَقُوْلُ: اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ، وَقَدْ عَلِمَ أَنَّ السَّمَاءَ لَا تُمْطِرُ ذَهَبًا، وَلَا فِضَّةً»

[أخبار عمر]

”تم میں کا کوئی بھی ہرگز روزی کمانا چھوڑ کر (گھر میں) نہ بیٹھ جائے، اور یوں کہے: ”اے اللہ! مجھے روزی عنایت فرما“، حالاں کہ اسے یہ معلوم ہے کہ آسمان نہ تو سونا برساتا ہے نہ چاندی“۔[اخبار عمرؓ]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

«إِنِّي لَأَرَى الرَّجُلَ فَيُعْجِبُنِي، فَأَسْأَلُ: أَ لَهُ مِهْنَةٌ؟ فَإِنْ قِيْلَ: لا؛ سَقَطَ مِنْ عَيْنِي» [تاريخ عمر بن الخطاب لابن الجوزي]

"میں ایک (توانا وتندرست) شخص کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھے بھاتا ہے، پھر میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا اس کا کوئی پیشہ ہے؟ جب بتایا جاتا ہے کہ نہیں ہے تو پھر وہ میری نظر سے گر جاتا ہے"۔ [تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی]

ایک محنت شعار گورنر صحابی کا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ

رحمت دوعالم، محسن انسانیت رسول اکرم ﷺ کی تربیت کا آپؐ کے صحابہؓ پر ایسا گہرا اثر ہوا تھا کہ وہ بڑے بڑے عہدے اور منصب پر فائز ہونے کے باوجود عیش وعشرت کے پرفریب دام میں نہیں پھنستے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے عہد خلافت میں ملک شام کے علاقے "حمص" کا گورنر حضرت سعید بن عامر الجمحیؓ کو بنایا تھا، حضرت عمرؓ کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ ان کے امراء پر امارت کا منفی اثر نہ پڑ جائے اور خدانخواستہ وہ بلند ترین منصب اور عہدے کے غرور میں مبتلا نہ ہو جائیں؛ اس لیے وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لیتے رہتے تھے؛ چناں چہ ملک شام تشریف لے گئے، جب "حمص" پہنچے تو لوگوں نے پرجوش استقبال کیا، حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے ان سے یہ سوال کیا کہ "آپ نے اپنے امیر کو کیسا پایا؟" لوگوں نے اپنے امیر کی متعدّد شکایتیں حضرت عمرؓ کے سامنے رکھ دیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی مجلس میں حضرت سعید کو اور وہاں کے لوگوں کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جو حسنِ ظن انھوں نے حضرت سعید کے ساتھ قائم کیا تھا وہ غلط ثابت نہ ہو۔

جب وہ سارے اکٹھے ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا: آپ کو اپنے امیر سے کیا شکایت ہے؟ انھوں نے پہلی شکایت یہ کی کہ وہ گھر سے روزانہ تاخیر سے نکلتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعیدؓ سے فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت سعید چند لمحے خاموش رہے، پھر کہا کہ اللہ کی قسم مجھے اپنا یہ معاملہ سب کے سامنے رکھنا ناگوار تھا؛ لیکن اب چوں کہ ذکر کیے بغیر کوئی چارہ نہیں؛ اس لیے عرض کرتا ہوں؛ میرے گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے؛ اس لیے روزانہ صبح اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے آٹا گوندھتا ہوں، پھر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیتا ہوں، تاکہ خمیر بن جائے، پھر اس کی روٹی پکاتا ہوں، اس کے بعد وضو کر کے سرکاری کام کے لیے باہر آتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ اور کیا شکایت ہے؟ کہنے لگے کہ مہینے میں ایک روز غائب رہتے ہیں، اس کے جواب میں حضرت سعیدؓ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! میں نے جیسا کہ عرض کیا، میرے گھر میں کوئی خدمت گزار نہیں ہے، میرے جسم پر جو کپڑے آپ دیکھ رہے ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا میرے پاس نہیں ہے؛ لہٰذا مہینے میں ایک مرتبہ اپنے کپڑے دھوتا ہوں، جب خشک ہو جاتے ہیں تو انھیں پہن کر دن کے آخری حصے میں لوگوں کے کام کے لیے باہر نکلتا ہوں... یہ سب سن کر آخر میں حضرت عمرؓ نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ سعیدؓ کے ساتھ میرا حسن ظن بالکل صحیح ثابت ہوا۔

ناداری سے اللہ کی پناہ

غِنی اور مال داری ایک نعمت ہے جو شرعاً مطلوب ہے، جب کہ فقر اور ناداری ایک بلاء اور مصیبت ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے، آپؐ کی یہ دعاء

منقول ہے:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ، وَالْفَقْرِ» [أبوداؤد]

”اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کفر اور فقر و غربت سے“۔[ابوداؤد]

ناداری اگر کوئی مستحسن اور قابل تعریف شئ ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ قطعًا اس سے پناہ نہیں مانگتے اور صاحب ثروت ہونا اگر قبیح یا قابل مذمت ہوتا تو حضرت انسؓ کے لیے یہ دعا نہیں فرماتے:

««اللَّهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ، وَوَلَدَهُ» [متفق عليه]

”اے اللہ! انس کے مال اور عیال میں اضافہ فرما“۔[متفق علیہ]

اسی لیے حضرت عمرؓ فرماتے تھے: «لَوْ كَانَ الْفَقْرُ رَجُلاً لَقَتَلْتُهُ». ”اگر فقر کوئی آدمی ہوتا تو میں اسے قتل کردیتا“۔

غربت وناداری کے بے شمار نقصانات ہیں، اگر دل کا غِنی نہ ہو اور ایمانی قوت بھی ساتھ نہ دے تو ناداری بعض دفعہ کفر وارتداد تک پہنچادیتی ہے، عزت آبرو نیلام کرنے پر آمادہ کردیتی ہے، دوسروں کی طرف للچائی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور کردیتی ہے؛ لہٰذا اس مصیبت سے بچنے کے لیے تمام مباح وسائل وذرائع استعمال کیے جانے چاہییں، اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا حصول، تعلیم گاہوں کا قیام، کمپنیوں اور کارخانوں اور صنعت کاریوں کی کثرت وبہتات اور دیگر مباح پیشوں سے وابستگی اور حرکت وعمل اور جد وجہد اور مجاہدانہ زندگی گزارنا ضروری ہے، مشہور مقولہ ہے:

«حَرِّكْ يَدَيْكَ تُرْزَقْ» اپنے ہاتھوں کو حرکت میں لاؤ تب ہی روزی ملے گی“۔

زندہ قومیں سست، بزدل اور رفاہیت پسند نہیں ہوتیں؛ اسی لیے رسول اکرم ﷺ اپنی دعاؤں میں سستی اور بزدلی سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ یہ دنیا مقابلے کی دنیا ہے، محنت وجاں فشانی کی دنیا ہے، حرکت وعمل کی دنیا ہے، جس طرح آخرت کی نعمتیں بغیر ایمان اور عمل صالح کے نہیں ملتیں، اسی طرح دنیا کی عزت وسرخروئی، سیاسی اور اقتصادی بالادستی بھی بغیر محنت ومشقت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دارین کی سعادتیں نصیب فرمائیں۔

* * *

۱۲/شوال ۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی زندگی پر ایمان ویقین کا اثر

قانونِ قدرت

دنیا کی اس زندگی میں انسان کے اوپر ناموافق حالات کا آنا، مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہونا، الم ناک بیماریوں میں مبتلا ہونا ایک فطری بات ہے، اس کائنات اور اس میں رہائش پذیر انسانوں کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ انھیں مصیبتوں، آفتوں اور بلاؤں سے گزرنا پڑتا ہے؛ چناں چہ کبھی کاروبار کا خسارہ، کبھی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون، کبھی مہلک بیماری، کبھی کسی عزیز ترین شخص کی وفات اور کبھی مال ومتاع کی تباہی وغیرہ کا سامنا کرتے رہنا پڑتا ہے۔ عربی کے ایک شاعر نے دنیا کا حال یوں بیان کیا ہے:

جُبِلَتْ عَلى كَدَرٍ وَأَنْتَ تُرِيْدُهَا صَفْوًا مِنَ الأَكْدَارِ وَالآلاَمِ
وَمُكَلِّفُ الأَيَّامِ ضِدَّ طِبَاعِهَا مُتَطَلِّبٌ فِيْ المَاءِ جَذْوَةَ نَارِ

ترجمہ: ”اس دنیا کے خمیر میں ہموم وغموم شامل ہیں حالاں کہ تم یہ چاہتے ہو کہ یہ ان مصیبتوں سے بالکل پاک ہو۔ اور روزگارِ زندگی سے اس کی فطرت کے خلاف کسی چیز کی امید رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے پانی میں آگ کی چنگاری کا متلاشی ہو“۔

یہی اس دنیا کا دستور ہے، کبھی خوشی کبھی غم، کبھی مسکراہٹ کبھی چشم نم، کبھی راحت وآرام اور کبھی مصائب وآلام۔ «دَوَامُ الحَالِ مُحَالٌ» یکساں حالت کبھی نہیں رہتی۔

اہلِ حق کی آزمائش

تاہم جو لوگ اصحابِ دعوت وعزیمت اور حق وانصاف کے علم بردار ہوتے ہیں، اور حشمت وحیا اور عفت وپاک دامنی اور اخلاقِ کریمانہ کے داعی ہوتے ہیں ان کی آزمائشیں دو چند ہوتی ہیں، چناں چہ کائنات کے سب سے راست باز اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کو دیگر تمام انسانوں سے زیادہ مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا، جب وہ لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلاتے تو طاغوت کے پرستار ان سے جنگ وجدال کرتے، جب وہ حق کی صدا بلند کرتے تو باطل کے پجاری ان کی آوزیں بند کرنے کی کوشش کرتے، ایک طرف وہ رشد وہدایت اور خیر وفلاح کی محنت کرتے تو دوسری طرف بے حیائی، بدکاری اور ضلالت کے داعی ان کا مقابلہ کرتے اور معاشرے میں انھیں بدنام کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔

یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا؛ بلکہ اہل ایمان اور اہلِ حق کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز چراغِ مصطفوی سے، شرارِ بُولہبی

یہ دنیا آزمائش اور امتحان کی جگہ ہے، اس لیے خدائے پاک نے کچھ اسی طرح اس دنیا کو بنایا ہے، چناں چہ اس نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ابلیس کو بھی پیدا کیا، حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ نمرود کو اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ فرعون کو اور آخر میں حضرت محمد ﷺ کے

ساتھ ابوجہل کو بھی پیدا کیا؛ کیوں کہ اگر رات کی تاریکی نہ ہو تو دن کی روشنی کی قیمت کوئی کیوں کر سمجھے گا۔

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ ٱلْإِنسِ وَٱلْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ ٱلْقَوْلِ غُرُورًا﴾ [الأنعام: ١١٢]

"اور اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جو دھوکہ دینے کی خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے تھے..."[سورۃ الانعام:١١٢]

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ ٱلْمُجْرِمِينَ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ﴿٣١﴾﴾ [الفرقان: ٣١]

"اور ہم نے اسی طرح مجرم لوگوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے، اور تمہارا پروردگار ہدایت دینے اور مدد کرنے کے لیے کافی ہے"۔[سورۃ الفرقان:٣١]

جس طرح انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ ہوا، اسی طرح ان کے وارثین اور نائبین اور ان کی دعوت کے حاملین کے ساتھ ہوتا رہے گا، ہمیشہ سرکش، بے حیا، باطل پرست اور گم راہ لوگ ان کی مخالفت کرتے رہیں گے؛ لیکن انجام کار، مخلص، امانت دار اور تقویٰ شعار لوگوں کے لیے مقدر ہے۔

حدیث پاک میں وارد ہے، ایک صحابی نے عرض کیا: "یا رسول اللہ"!:

«أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً؟ قَالَ: الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ، فَيُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَإِنْ كَانَ دِينُهُ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلَاؤُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ، ابْتُلِيَ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَمَا

يَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ، مَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ». [رواه الترمذي]

"اے اللہ کے رسول! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء پر، پھر ان کے بعد جو مرتبے میں ہیں، پھر جو ان کے بعد مرتبے ہیں، بندے کی آزمائش اس کے دین کے اعتبار سے ہوتی ہے، اگر بندہ اپنے دین میں سخت ہے تو اس کی مصیبت بھی سخت ہوتی ہے، اور اگر وہ اپنے دین میں نرم ہوتا ہے تو اس کے دین کے مطابق ہی مصیبت بھی ہوتی ہے، پھر مصیبت بندے کے ساتھ لگی رہتی ہے، یہاں تک کہ بندہ روئے زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا"۔ [ترمذی شریف]

مصائب کے مقابلے میں "ایمان" کا معجزانہ کردار

مصائب وآلام اور سخت سے سخت حالات میں محض "ایمان" ہی وہ امر ہے جو ایک مؤمن کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور لوہے سے زیادہ طاقتور بنا دیتا ہے، اسی لیے ایک ایمان والا جو اللہ، اس کے رسول اور آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ بلاؤں پر سب سے زیادہ صبر کرنے والا، مصائب میں سب سے زیادہ ثابت قدم اور ہر حال میں اللہ کی مرضی پر راضی رہتا ہے۔

اس لیے کہ ہر مؤمن کا یہ یقینِ مُحکم ہے کہ اللہ جل شانہ حکیم ہیں، اور ان کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا، ہر امر میں ان کی حکمتِ بالغہ ہوتی ہے۔ مصائب میں مسلمان اس لیے بھی نہیں گھبراتا کہ اس کا ایمان ہے کہ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا بہت مختصر ہے اور یہاں کی زندگی عارضی ہے؛ لہٰذا وہ آخرت کی جنت سے پہلے اس دنیا کو اپنی

جنت بنانے کی تمنا ہرگز نہیں کرتا؛ بلکہ آخرت کی جنت کی تیاری کے لیے یہاں ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ﴾ [النساء: ۷۷]

”آپ کہہ دیجیے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا سا ہے، اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اس کے لیے آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے“۔[سورۃ النساء:۷۷]

سخت حالات کے سامنے پہاڑ کی چٹان اس لیے بھی وہ بن جاتا ہے کہ اس کا یہ ایمان ہے کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ برحق ہے؛ لہٰذا جو چیز اس تک پہنچنے والی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو پہنچنے والی نہیں ہے اسے کوئی لا نہیں سکتا، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے ثابت قدمی اور صبر پر بے حساب اجر عنایت فرماتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝١٠﴾ [الزمر: ۱۰]

”جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں، ان کا ثواب انھیں بے حساب دیا جائے گا“۔ [سورۃ الزمر:۱۰]

مزید یہ ہے کہ اس ایمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ کی جنت میں داخل فرمائیں گے، اور بے ایمان کو اس کے کفر کی وجہ سے ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں داخل فرمائیں گے۔

جس قدر ایک مسلمان کا ایمان قوی ہوگا اسی کے بقدر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا حسنِ ظن بڑھتا جائے گا اور آخرت کی رغبت بھی بڑھتی جائے گی؛ بلکہ دنیا سے بے رغبتی بھی پیدا ہوتی چلی جائے گی؛ کیوں کہ جس مؤمن کا دل، ایمان ویقین سے لبریز ہے اسے پختہ یقین ہے کہ اس دنیا کی وقعت، اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے، یہ دنیا حقیقت میں، دائمی اور ابدی زندگی تک پہنچنے کے لیے ایک پُل کی حیثیت رکھتی ہے، نیز

اس کا ایمان ہے کہ خشوع خضوع کے ساتھ پڑھی گئی دو رکعتیں، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دنیا اور اس کے اندر کی تمام چیزوں سے بہتر ہیں، نیز جنت کا وہ مقام جہاں ایک جنتی اپنا قدم رکھے گا وہ پوری دنیا اور اس کے اندر کی تمام چیزوں سے کہیں بہتر ہے۔

تاہم، دنیا کی بے ثباتی اور زہد و قناعت کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان اس دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر زندگی بسر کرے، معاشی، دفاعی اور سیاسی میدانوں کو دوسروں کے حوالے کر کے محکومی اور رسوائی کی زندگی گزارے؛ بلکہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ قوتِ ایمانی اور صدق و عزیمت کے ساتھ باعزت زندگی گزارے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے، اس کا ایمان اسے اس دنیا میں بھی سرفرازی عطا کرتا ہے، اسی لیے ایک مؤمن اللہ کے سوا کسی کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا، اس کے رکوع و سجود کا حق دار صرف اور صرف خدائے ذوالجلال والاکرام ہے، وہ اپنی زبان کو ہر حال میں حق و صداقت کے لیے استعمال کرتا ہے، اگر کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی ظلم و زیادتی یا سرکشی یا ناانصافی ہر گز نہیں کرتا۔

اسی سے زمین و آسمان قائم ہیں

رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کو کھجوروں میں حصہ لگانے کے لیے خیبر روانہ فرمایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ صلح کے مطابق وہاں کی کھجوروں کا نصف حصہ ان یہودیوں کا بنتا تھا جو وہاں آباد تھے اور نصف مسلمانوں کا؛ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ گئے اور فرمایا کہ: اس کھجور میں تمہارا حصہ اتنا بنا اور ہمارا یعنی مسلمانوں کا اتنا... فلاں قسم کی کھجور میں تمہارا اتنا اور مسلمانوں کا اتنا...۔

یہودیوں نے اپنی بددیانتی اور خباثت کے نتیجے میں ان کے سامنے ایک ناپاک تجویز رکھی، انھوں نے اپنی عورتوں کے زیورات جمع کیے اور بطور رشوت کے ان کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ آپ خود رکھ لیں اور تقسیم میں ہماری رعایت کریں، یعنی انصاف کرنے کے بجائے ہمیں زیادہ کھجوریں دے دیں۔ حضرت عبداللہ نے ان کی یہ حرکت دیکھ کر فرمایا:

> ”اے یہودیوں کے گروہ! اللہ کی قسم تم میرے نزدیک بدترین مخلوق ہو اور تم سے مجھے سخت عداوت ہے؛ لیکن اس عداوت کے باوجود میں تمہارے ساتھ ہرگز ناانصافی نہیں کرتا، اور یہ جو رشوت تم نے پیش کی ہے یہ حرام اور خبیث ہے اور ہم حرام نہیں کھاتے“۔ یہ سن کر یہودیوں نے برجستہ کہا: ”اسی سے زمین وآسمان قائم ہیں“۔[ابوداؤد شریف]

لہٰذا مؤمن کی قوت کا راز اس کے عدل وانصاف اور صداقت وامانت میں پوشیدہ ہے، اس ایمانی قوت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ ثابت قدم رہتا ہے، اس کا قدم ذرا بھی ڈگمگاتا نہیں، خدا کے سوا کسی سے ڈرتا نہیں، دشمن خواہ کتنا ہی طاقتور ہو، اس کی تعداد بھی زیادہ ہو، پھر بھی اس کے دل میں ان کا خوف پیدا نہیں ہوتا۔

اس کا ایمان، اس سے مادّی قوتوں سے زیادہ معنوی قوتوں کے حصول کا مطالبہ کرتا ہے، ظاہر سے زیادہ باطن کی اصلاح پر توجہ دیتا ہے۔ اگر کسی معرکۂ حیات میں اسے خبر ملتی ہے کہ دشمنوں کی مقدار زیادہ ہے تو وہ کلام الٰہی کی تلاوت کرتا ہے:

﴿كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾﴾ [البقرة: ٢٤٩]

ترجمہ: ”نہ جانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر

غالب آئی ہیں۔ اور اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں“۔

[سورۂ بقرۃ:۲۴۹]

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ تمہارے دشمنوں کے پاس تم سے زیادہ مال و دولت ہے جسے وہ تمہارے مقابلے کے لیے خرچ کر دیں گے، تو وہ اس آیت کی تلاوت کرتا ہے:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ لِيَصُدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ ﴾

[الأنفال: ٣٦]

”جن لوگوں نے کفر اپنا لیا وہ اپنے مال اس لیے خرچ کر رہے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ خرچ تو کریں گے، مگر پھر یہ سب کچھ ان کے لیے حسرت کا سبب بن جائے گا اور آخر کار یہ مغلوب ہو جائیں گے“۔

[سورۂ انفال:۳۶]

اگر کوئی انھیں دشمنوں کی چالوں اور مکر و فریب سے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ آیت پڑھ دیتے ہیں:

﴿ وَمَكَرُوا۟ وَمَكَرَ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ ﴿٥٤﴾ ﴾

[آل عمران: ٥٤]

”اور ان کافروں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے“۔[سورۃ آل عمران:۵۴]

ایمان والا اپنی فتح و کامرانی کے لیے تمام تر ضروری اسباب و وسائل کا انتظام کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمایت میں قدم بڑھاتا ہے، اسی کے نور سے دیکھتا ہے اور اسی سے

طاقت وقوت حاصل کرکے اپنی قوت کا بوقت ضرورت مظاہرہ کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان وہ سرمایۂ عظیم ہے جو ظاہری اور مادی اسبابِ قوت سے بھی مسلّح ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور باطنی اور روحانی قوت بھی فراہم کرتا ہے: مؤمن، متواضع ضرور ہوتا ہے؛ لیکن ذلت کے ساتھ نہیں، وہ زور آور بھی ہوتا ہے؛ لیکن تکبر اور گھمنڈ کے ساتھ نہیں، اس کا ایمان اسے ایسا یقینِ کامل عطا کرتا ہے جو اس کے حوصلے کو بلند کرتا ہے، ایسا عزم اور فولادی ارادہ دیتا ہے جو کبھی ٹوٹتا یا کمزور نہیں ہوتا، وہ دنیا پر حکمرانی تو کر سکتا ہے لیکن دنیا اس پر اپنی حکمرانی نہیں کر سکتی، وہ مال جمع کر سکتا ہے؛ لیکن مال کا غلام نہیں بن سکتا، وہ ناز ونعمت اور آرام وآسائش کے سمندر میں غوطہ لگاکر بھی نہ اتراتا ہے نہ ہی کسی کو حقیر سمجھتا ہے، اس پر مصیبت بھی آتی ہے؛ لیکن اسے مایوس نہیں کر سکتی، واقعہ یہ ہے کہ مشکل ترین حالات، ایک ایمان والے کی قوتِ ارادی اور عزیمت وحوصلے کو مزید جلا بخشتے ہیں۔

ایمان کی کرشمہ سازی

ایک مؤمن کا دل جب ایمان ویقین کی حقیقی کیفیات سے معمور ہوجاتا ہے تو پھر وہ ایمان اپنا ایسا رنگ دکھاتا ہے جو ناقابل یقین حد تک غیر معمولی اور تعجب خیز ہوتا ہے۔ جب وہ صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور یہ کہتے ہوئے اس کا پورا وجود یہ گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ معبود برحق، مشکل کشا، مقصود ومطلوب، محبوب ومرغوب اور ہر طرح کی حمد وستائش کا مستحق صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے، ساتھ ہی ساتھ وہ باطل اور طاغوتی طاقتوں کی نفی اور ان کی بے ثباتی کا اعلان کرتے ہوئے ملکِ الملوک، زمین وآسمان کے خالق ومالک کی پناہ میں اپنے آپ کو دے رہا ہوتا ہے، جو روزی رساں، کارساز ہے، اور اسی

کے قبضۂ قدرت میں موت وحیات ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال وپرِ روح الامیں پیدا

(اقبال)

یہ ایمان در حقیقت انقلاب برپا کرتا ہے، ذرے کو آفتاب بناتا ہے اور کمزور کو ناقابل تسخیر قوت دیتا ہے ـــــ اسی ایمان کا یہ کرشمہ تھا کہ بلال حبشی جو بازاروں میں بیچے اور خریدے جاتے تھے اور غلامی کی ذلت آمیز زندگی بسر کررہے تھے، ایمان لانے کے بعد اپنے بے ایمان آقا کی آنکھوں میں آنکھیں ملاکر باتیں کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور جبّار مکہ ابوجہل کو للکارتے اور اس سے برسرپیکار ہوتے ہیں ـــــ اسی ایمان نے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو بڑی بڑی جماعتوں اور ناخواندہ وپس ماندہ بدوؤں کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں پر غالب کیا، ان کے ایمان نے انہیں ذلت یا محکومیت یا مظلومیت کی زندگی کو برداشت کرنے کے بجائے، انہیں باعزت زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا، چناں چہ وہ ظالموں اور خدا کے باغیوں کے خلاف اس طرح شمشیر برہنہ بن جاتے کہ مدمقابل کے دل کانپ اٹھتے تھے۔ دل میں ایمان ویقین کا نور، ایک ہاتھ میں قرآن مقدس، دوسرے ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ہوے گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوکر شاہانِ فارس وروم کو مخاطب کرکے یوں کہتے:

> ”اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے مبعوث کیا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی غلامی سے چھٹکارا دلاکر خدائے بزرگ وبرتر کی بندگی کا راستہ دکھائیں اور شرک وبدعات سے نکال کر خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کا خوگر بنائیں“۔

مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا

یہ وہ ایمان ہے جو مومن کو کسی حال میں مایوس نہیں ہونے دیتا؛ کیوں کہ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر صدق دل سے وہ اللہ کا ہوجائے تو اللہ بھی اس کا ہوجائے گا، جو اللہ کا ہوگیا، اللہ بھی اس کا ہوگیا، اسے اپنے رب کے اس وعدے کا بھرپور یقین ہوتا ہے کہ جو شخص ایمان کے ساتھ تقویٰ اور صبر کا دامن تھام لے، تو اس کے خلاف خفیہ یا اعلانیہ سازش کرنے والے، بدخواہ، شرانگیز اور خیانت کار لوگ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِن تَصْبِرُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۗ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿١٢٠﴾﴾ [آل عمران: ١٢٠]

”اگر تم صبر اور تقویٰ سے کام لو تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی، جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کے (علم اور قدرت کے) احاطے میں ہے“۔

[سورۂ آل عمران:۱۲۰]

❊ ❊ ❊

۱۹/ذوالحجہ ۱۴۲۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بداخلاق "بزرگ"

اخلاقیات اور عبادات دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں؛ کیوں کہ ان دونوں کا سرچشمہ ایمان ہے، جس کے دل میں سچا ایمان ہوگا، اس کے اعضاء و جوارح سے مخلصانہ عبادات اور کریمانہ اخلاق کا صدور ضرور ہوگا، یہ ممکن نہیں کہ ایک مومن اچھا عبادت گزار ہو اور اخلاق سے عاری ہو، اسی طرح یہ بھی اس کے ایمانی شان کے خلاف ہے کہ خوش اخلاق تو ہو؛ لیکن اپنے خالق و مالک کی عبادت سے محروم ہو، ایک مومن بھرپور اخلاص کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی مبارک تعلیمات کی روشنی میں عبادت بھی کرتا ہے اور ہر ایک کے ساتھ اعلیٰ اخلاق سے پیش بھی آتا ہے۔

عبادات میں اخلاق کا پہلو

جب ہم ان عبادات کو دیکھتے ہیں جو اسلامی ارکان کی حیثیت رکھتی ہیں تو ہمیں ان کے اندر نمایاں طور پر تزکیۂ نفس اور اخلاقِ فاضلہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر "اقامتِ صلاۃ" کو لیجیے، جو شخص خشوع خضوع کے ساتھ نماز کے آداب و شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اخلاص و احسان کے ساتھ ادا کرتا رہے گا، تو یقینی طور پر نماز اسے بے حیائی

اور گناہ کے کاموں سے روک دے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿...وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ ۖ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ ٱللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ﴿٤٥﴾﴾ [العنكبوت: ٤٥]

"... اور نماز قائم کرو۔ بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سب کو جانتا ہے"۔[سورۃ العنکبوت:۴۵]

لہٰذا اگر کسی نمازی سے غیر اخلاقی امور سرزد ہوتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے نماز کی حقیقت نہیں پائی؛ لیکن اگر اخلاص اور صفت احسان کے ساتھ نماز ادا کرنے کی مشق اور کوشش کرتا رہا تو یقیناً یہ نماز اسے فوراً یا دیر سے ہر طرح کی غیر اخلاقی حرکتوں سے روک دے گی۔

یہی معاملہ زکات کا ہے، جب کوئی صاحب مال زکات ادا کرے یا صدقہ کرے تو ہم دردی اور غم گساری کے جذبات بھی دل میں ہونے چاہییں؛ کیوں کہ زکات کی ادائیگی سے صرف ایک فریضہ ہی نہیں ادا ہوتا؛ بلکہ اس کی وجہ سے دلوں کی صفائی بھی ہوتی ہے، دلوں میں نرمی بھی پیدا ہوتی ہے اور معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ اللہ پاک نے زکات کے مقاصد کی طرف ہمیں متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٣﴾﴾ [التوبة: ١٠٣]

”آپ ان لوگوں کے مال میں سے صدقہ وصول کریں جس کے ذریعے سے آپ ان کو پاک صاف کردیں اور ان کے لیے دعا کیجیے، یقیناً آپ کی دعا ان کے لیے سراپا تسکین ہے، اور اللہ ہر بات سنتا اور سب کچھ جانتا ہے“۔[سورۃ التوبہ:۱۰۳]

لہٰذا نفس کا تزکیہ اور اس کی صفائی اور معاشرے کی ترقی اور خوش حالی، زکات وصدقات کی حکمتوں اور مصلحتوں میں سے ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے لفظ صدقہ کے مفہوم ومعنی کو مزید وسیع کرکے بیان فرمایا ہے:

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَأَمْرُكَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَإِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِي أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَبَصَرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدِيءِ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَةَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِي دَلْوِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ».

[رواہ الترمذی]

”اپنے بھائی کے سامنے تمہارا مسکرانا تمہارے لیے صدقہ ہے، تمہارا بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، گم کردۂ راہ شخص کو تمہارا راستہ دکھا دینا صدقہ ہے، کسی کمزور نگاہ والے کو راستہ دکھانا تمہارے لیے صدقہ ہے، پتھر، کانٹا اور ہڈی کو راستے سے ہٹا دینا تمہارے لیے صدقہ ہے، اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں تمہارا پانی ڈالنا تمہارے لیے صدقہ ہے“۔[ترمذی شریف]

اسی طرح روزے کی مشروعیت میں بھی اخلاقی اقدار کی تربیت اور نفس کا تزکیہ شامل ہے، چناں چہ اسلام نے جب روزے کو مشروع قرار دیا تو اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ

وقتی طور پر ایک انسان اپنے آپ کو کھانے پینے اور خواہشات کی تکمیل سے روک لے؛ بلکہ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ انسان ہمیشہ کے لیے ناجائز خواہشات کی تکمیل سے باز آجائے اور نفس کو اس کے تمام رذائل اور برائیوں سے پاک صاف کر کے تقویٰ شعار بن جائے۔ اسی لیے رسول کریم ﷺ نے روزے دار کو پر زور لہجے میں تنبیہ فرمائی ہے۔

ارشادِ نبوی ہے:

«مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لله حَاجَةٌ بِأَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». [رواه الترمذي]

”جو (روزے دار) جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں“۔ [ترمذی شریف]

یعنی روزے کی حالت میں خاص طور پر بلند اخلاق کا نمونہ پیش کرے۔

فریضۂ حج کو لیجیے! کیا حج کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک مسلمان مقاماتِ مقدسہ کا سفر کرے اور اس سفر میں آنے والی مشقتوں کو برداشت کرے اور لوگوں کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے معاملہ کرے؟ قطعاً نہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی نے یہ سب کچھ کیا لیکن اسی دوران اخلاقی انحطاط کا شکار ہوا، فسق وفجور اور زبان درازی سے باز نہیں آیا تو اس کا حج ”مبرور“ نہیں ہو سکے گا۔

قرآن کریم نے صاف طور پر حاجی کو یہ تعلیمات دی ہیں:

﴿ٱلۡحَجُّ أَشۡهُرٌ مَّعۡلُومَٰتٌۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي ٱلۡحَجِّۗ﴾ [البقرة: ۱۹۷]

”حج کے چند متعیّن مہینے ہیں، چناں چہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ

کر) اپنے اوپر حج لازم کرلے، توحج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے، نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا..."۔[سورۃ البقرۃ:۱۹۷]

بعثتِ نبوی کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل

اوپر ہم نے ان اہم اور بنیادی عبادات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جن کے ذریعہ ہم اپنے رب کا تقرب حاصل کرتے ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے دین میں اخلاق کا کیا مقام ہے اور عبادات کے ساتھ ان کا رشتہ کس قدر مضبوط ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، کہ خود رسول اکرم ہادئ عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ». [رواه الإمام مالك في الموطأ]

"میری بعثت ہی مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے"۔[موطا]

یعنی آپ ﷺ کی بعثت سے قبل بھی اچھے اخلاق پائے جاتے تھے، آپ کے عہد میں بھی تھے؛ لیکن ان میں نقص تھا، اس نقص وکمی کی تکمیل کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔

بداخلاق عبادت گزار کا بدترین انجام

بعض لوگوں کو عبادت کا بڑا شوق ہوتا ہے، اور یہ شوق مطلوب بھی ہے اور قابل تعریف بھی؛ لیکن جہالت کی وجہ سے یا بدقسمتی کہیے کہ وہ اخلاقی پہلو کو نظر انداز کردیتے ہیں، اپنی بدزبانی اور تند مزاجی کے لیے لوگوں میں مشہور ہوجاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دینداری اور پرہیزگاری کو بھی بدنام کرتے ہیں، لوگوں کو تدیُّن اور شرعی وضع قطع سے متنفر

کرتے ہیں؛ بلکہ اپنے اعمال بھی برباد کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا:

«يَا رَسُولَ الله إِنَّ فُلَانَةً تُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلَاتِهَا وَصِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا غَيْرَ أَنَّهَا تُؤْذِي جِيرَانَهَا بِلِسَانِهَا قَالَ هِيَ فِي النَّارِ».

[رواه أحمد]

"یارسول اللہ! فلاں (عورت) کثرت سے نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور صدقہ کرنے میں مشہور ہے؛ لیکن وہ اپنے ہم سایوں کو اپنی زبان سے اذیت دیتی ہے، تو آپؐ نے فرمایا: "یہ جہنمی ہے"۔ [مسند احمد]

جو شخص ایمان کا دعویٰ کرے اور کثرت سے عبادت و ریاضت بھی کرے؛ لیکن پڑوسی کے ساتھ بدسلوکی کرے، اس کے حقوق پامال کرے، اسے نقصان پہنچانے کے درپے رہے، الغرض اس کا پڑوسی اس کی بداخلاقی اور شرانگیزی سے محفوظ نہ رہے تو چاہے وہ رات بھر نمازیں پڑھے اور دن بھر روزے رکھے، شریعت کا حکم اس کے لیے نہایت سخت ہے۔

حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَالله لَا يُؤْمِنُ، وَالله لَا يُؤْمِنُ، وَالله لَا يُؤْمِنُ، قِيلَ: وَمَنْ يَا رَسُولَ الله؟ قَالَ: الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ».

[صحيح البخاري]

"بخدا وہ شخص ایمان والا نہیں، بخدا وہ شخص ایمان والا نہیں، بخدا وہ شخص ایمان

والا نہیں۔ عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! وہ کون شخص ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جس شخص کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو"۔ [بخاری شریف]

اخلاقیات کا مقام اسلام میں بڑا اونچا ہے، اس کے معنیٰ اور مفہوم کو پیہم نصائح اور عملی تطبیق کے ذریعہ ذہنوں میں بیٹھانا اور حسنِ اخلاق کا عادی بننا اور بنانا نہایت ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ ایمان واعمال اور اخلاق حسنہ کے درمیان ایسا مضبوط رشتہ ہے جو کبھی توڑا نہیں جاسکتا۔

جو "دین دار" چند عبادات کو پابندی سے انجام دے دیتا ہے؛ لیکن لوگوں سے نہایت درشت روئی سے پیش آتا ہے، مزاج کا ٹیڑھاپن اس کے تصرفات اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں جھلکتا ہے، بدسلوکی، بدزبانی اور گرم مزاجی بلکہ بدتمیزی ختم نہیں ہوتی، تو ایسا شخص اسلام کی نظر میں متقی، بزرگ اور ولی اللہ کیسے سمجھا جائے گا؟

ایمان کے ساتھ حسنِ اخلاق کے مستحکم رابطے کو مزید واضح کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مِنْ عَلاَمَاتِ الْمُنَافِقِ ثَلاَثَةٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا ائْتُمِنَ خَانَ». [صحيح مسلم]

"منافق کی تین علامتیں ہیں؛ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو خیانت کرے"۔

[مسلم شریف]

دوسری روایت میں ہے: «وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وزَعَمَ أَنَّه مُسْلِمٌ».

[صحيح مسلم]

یعنی اگرچہ روزہ رکھے، نماز پڑھے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے“۔[صحیح مسلم]

اخلاقی امور کا معاملہ غیر ضروری اسبابِ عیش وعشرت کی طرح قطعاً نہیں ہے جن سے استغنا اور بے نیازی ممکن ہو، اور جن کے بغیر بھی گزارہ ہوسکے؛ بلکہ زندگی کے ان بنیادی اصولوں میں سے ہے جن کے بغیر دین اور تدیّن نامکمل ہے۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ بداخلاقی اور بدسلوکی کی تاریک گلیوں سے نکل کر خوش اخلاقی اور حسنِ سلوک کی وسیع وعریض اور فرحت بخش فضاء میں سانس لیں، جو اصول وآداب، جود وکرم، تزکیہ وطہارت، عفت وعصمت، حیا وحشمت جیسے خوشبودار پھولوں سے مہک رہی ہو۔

پیغمبرؐ اسلام کی نظر میں اخلاق کا مقام ومرتبہ

جو لوگ محض اپنی عبادت پر نازاں رہتے ہیں اور اخلاقی پہلو کو نظر انداز کردیتے ہیں، انھیں رسول اکرم ﷺ کے ان مبارک ارشادات کو بغور پڑھنا چاہیے، جن کا تعلق اخلاق سے ہے اور جن سے اخلاق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پسندیدہ بندہ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا». [رواه ابن ماجه] ”لوگوں میں سب سے زیادہ عمدہ اخلاق والا شخص“۔[ابن ماجہ]

دوسری روایت میں فرمایا:

«إِنَّ الْفُحْشَ وَالتَّفَحُّشَ لَيْسَا مِنَ الْإِسْلَامِ، وَإِنَّ أَحْسَنَ

النَّاسِ إِسْلَامًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا». [مسند أحمد]

”بدگوئی اور دریدہ دہنی کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، اور سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں“۔[مسند احمد]

ایک اور روایت میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ فَأَعَادَهَا مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا. قَالُوْا: نَعَمْ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: أَحْسَنُكُمْ خُلُقًا». [رواه أحمد]

”کیا میں تمہیں اپنے محبوب ترین اور قیامت کے روز میری مجلس سے قریب ترین شخص کا پتہ نہ بتادوں؟ آپ ﷺ نے یہ سوال دو یا تین بار دہرایا——صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ضرور بتلادیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”تم میں کا سب سے اچھے اخلاق والا“۔[مسند احمد]

یعنی حسنِ اخلاق کی وجہ سے ایک مسلمان نہ صرف اللہ کے رسول ﷺ کا محبوب بن جاتا ہے؛ بلکہ قیامت کے روز آپؐ کی قربت کا شرف بھی حاصل ہوگا۔

ایک اور روایت میں ہے:

«مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَإِنَّ اللهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيْءَ». [رواه الترمذي]

”قیامت کے روز مؤمن کے میزانِ اعمال میں عمدہ اخلاق سے بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ نفرت فرماتے ہیں بے غیرت، بدزبان شخص سے“۔ [ترمذی شریف]

بلکہ حسنِ اخلاق کی وجہ سے ایک مومن شب بیدار اور روزے دار کے مرتبے کو پالیتا ہے، اگرچہ وہ تہجد گزار اور نفلی روزے دار نہ ہو؛ لیکن اعلیٰ اخلاق اور حسین کردار اور خوب صورت برتاؤ کی وجہ سے تہجد گزاروں اور روزے داروں کے مقام کو حاصل کرلیتا ہے۔

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيَبْلُغُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ».

[أبو داؤد]

"بلاشبہ مؤمن اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے روزے دار اور تہجد گزار کے مرتبے کو پہنچ جاتا ہے"۔ [ابوداؤد شریف]

یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ لوگ کثرتِ عبادت اور زہد وقناعت کو ہی ولایت، بزرگی اور دین داری سمجھتے ہیں، خواہ اس کے اخلاق نہایت پرلے درجے کے ہوں، تند مزاج ہو، بدتمیز اور بدتہذیب ہو، حالاں کہ یہ تدیّن اسلامی نقطۂ نظر سے ناقص ہے، جس دین داری میں اخلاقی عنصر کا فقدان ہو، وہ حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت سے ہم آہنگ دین داری نہیں ہے۔

نمونۂ اخلاقِ رحمتِ دوعالم ﷺ

رسول اکرم ﷺ سید العابدین والزاہدین تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاقِ کریمانہ کے اتنے اعلیٰ معیار پہ فائز تھے کہ خود رب الجلال نے آپؐ کے حسنِ اخلاق کی ستائش فرمائی ہے۔

﴿ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿٤﴾ ﴾ [القلم: ٤]

"اور یقیناً آپ اخلاق کے بڑے درجے پر فائز ہیں"۔[سورۂ قلم:۴]

آپ جب کسی امر کی تعلیم دیتے تھے تو صرف زبانی نہیں؛ بلکہ عملی طور پر اس کا نمونہ امت کے سامنے پیش فرماتے تھے، آپؐ کے کردار و گفتار میں کبھی تضاد نہیں ہوتا تھا، اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں:

«لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا. وَكَانَ يَقُولُ: إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا».

[صحيح البخاري]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بدگوئی فرماتے تھے نہ ہی بے حیائی کی کوئی بات کرتے؛ بلکہ آپ یہ فرماتے تھے:"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں"۔[بخاری شریف]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنْ كَانَتْ الْأَمَةُ مِنْ إِمَاءِ أَهْلِ الْمَدِينَةِ لَتَأْخُذُ بِيَدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَنْطَلِقُ بِهِ حَيْثُ شَاءَتْ».

[صحيح البخاري]

"مدینہ منورہ کی باندیوں میں سے کوئی باندی آپ کا دستِ مبارک پکڑ کر (یعنی آپ کی نرمی اور خوش اخلاقی سے مستفید ہوکر) جہاں چاہتی تھی آپؐ کو لے کر چلی جاتی تھی (اور اپنی کوئی ضرورت ہوتی تو آپؐ کے توسط سے پوری کرتی)۔[بخاری شریف]

اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش اخلاقی اور نہایت درجے کی خُرد نوازی اور کسرِ نفسی کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ -صلى الله عليه وسلم- إِذَا اسْتَقْبَلَهُ الرَّجُلُ، فَصَافَحَهُ، لاَ يَنْزِعُ يَدَهُ مِنْ يَدِهِ حَتَّى يَكُونَ الرَّجُلُ الَّذِى يَنْزِعُ، وَلاَ يَصْرِفُ وَجْهَهُ عَنْ وَجْهِهِ حَتَّى يَكُونَ الرَّجُلُ هُوَ الَّذِى يَصْرِفُهُ، وَلَمْ يُرَ مُقَدِّمًا رُكْبَتَيْهِ بَيْنَ يَدَىْ جَلِيسٍ لَهُ».

[سنن الترمذی]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی ملتا اور آپؐ سے مصافحہ کرتا تو آپؐ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہیں نکالتے جب تک وہ شخص اپنا ہاتھ نہیں نکال لیتا، اور آپؐ اپنا رخ اس کی طرف سے نہیں پھیرتے تھے جب تک کہ وہ خود ہی اپنا رخ نہ پھیر لیتا۔ اور آپؐ کو اپنے کسی ہم نشیں کے سامنے پیر پھیلا کر بیٹھتے ہوے نہیں دیکھا گیا"۔[ترمذی شریف]

یعنی آپ ﷺ اپنے ہم نشینوں کا خاص خیال فرماتے تھے، ان کے ساتھ تواضع سے پیش آتے تھے، ان پر اپنی فوقیت ظاہر نہیں فرماتے، اسی لیے اگر کوئی اجنبی شخص آتا تو اسے یہ دریافت کرنا پڑتا تھا کہ آپ میں سے محمد (ﷺ) کون ہیں؟

خلاصہ یہ کہ عبادت گزار جب حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرے گا تب ہی وہ اسلام کی صحیح ترجمانی کر سکے گا اور اس کی خوب صورت تعلیمات کو عملی شکل میں پیش کر سکے گا۔

❋ ❋ ❋

۱۴۲۸/۲/۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مالِ حرام کی نحوست

نادار انسان

مسلم شریف میں رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

«أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ». قَالُوا الْمُفْلِسُ فِينَا مَنْ لاَ دِرْهَمَ لَهُ وَلاَ مَتَاعَ. فَقَالَ: «إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِى يَأْتِى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلاَةٍ وَصِيَامٍ وَزَكَاةٍ، وَيَأْتِى قَدْ شَتَمَ هَذَا، وَقَذَفَ هَذَا، وَأَكَلَ مَالَ هَذَا، وَسَفَكَ دَمَ هَذَا، وَضَرَبَ هَذَا، فَيُعْطَى هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، وَهَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْضَى مَا عَلَيْهِ، أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ، فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِى النَّارِ». [صحيح مسلم]

''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ نے کہا: ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ درہم ہو نہ کوئی ساز وسامان۔ آپؐ نے فرمایا: ''میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکاۃ لے کر آئے گا، اور اس طرح

آئے گا کہ اس نے اس کو گالی دی ہوگی، اس پر بہتان لگایا ہوگا، اس کا مال کھایا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا اور اس کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیوں میں سے اس کو بھی دیا جائے گا اور اس کو بھی دیا جائے گا، اور اگر اس کے ذمے جو دوسروں کے حقوق ہیں ان کی ادائیگی سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو ان کے گناہوں کو لے کر اس پر ڈالا جائے گا، پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا''۔ [مسلم شریف]

اس حدیث پاک میں نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اسلام کے وسیع ترین مفہوم کو بیان کیا گیا ہے، جو لوگ تدیّن اور اسلام پسندی کو صرف چند عبادات جیسے نماز روزہ، زکاۃ اور حج وغیرہ کا مجموعہ سمجھتے ہیں، یا صرف تہجد گزاری، شب بیداری اور دن بھر روزہ رکھنے کو ہی دین داری سمجھتے ہیں اور دیگر اخلاقی اور معاملاتی امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں ان کو اس حدیث پاک کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

مشاہدہ یہ ہے کہ بعض لوگ خوب عبادت گزار ہوتے ہیں؛ لیکن بداخلاق ہوتے ہیں، اسی طرح بعض لوگ ذکر الٰہی میں بظاہر ''رطب اللسان'' ہوتے ہیں؛ لیکن بدمعاملہ ہوتے ہیں، حج پہ حج، عمرہ پہ عمرہ کرتے رہتے ہیں؛ لیکن معاملات میں دوسروں کو دھوکہ دینا یا جھوٹ بولنا، یا کسی کا مال ناحق غصب کرلینا یا کسی کی زمین وجائیداد کو دبالینا عقلمندی اور دانشمندی سمجھتے ہیں ـــــ سجدوں کی کثرت سے پیشانی پر نشان بنالیتے ہیں؛ لیکن اپنے ماتحتوں پر ظلم وستم ڈھاتے رہتے ہیں، دوسروں کی عزت وآبرو کو طشت از بام کرتے رہتے ہیں، ہر ایک کے ساتھ بدگمان رہتے ہیں، دوسروں کی غیبت یا بہتان تراشی سے اپنی زبان کو ناپاک اور بدبودار بناتے رہتے ہیں، جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو اپنی نگاہوں کو گندی اور ننگی تصویروں اور فلموں سے سینکتے رہتے ہیں اور اپنے دل کی دنیا کو وقتی نفسانی لذت کے لیے

تباہ و برباد کرتے رہتے ہیں۔

اس حدیث پاک میں اس اسلام سے خبر دار کیا گیا ہے، جس کی ترجمانی اخلاقِ فاضلہ سے نہ کی جائے، اس طرح کا ناقص اور "مغشوش اسلام" نہ اللہ کو مطلوب ہے نہ اس کے رسول کو۔ قرآنِ کریم کا مطالبہ ہے کہ ہر مسلمان مکمل طور پر دین میں داخل ہو اور زندگی کے ہر پہلو میں اسلامی تعلیمات کو برتے اور نافذ کرے۔

"مُعاملات" سچے مسلمان کے لیے کسوٹی

کسی مسلمان کی تقویٰ شعاری، اسلام پسندی اور خدا ترسی کا اندازہ اس کے معاملات سے کیا جا سکتا ہے، صاف شفاف اور سچائی و امانت داری کے ساتھ معاملہ کیے بغیر کوئی بھی مسلمان متقی نہیں ہو سکتا۔ معاملات کی درستگی اور عہد و پیمان کی پاسداری دراصل ایک مسلمان کے ایمان و یقین کو پرکھنے کی کسوٹی ہے، یہاں کھرا اور کھوٹا واضح طور پر نظر آجاتا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ بہ ظاہر ایک شخص بڑا عبادت گزار نظر آئے، ظاہری وضع قطع سے متقی اور پرہیزگار معلوم ہو، دعاؤں میں گریہ وزاری اور اشک باری سے اس کی خشیت و انابت کا نہ صرف گمان ہو، بلکہ یقین آجائے؛ لیکن جب آپ اس سے کوئی معاملہ کریں گے تو اس کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی، اگر وہ ان مذکورہ بالا صفات کا واقعی امین ہو گا اور ان میں سچا ہو گا تو معاملات میں بھی صاف ستھرا اور امانت دار ہو گا؛ لیکن اگر معاملات میں خیانت کرے، یا دھوکہ دے، ناجائز طور پر کسی کے مال یا زمین و جائیداد پر قبضہ کرے یا جھوٹ اور فریب سے کام لے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اسلامی وضع قطع اور ظاہری

عبادت گزاری اور نمائشی پرہیزگاری کو ''ناجائز مقصد'' کے حصول کے لیے استعمال کیا تھا۔

معاملات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس سلسلہ میں طویل ترین آیت نازل فرمائی ہے، پورے قرآنِ کریم میں سب سے طویل آیت وہی ہے جس میں خرید و فروخت، لین دین، قرض، رہن (گروی) اور ان معاملات کی توثیق کے اصول و قواعد ذکر کیے ہیں۔ دھوکے اور خیانت یا نسیان وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے ان معاملات کو تحریری شکل میں لانے اور ان پر گواہ مقرر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، ان احکام کو سمجھنے کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ کا مطالعہ کیجیے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ ...﴾ [البقرة: ۲۸۲]

اس سے پتہ چلا کہ شریعتِ مطہرہ میں جس طرح عبادات کو مرتب اور منظم شکل میں بیان کیا گیا ہے اسی طرح معاملات کو بھی، جس طرح عبادات کی اہمیت ہے اسی طرح معاملات کی بھی؛ چناں چہ عبادات میں امر و نہی ہے اور معاملات میں بھی امر و نہی ہے، دونوں میں ترغیب و ترہیب اور وعدہ وعید ہیں، یعنی دونوں میں کچھ پہلو ایسے ہیں جن کے کرنے کا حکم ہے، اس کی ترغیب ہے اور اس پر اجر کا وعدہ ہے، اسی طرح کچھ پہلو ایسے ہیں جن سے منع کیا گیا ہے اور ان پر وعید سنائی گئی ہے اور ان کے کرنے پر گناہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَأَوۡفُواْ ٱلۡكَيۡلَ إِذَا كِلۡتُمۡ وَزِنُواْ بِٱلۡقِسۡطَاسِ ٱلۡمُسۡتَقِيمِۚ ﴾

[الإسراء: ۳۵]

''اور جب کسی کو کوئی چیز پیمانے سے ناپ کر دو تو پورا ناپو، اور تولنے کے لیے صحیح

ترازو استعمال کرو...[سورۂ بنی اسرائیل:۳۵]

ایک جگہ اور ارشاد ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿١﴾ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ﴿٢﴾ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ﴿٣﴾ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ﴿٤﴾ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥﴾ ...﴾ [المطففين: ١ – ٥]

”بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی، جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے کوئی چیز ناپ کر لیتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں، اور جب وہ کسی کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ انھیں ایک بڑے زبردست دن میں زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا؟“۔[سورۂ المطففین:۱-۵]

لہٰذا ایک مسلمان جس طرح عبادت میں شرعی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے بغیر کسی کمی زیادتی کے زندگی گزارتا ہے، اسی طرح معاملات میں بھی شرعی حدود کی پابندی ضروری ہے، خواہ وہ خرید و فروخت ہو، کرایہ پہ لینا دینا ہو، کسی چیز کو گروی رکھنا رکھانا ہو، آپس میں شراکت کا معاملہ، کسی کو ملازم رکھنا یا کسی کے ہاں ملازمت کرنا ہو —— یہ اور اس طرح کے تمام امور میں شرعی قوانین و اصول کی پابندی کرنا اور صداقت و امانت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

حرام کمائی کا انجام

ایک حدیث میں رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد گرامی ہے:

«إِنَّ اللهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَخْلَاقَكُمْ، كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ،

وَإِنَّ اللهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ، وَلَا يُعْطِي الدِّينَ إِلَّا لِمَنْ أَحَبَّ، فَمَنْ أَعْطَاهُ اللهُ الدِّينَ، فَقَدْ أَحَبَّهُ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَا يُسْلِمُ عَبْدٌ حَتَّى يَسْلَمَ قَلْبُهُ وَلِسَانُهُ، وَلَا يُؤْمِنُ حَتَّى يَأْمَنَ جَارُهُ بَوَائِقَهُ ، قَالُوا: وَمَا بَوَائِقُهُ يَا نَبِيَّ اللهِ؟ قَالَ: غَشْمُهُ وَظُلْمُهُ، وَلَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالًا مِنْ حَرَامٍ، فَيُنْفِقَ مِنْهُ فَيُبَارَكَ لَهُ فِيهِ، وَلَا يَتَصَدَّقُ بِهِ فَيُقْبَلَ مِنْهُ، وَلَا يَتْرُكُهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ إِلَّا كَانَ زَادَهُ إِلَى النَّارِ، إِنَّ اللهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ، وَلَكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ، إِنَّ الْخَبِيثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيثَ». [رواه أحمد والحاكم]

”اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق کو ایسے ہی تقسیم کیا ہے جیسے تمہارے رزق کو، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ دنیا اسے بھی دیتے ہیں جس سے محبت فرماتے ہیں اور اسے بھی جس سے محبت نہیں فرماتے اور دین صرف اسے عنایت فرماتے ہیں جس سے محبت فرماتے ہیں؛ لہٰذا جسے اللہ نے دین سے سرفراز فرمایا ہے اس سے یقیناً اسے محبت ہے —— اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل اور اس کی زبان درست نہ ہوجائے، اور کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے شرور سے محفوظ نہ ہوجائے —— صحابۂ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! اس کے شرور کیا ہیں (یعنی شرور سے مراد کیا چیزیں ہیں؟) فرمایا: اس کا ظلم وستم —— اور جو شخص بھی حرام مال کماتا ہے، پھر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو اس میں برکت

نہیں ہوتی، اور اس سے صدقہ کرتا ہے تو وہ مقبول نہیں ہوتا، اور جب اسے اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو اس کے لیے جہنم کا توشہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتے؛ لیکن برائی کو بھلائی سے مٹاتے ہیں، اور خبیث، خبیث کو ختم نہیں کرتا"۔ [رواہ احمد فی مسندہ والحاکم فی صحیحہ]

اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حرام اور ناجائز طریقے سے مال کمائے گا تو اگرچہ بظاہر فائدہ اور نفع نظر آرہا ہوگا؛ لیکن حقیقت میں وہ خسارے میں ہوگا؛ کیونکہ وہ اپنے اس حرام مال کو یا تو اپنی دنیوی ضروریات میں خرچ کرے گا، یا آخرت میں ثواب کے لیے صدقہ کرے گا یا اس کو بچاکر ذخیرہ اندوزی کرے گا۔ ان تینوں صورتوں کا انجام اس حدیث میں بیان کردیا گیا ہے۔ اگر وہ دنیوی ضروریات میں خرچ کرے گا تو برکتوں سے محروم رہے گا، اگر اس مال سے صدقہ کرے گا تو قبولیت سے محروم رہے گا اور اگر بچاکر رکھے گا اور چھوڑ کر مرجائے گا تو اس کو جہنم میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا۔

یہ تو حرام طریقے سے کمائے ہوئے مال کا انجام ہے، لیکن اگر حلال طریقے سے پاکیزہ مال کمایا ہو تو «نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ» پاکیزہ مال ہو اور صالح آدمی کا ہو تو کیا ہی عمدہ بات ہے، حلال ذرائع سے خواہ کتنا ہی مال کمائے اس میں کوئی حرج نہیں بشرطے کہ حلال مصرف میں اسے خرچ بھی کرے۔

رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

«إِنَّ أَكْثَرَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مَا يُخْرِجُ اللهُ لَكُمْ مِنْ بَرَكَاتِ الْأَرْضِ، قِيلَ: وَمَا بَرَكَاتُ الْأَرْضِ؟ قَالَ: زَهْرَةُ الدُّنْيَا».

[صحيح البخاري]

”تمہارے اوپر جس چیز کا مجھے سب سے زیادہ خوف ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے زمین کی برکتیں نکال کر رکھ دیں گے۔ دریافت کیا گیا: زمین کی برکتیں کیا ہیں؟ ارشاد ہوا: دنیا کی زیب وزینت“۔[بخاری شریف]

اسی روایت میں آگے آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَإِنَّ هَذَا الْمَالَ حُلْوَةٌ، مَنْ أَخَذَهُ بِحَقِّهِ، وَوَضَعَهُ فِي حَقِّهِ، فَنِعْمَ الْمَعُونَةُ هُوَ، وَمَنْ أَخَذَهُ بِغَيْرِ حَقِّهِ كَانَ كَالَّذِي يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ». [صحيح البخاري]

”اور یہ مال بہت شیریں ہے، جس نے اسے حق کے ساتھ لیا اور حق میں ہی خرچ کیا تو یہ بہترین مددگار ثابت ہوگا، اور جس نے اسے ناحق طریقے سے حاصل کیا تو وہ اس شخص جیسا ہے جو کھاتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا (یعنی اس کا پیٹ نہیں بھرتا)۔

[بخاری شریف]

حرام مال کے مختلف ذرائع

مالِ حرام کے حصول کے متعدّد ذرائع ہیں، مختلف طریقوں سے لوگ حرام مال کماتے ہیں، ان میں سے ایک نہایت خطرناک اور ہلاکت خیز راستہ سودی کاروبار ہے، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ٱلَّذِينَ يَأۡكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ مِنَ ٱلۡمَسِّۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡبَيۡعُ مِثۡلُ ٱلرِّبَوٰاْۗ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْۚ ...﴾ [البقرة: ٢٧٥]

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو —— یہ اس لیے ہوگا کہ انھوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے، حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے...“۔ [سورۃ البقرہ:۲۷۵]

یعنی قیامت کے روز سود خور لوگ اس طرح اٹھیں گے جیسے وہ شخص اٹھتا ہے جسے کسی جن نے دبوچ لیا ہو یا جس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا ہو، پھر وہ شخص پاگل کی طرح ہو گیا ہو، اٹھتا ہو پھر گرتا ہو، اسی طرح سود خور بھی کھڑا ہوگا پھر گرے گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے «لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدَيْهِ». [رواہ مسلم]

”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت کی“۔ آگے فرمایا: «وَهُمْ سَوَاءٌ» یعنی گناہ میں یہ سب برابر ہیں۔ [مسلم شریف]

* کسب مال کے ناجائز طریقوں میں سے ایک جوے کے ذریعے حاصل کیا ہوا مال ہے، اسے بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اسے ”رِجس“ یعنی ناپاک کہا گیا ہے اور اسے شیطانی عمل بھی بتایا گیا ہے۔
* رشوت دینا اور لینا دونوں حرام ہیں، اور جو مال رشوت کے طور پر لیا گیا ہو گا وہ مالِ حرام ہو گا، رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے جس سے اس فعل کی شدید مذمت اور حرمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

«لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي»
[رواه الترمذي]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے پر لعنت فرمائی ہے“۔

ایک روایت میں ”الرائش“ کا بھی اضافہ ہے یعنی جو شخص ان دونوں کے درمیان وسیط اور دلال کا کام کرے اس پر بھی لعنت ہے۔

رشوت، دراصل معاشرے میں نفرت، بدعنوانی اور ظلم وزیادتی جنم دیتی ہے، اس کی وجہ سے مستحقین کے حقوق مارے جاتے ہیں اور دوسروں کو ناحق طور پر دے دیے جاتے ہیں۔ رشوت خوری یہودیوں کی نمایاں صفات میں سے ہے، جسے قرآن کریم «السُّحْت» کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

﴿سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّٰلُونَ لِلسُّحْتِ﴾ [المائدة: ٤٢]

”یہ (یہود) کان لگا لگا کر جھوٹی باتیں سننے والے ہیں، جی بھر بھر کر حرام (رشوت) کھانے والے ہیں“۔[سورۃ المائدۃ/آیت:۴۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عُجرۃؓ کو مخاطب کرکے فرمایا:

«يَا كَعْبَ بْنَ عُجْرَةَ إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ النَّارُ أَوْلَى بِهِ» [رواه الإمام أحمد في سنده]

”اے کعب بن عجرۃ! وہ گوشت جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جس کی پرورش حرام سے ہوئی ہو، آگ اس کے زیادہ لائق ہوگی“۔[مسند احمد]

* خرید وفروخت، لین دین، کرایہ پر لینا دینا، معاہدات کی توثیق اور اس طرح کے

دیگر معاملات میں چیٹنگ اور دھوکے بازی کے ذریعے مال حاصل کرنا حرام ہے، معاملات کے دونوں اطراف میں سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ دوسرے کو دھوکہ دے یا اپنی چالاکی سے اس کا حق مارلے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا». [رواه مسلم] "جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں"۔

ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:

«مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّى». [رواه مسلم] "جو دھوکہ دے وہ مجھ سے نہیں" یعنی اس کا تعلق مجھ سے نہیں۔

جو شخص رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے اپنی نسبت کا دعویٰ کرے اس کے لیے قطعًا اس کی گنجائش نہیں کہ کسی کو دھوکہ دے، یا فریب دے کر حرام مال حاصل کرے۔

* کسی مزدور سے کام لے کر اس کی مزدوری نہ دینا شریعت کی نگاہ میں عظیم جرم ہے، اس کے اوپر سخت وعید ہے، اس لیے ہر مزدور کو اس کی پوری پوری مزدوری ضرور دینی چاہیے، ورنہ اس کا بڑا وبال قیامت کے روز ہوگا؛ کیوں کہ اس مزدور کی طرف سے خود اللہ تعالیٰ دفاع فرمائیں گے اور مدعی بنیں گے، اور جس شخص کے خلاف قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مدعی بنیں گے اس کی ہلاکت میں کیا شبہ ہے؟

ارشاد نبوی ہے:

«قَالَ اللهُ: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ

أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ». [صحيح البخاري]

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تین طرح کے لوگ ایسے ہوں گے جن کے خلاف قیامت کے روز میں مدعی بنوں گا: ایک وہ شخص جس نے میرے نام پر عہد کیا پھر اسے توڑ دیا، ایک وہ شخص جس نے کسی آزاد شخص کو بیچ دیا پھر اس کی قیمت کھا گیا، اور وہ شخص جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا، پھر اس سے پورا کام لیا اور اس کی مزدوری نہیں دی“۔[بخاری شریف]

* جھوٹے مقدمات دائر کر کے اور جھوٹی قسمیں کھا کر کسی کا مال ہڑپنا، یہ بھی مالِ حرام کی ایک قسم ہے، یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسا شخص اگر اسی حال میں مر گیا تو قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اس کی طرف نظر کرم نہیں فرمائیں گے اس سے بات نہیں کریں گے؛ بلکہ اس پر ناراض ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو فرماتے ہوئے سنا:

«مَنْ حَلَفَ عَلَى مَالِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقِّهِ لَقِيَ اللهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ » قَالَ عَبْدُ الله ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا رَسُولُ الله – صلى الله عليه وسلم– مِصْدَاقَهُ مِنْ كِتَابِ الله ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يَشۡتَرُونَ بِعَهۡدِ ٱللَّهِ وَأَيۡمَٰنِهِمۡ ثَمَنٗا قَلِيلًا ﴾ إِلَى آخِرِ الآيَةِ.

﴿أُوْلَٰٓئِكَ لَا خَلَٰقَ لَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿٧٧﴾﴾

(آل عمران: ۷۷)» [صحيح مسلم]

”جس نے کسی مسلمان شخص کے مال کو حاصل کرنے کے لیے ناحق قسم کھائی، وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس سے ناراض ہو گا“۔ عبد اللہ نے کہا: پھر رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے اپنی بات کی تصدیق کے لیے کتاب اللہ سے پڑھا: إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ ... [سورۂ آل عمران:۷۷] (جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے)“۔ [مسلم شریف]

* ناپ تول میں کمی کرکے جو مال حاصل کیا جاتا ہے وہ مال بھی حرام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے اپنے پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کے توسط سے ان کی قوم کو پہنچایا:

﴿فَأَوْفُوا۟ ٱلْكَيْلَ وَٱلْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا۟ ٱلنَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ ...﴾ [الأعراف: ٨٥]

”پس تم ناپ اور تول پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کرکے مت دو“۔ [سورۃ الاعراف:۸۵]

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿١﴾ ٱلَّذِينَ إِذَا ٱكْتَالُوا۟ عَلَى ٱلنَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ﴿٢﴾ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ﴿٣﴾﴾ [المطففين: ١ – ٣]

”بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی، جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے کوئی چیز ناپ کر لیتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں، اور جب وہ کسی کو ناپ کر یا

تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں"۔ [سورۂ مطففین، آیت:۱-۳]

* کسی کی زمین وجائیداد یا املاک پر غاصبانہ قبضہ کرنا، یا اپنی طاقت وقوت کے ذریعے یا عہدے اور منصب اور اثر ورسوخ کو غلط استعمال کر کے ناجائز طور پر غصب کر لینا بڑا ظلم بھی ہے اور یہ مغصوب چیز باعث عذاب وعقاب بھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَـنْ ظَلَـمَ قِيـدَ شِـبْرٍ مِـنَ الأَرْضِ، طُوِّقَـهُ مِـنْ سَـبْعِ أَرَضِينَ». [صحيح البخاري]

"کسی نے ایک بالشت زمین بھی ظلم کر کے لے لی تو قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا"۔ [بخاری شریف]

* وراثت کے مال میں خیانت کرنا، ڈرا دھمکا کر یا دھوکہ دے کر اپنے حصے سے زائد مال لینا یا اخلاقی دباؤ ڈال کر بغیر رضامندی کے دیگر ورثہ کا مال ہتھیانا، بالخصوص کمزوروں کا حق مار لینا یہ سب شریعت کی نظر میں ناجائز اور حرام ہے۔

* شراب یا دیگر نشہ آور اشیاء کا کاروبار کرنا اور ان کے ذریعے مال کمانا بھی حرام ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوتی؛ بلکہ خرید وفروخت کرنے والے اور اس میں کسی طرح کا تعاون کرنے والے سارے لعنت کے مستحق بنتے ہیں۔

لقمۂ حلال ـــــ تقوے کی اعلیٰ مثال

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ جسم کا جو حصہ حرام غذا سے پرورش پاتا ہے، جہنم کی آگ اس کے لیے زیادہ لائق ہے، اس طرح کی تعلیمات کی وجہ سے صحابۂ کرامؓ اور امت کے

دیگر تقویٰ شعار علماء اور صلحاء ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے تھے، یہاں تک کہ شبہہ والی چیزوں سے بھی بچتے تھے، اس سلسلے کی دو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

بخاری شریف میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ مذکور ہے، ان کے ایک غلام نے ایک روز کھانے کی کوئی چیز پیش کی تو انھوں نے لے کر کھالی، جب کھالیا تو اس غلام نے کہا: آپ کو معلوم ہے یہ کس طرح کی کمائی کی چیز تھی جو آپ نے کھائی؟ فرمایا: کیسی تھی؟ تو اس نے کہا کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ”کہانت“ کے ذریعہ مال کمایا تھا، حالاں کہ مجھے ”کہانت“ نہیں آتی تھی؛ بلکہ میں نے دھوکہ دے کر یہ مال حاصل کیا تھا، آپ کی خدمت میں وہی پیش کیا تھا جو آپ نے کھا بھی لیا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے اپنا ہاتھ منھ میں ڈال کر پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں قے کر کے نکال دیں۔

دوسری مثال امام مالک نے موطا میں اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں ذکر کی ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک روز دودھ پیش کیا گیا، انھوں نے پی لیا اور پسند فرمایا، چوں کہ بہت لذیذ تھا اس لیے لانے والے سے دریافت فرمایا: کہاں سے لائے تھے؟ اس نے کہا کہ صدقے کی اونٹنیوں کے پاس سے گزرا، وہ پانی پی رہی تھیں اسی دوران ان کا دودھ نکال لیا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اپنی انگلی منھ میں ڈالی اور قے کر کے سارا دودھ باہر نکال پھینکا۔

خلاصۂ گفتگو

کوئی بندہ اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک اپنی غذا کے سلسلہ میں اپنا محاسبہ نہ کرے کہ وہ حلال ہے یا حرام، اگر کسی کا مال ناجائز طور پر حاصل کیا ہو تو موت سے پہلے

پہلے یا تو اس کا مال واپس کردے یا اس سے معافی تلافی کرالے، ورنہ قیامت کے روز کا حساب بڑا سخت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾﴾ [البقرة: ٢٨١]

''اور ڈرو اس دن سے جب تم سب اللہ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، پھر ہر ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا''۔

[سورۂ بقرہ، آیت:۲۸۱]

احکم الحاکمین کے دربار میں سارے اولین اور آخرین جمع ہوں گے، اور وہی حاکم مطلق ہوگا جو خود فیصلہ کرے گا، ہر ایک کا کیا دھرا اس کے سامنے ہوگا، اور ہر صاحب حق کو اس کا حق دیدیا جائے گا، اس لیے مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اس سوال کا جواب بھی ابھی تیار کرلیں، تاکہ قیامت کے روز رسوائی نہ ہو اور ندامت کے آنسو نہ بہانے پڑیں۔

* * *

۲/ذی القعدہ ۱۴۳۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی معاشرے کا نہایت قابل احترام گروہ

اسلامی معاشرے میں مختلف قسم کے لوگ رہتے ہیں، ان میں ایک ایسا مبارک طبقہ بھی رہتا ہے جس کی عزت و تکریم اور احترام و تعظیم ہر ایک کے لیے ضروری ہے، اس طبقے کا اتنا اونچا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے احترام واکرام کو اپنی ذاتِ عالی کے احترام واکرام کے ساتھ بیان فرمایا ہے، یعنی جس نے اس طبقے کا اکرام کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا بھی اکرام کیا اور اس احترام کی وجہ سے وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی نظر میں محترم ہو گا؛ کیوں کہ اس طبقے کا احترام اس نے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر کیا —— یہ ایسا طبقہ ہے جسے عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے، حالاں کہ انسانی معاشرے کے لیے اس کا وجود سراپا خیر و برکت ہے، اگر کسی نے ان کو نظر انداز کیا اور ان کے مرتبے و مقام کو نہیں پہچانا تو نبیِّ اسلام محمد ﷺ نے اس سے اپنی براءت کا اعلان فرمایا ہے۔

سن رسیدہ لوگ

یہ سن رسیدہ اور بزرگوں کا طبقہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگی کا اکثر حصہ گزار لیا ہے اور اس کے سرد گرم، مد و جزر اور اس کے طوفانوں کا مقابلہ کر کے ثابت قدم

رہے، زندگی کے تلخ وشیریں ایام سے نمٹتے ہوے ان کو جھیلتے ہوے صبر وشکر کے ساتھ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے: ان میں بعض تو معلّم اور استاذ تھے جنھوں نے اپنے علم کی روشنی سے ایک نسل کے قلوب کو منور کیا، انھیں تہذیب وثقافت سکھایا اور علم ومعرفت کے ہتھیار سے لیس کیا۔ کچھ ان میں تجارت پیشہ تھے جنھوں نے محنت ومجاہدے کے ساتھ حلال روزی کمائی، دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی مستفید ہوے اور اپنے اہل وعیال کے لیے بھی بہت کچھ چھوڑا۔ بعض بزرگوں کے ہاتھوں کی سختیاں اور ان کے چہروں کی جھریاں یہ بتاتی ہیں کہ وہ زراعت پیشہ تھے، پوری زندگی کاشت کاری میں اور شدید گرمی کی تپش اور سخت سردی میں بلکہ موسم برسات کی موسلادھار بارش میں بھی کھیتوں میں کام کرتے رہے اور قوم ومعاشرے کے لیے اناج وغلہ مہیا کرتے رہے۔

بعض ان میں مؤلف اور قلم کار تھے یا سلیقہ منداور خوش گو شاعر تھے جنہوں نے اپنا علمی اور فکری گراں قدر سرمایہ چھوڑا جس سے مدتوں لوگ نفع اٹھاتے رہیں گے، اسی طرح اپنے ملکوں کی خدمت کرنے والے اور امن وامان قائم رکھنے اور ان کی سرحدوں کی حفاظت میں حصہ لینے والے فوجی اور رجالِ امن، یا انسانیت سے ہم دردی رکھنے والے مخلص سیاست داں — یہ اور اس طرح کے دیگر پیشوں اور مختلف میدانوں میں کام کرنے والے حضرات اپنی ذمے داریاں پوری کرکے جب آخری عمر کو پہنچتے ہیں تو معاشرے میں ان کی قدر ہونی چاہیے، ان کو عزت ووقار کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

زندگی کے تین مراحل

قرآنِ کریم کی سورۃ الروم میں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے تین مراحل ذکر

فرمائے ہیں، پہلا مرحلہ بچپن کا ہے جس میں بچہ نہایت کمزور ہوتا ہے، دوسرا مرحلہ جوانی کا ہے جس میں انسان طاقت ور ہوتا ہے، تیسرا مرحلہ بڑھاپے کا ہے جس میں پھر بچپن کی طرح کمزوری آجاتی ہے، جسم کی ہڈیاں کمزور ہوجاتی ہیں، بال سفید ہوجاتے ہیں اور تمام اعضاء وجوارح آہستہ آہستہ پژمردہ ہوتے جاتے ہیں:

﴿ٱللَّهُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۖ وَهُوَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْقَدِيرُ ﴿٥٤﴾﴾ [الروم: ٥٤]

”اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کمزوری سے کی، پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا فرمائی، پھر طاقت کے بعد (دوبارہ) کمزوری اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور وہی ہے جس کا علم بھی کامل ہے اور قدرت بھی کامل ہے“۔

[سورۂ روم: ۵۴]

امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں یوں فرمایا:

”اللہ تعالیٰ اس آیت میں انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل کو بیان فرمارہے ہیں، چناں چہ انسان کی اصل مٹی ہے، پھر نطفہ بنتا ہے، پھر خون کا لوتھڑا بنتا ہے، پھر گوشت کا لوتھڑا، پھر ہڈیاں بنتی ہیں، اس کے بعد ماں کے پیٹ سے دبلا پتلا کمزور حالت میں پیدا ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھ کر ”صغیر“ چھوٹا بچہ بنتا ہے، پھر تھوڑا بڑا ہوتا ہے جسے ”حَدَث“ کہتے ہیں، اس کے بعد ”مراہق“ ہوتا ہے، مراہقت کے بعد شباب اور جوانی کا مرحلہ آتا ہے، اسی کو ”کمزوری کے بعد طاقت“ کا زمانہ کہا گیا ہے۔ کچھ دنوں تک یہ جوانی باقی رہتی ہے، پھر اس جوانی کو زوال آنا شروع ہوجاتا ہے، چناں چہ اس

کے بعد ''کہولت'' آتی ہے، پھر ''شیخوخت''، اس کے بعد ''ہرم'' یعنی بڑھاپا آجاتا ہے، اسی کو طاقت کے بعد کمزوری سے تعبیر کیا گیا ہے''۔

سن رسیدہ مسلمان کے لیے بشارت

ایمان و اعمال کے ساتھ زندگی گزارنے والے، حقوق اللہ اور حقوق الناس کی ادائیگی کرنے والے جب بچپن اور جوانی کو تجاوز کرکے بڑھاپے کو پہنچتے ہیں اور حالتِ اسلام میں ان کے بال بھی سفید ہوجاتے ہیں تو دنیا میں ہی رسول اکرم ﷺ کی بشارت انھیں تسلی دیتی ہے اور آخرت کے مراحل کے حوالے سے پراُمید بناتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الإِسْلاَمِ كَانَتْ لَهُ نُورًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ».

[رواه الترمذي]

''جو شخص حالت اسلام میں بوڑھا ہوگیا ہو (اس کے بال سفید ہوگئے ہوں) تو یہ سفیدی قیامت کے روز اس کے لیے نور کی شکل میں ہوگی''۔ [ترمذی شریف]

بڑی عمر کے لوگوں کا وجود ہمارے گھروں اور ہمارے معاشرے کے لیے باعثِ خیر و برکت ہے، اس لیے ان کے مقام و مرتبے کو پہچاننا، ان کی عزت کرنا اور ان کا تعاون کرنا ہماری ذمے داری ہے؛ لیکن کچھ بد قسمت ایسے بھی ہیں جو ان بزرگ مردوں اور عورتوں کے وجود کو بوجھ سمجھتے ہیں اور انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ اس طرح کے لوگوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی براءت کا اظہار فرمایا ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيرِنَا».

[الترمذي]

”وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر مہربانی سے پیش نہ آئے اور ہمارے بڑوں کے مقام کو نہ پہچانے“۔[ترمذی شریف]

اسلام میں بڑی عمر کے لوگوں کا بڑا مقام و مرتبہ ہے جسے پہچاننا ضروری ہے، ان کا مقام اس لیے بھی بلند ہے کہ جو ان سے چھوٹے ہیں ان کی بنسبت ان کی نمازوں کی تعداد زیادہ ہے، روزے زیادہ ہیں، اسی طرح دیگر عبادات بھی۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ وقتاً فوقتاً ان کے احترام کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن سہل اور محیصہ اور حویصہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک قتل کے قضیے میں گفتگو کے لیے حاضر ہوے، چناں چہ حضرت عبدالرحمنؓ نے جو ان میں عمر میں چھوٹے تھے گفتگو کا آغاز کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «کبّر» یعنی اپنے سے بڑے کو بولنے دو، پھر وہ خاموش ہو گئے اور محیصہ اور حویصہ نے بات کی“۔[بخاری ومسلم]

اسی طرح کا ایک واقعہ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ذکر کیا کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَرَانِی فِی الْمَنَامِ أَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ، فَجَذَبَنِی رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الآخَرِ، فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الأَصْغَرَ مِنْهُمَا، فَقِيلَ لِی: كَبِّرْ، فَدَفَعْتُهُ إِلَى الأَكْبَرِ». [مسلم]

”میں نے خواب میں اپنے آپ کو مسواک کرتے ہوے دیکھا، پھر دیکھا کہ دو شخص ہیں جو مسواک لینے کے لیے مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں، ان میں سے ایک بڑا تھا دوسرے سے، میں نے مسواک چھوٹے کو دے دی، پھر مجھ سے کہا گیا:

بڑے کو دیں، تو میں نے بڑے کو مسواک دے دی"۔ [مسلم شریف]

صالح تربیت اور بڑوں کا احترام

جن گھروں میں بچپن سے ہی بڑوں کی تعظیم و تکریم سکھائی جاتی ہے، ان کا مقام و مرتبہ سمجھایا جاتا ہے، ان گھروں میں پرورش پانے والے بچے اس صالح تربیت کے نتیجے میں نمونۂ اخلاق بن کر ابھرتے ہیں؛ چناں چہ وہ اپنے بڑوں کو بالخصوص بوڑھوں کو ہمیشہ پیش پیش رکھتے ہیں، جب ساتھ چلتے ہیں تو ان کے پیچھے چلتے ہیں، کسی مقام پر پہنچتے ہیں تو داخل ہونے میں انھیں آگے رکھتے ہیں، اسی طرح نکلتے وقت ان کو مقدم رکھتے ہیں، کھانے پینے میں انھیں سے آغاز کراتے ہیں، کسی خاص جگہ گفتگو کے لیے انھیں کو متکلّم بناتے ہیں۔

امام مروزیؒ کہتے ہیں کہ "ابو عبد اللہ (امام احمد بن حنبلؒ) عمر رسیدہ لوگوں کی بہت زیادہ عزت و تکریم کرنے والوں میں تھے، ایک بار ابو ہمام اپنے خچر پہ سوار ہو کر تشریف لائے تو ابو عبد اللہ نے ان کے رکاب (پائے دان) کو پکڑے رکھا تاکہ وہ آسانی سے اتر سکیں، کہتے ہیں کہ میں نے انھیں اسی طرح ان لوگوں کے ساتھ کرتے ہوئے دیکھا جو عمر میں ان سے بڑے ہوتے تھے"۔

عمر رسیدگی کے مثبت پہلو

جو لوگ زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر آخری عمر کو پہنچ جاتے ہیں، انھیں زندگی کے وسیع تجربات کی وجہ سے رائے کی درستگی، عقل کی پختگی اور فکر و نظر میں ایسی دور رسی

حاصل ہوجاتی ہے جو کم عمروں کو حاصل نہیں ہوتی، اس لیے پُرانے عرب حضرات نے بوڑھوں کی عقلوں کو بہت سراہا ہے، کسی نے کہا ہے:

«المشايخ أشجار الوقار، ومنابع الأخبار، لا يطيش لهم سهم، ولا يسقط لهم وهم، فإن فقدوا ذكاء الطبع، فقد مرّت على عيونهم وجوه العبر...»

”بزرگ حضرات، عزت و وقار کے درخت اور معلومات کے سرچشمے ہیں، نہ ان کا کوئی نشانہ چوک کرتا ہے نہ ہی وہ اوہام کے شکار ہوتے ہیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے اگرچہ ان کی فطری ذہانت میں کمی آجاتی ہے؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ (ان کی نگاہیں بہت وسیع ہوتی ہیں) ان کی نگاہوں کے سامنے باعثِ عبرت و نصیحت واقعات گزر چکے ہوتے ہیں“ (جن کی وجہ سے وسیع تجربات کے حامل ہوتے ہیں)۔

حکیمانہ اقوال میں مذکور ہے:

«من طال عمره، نقصت قوة بدنه، وزادت قوةُ عقله».

”یعنی جو شخص سن رسیدہ ہوجاتا ہے، اس کی جسمانی طاقت کمزور ہوجاتی ہے اور عقلی قوت بڑھ جاتی ہے“۔

مزید کہا گیا ہے:

”جاہل و نادان شخص کو بھی زمانہ ادب سکھا دیتا ہے“۔

ایک حکیم کا قول ہے:

«كفى بالتجارب تأديباً، وبتقلب الأيام عظة»

”تجربات، ادب سکھانے اور گردشِ ایام عبرت ونصیحت سکھانے کے لیے کافی ہیں“۔

دوسرے دانشمند شخص نے کہا:

”تجربہ، عقل وخرد کا آئینہ ہوتا ہے“۔

ایک شاعر نے کہا:

ألم تـر أن العقـل زيـن لأهلـه * ولكن تمام العقل طول التجارب

”آپ نے دیکھا نہیں کہ عقل مند انسان کے لیے عقل دراصل زینت ہوتی ہے؛ لیکن (یہ بھی حقیقت ہے کہ) عقل کی تکمیل لمبے تجربات کی وجہ سے ہوتی ہے“۔

تاہم یہ فکر ونظر کی وسعت، اصابتِ رائے اور عقل وخرد کی پختگی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک حافظہ کام کرتا رہے اور انسان کا ذہن آفت وخلل سے محفوظ رہے؛ لیکن اگر خدانخواستہ درازیٔ عمر کی وجہ سے عقل اپنا کام چھوڑدے اور حافظہ بھی متأثر ہوجائے تو مذکورہ بالا اوصاف سے وہ محروم ہوجائے گا، البتہ اس کا احترام واکرام اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ اس کے احترام واکرام کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کی عمر اسلام کی حالت میں بڑی ہوئی ہے، چناں چہ رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللهِ إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ، وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَيْرِ الْغَالِي فِيهِ وَالْجَافِي عَنْهُ، وَإِكْرَامَ ذِي السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ». [أبوداؤد]

”یقینا بوڑھے مسلمان کی عزت وتکریم کرنا اور صاحب قرآن کی عزت کرنا جو

قرآن میں غلو کرتا ہو نہ کوتاہی و تقصیر اور منصف حاکم کی عزت کرنا، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عزت و تکریم کا حصہ ہے"۔[ابوداؤد شریف]

درازئ عمر اور حسنِ عمل کی فضیلت

ایک مومن کو اگر عمرِ دراز ملتی ہے تو وہ اس کے لیے باعث خیر ہی ہوتی ہے؛ کیونکہ جوں جوں اس کی عمر بڑھے گی اس کی نیکیوں کا بیلنس بھی بڑھتا جائے گا اور اسے قربِ الٰہی میں ترقی بھی ملتی جائے گی۔ ایک اعرابی صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

«يَا رَسُولَ الله، مَنْ خَيْرُ النَّاسِ؟» "اے اللہ کے رسول! لوگوں میں سب سے بہتر شخص کون ہے؟"۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ طَالَ عُمُرُهُ، وَحَسُنَ عَمَلُهُ» [الترمذي] "جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو"۔[ترمذی شریف]

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کہتے ہیں کہ دو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوے اور اسلام قبول کر لیا، ان میں سے ایک صاحب دوسرے کی بنسبت زیادہ مجاہدہ کرتے تھے، (یعنی انہیں عبادات اور جہاد کا زیادہ شوق تھا) چناں چہ یہ مجاہدے والے صحابی ایک غزوے میں شریک ہوے اور شہید ہوگئے، پھر دوسرے ان کے ساتھی ایک سال تک حیات رہے، پھر ان کی بھی وفات ہوگئی، حضرت طلحہؓ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ان دونوں کے ساتھ جنت کے دروازے پہ کھڑا ہوں، پھر جنت کے اندر سے کوئی آیا

اور ایک سال کے بعد وفات پانے والے کو جنت میں داخلے کی اجازت دے دی، پھر دوبارہ آکر شہید کو داخلے کی اجازت دے دی، پھر وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ واپس جائیں ابھی آپ کا وقت نہیں آیا ہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت طلحہؓ تعجب کے ساتھ لوگوں کو اپنا خواب بیان کرنے لگے، آخر کار یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی، تو آپؐ نے فرمایا: تمہیں تعجب کس بات سے ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ صاحب محنتی بھی زیادہ تھے اور اللہ کے راستے میں شہید بھی ہوے حالاں کہ دوسرے صاحب جنت میں ان سے پہلے داخل ہوے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ ان کے بعد ایک سال تک زندہ نہیں رہے؟ انھوں نے عرض کیا: جی زندہ رہے، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: اور انھوں نے رمضان کا مہینہ نہیں پایا اور روزے نہیں رکھے، عرض کیا: جی رکھے، پھر فرمایا: انھوں نے ایک سال میں اتنی نمازیں نہیں پڑھیں اور اتنے سجدے نہیں کیے؟ انھوں نے جواب میں آپؐ کی تصدیق کی؛ چناں چہ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر تو ان دونوں کے درمیان زمین وآسمان سے زیادہ کا فاصلہ ہو گیا۔ [مسند احمد وابن ماجہ]

بڑھاپا تادیر باقی رہنے کی آرزو

چوں کہ مومن کی درازیٔ عمر اس کی نیکیوں میں اضافہ کرتی رہتی ہے، اس لیے ہمارے اسلاف درازیٔ عمر کو پسند کرتے تھے؛ چناں چہ ایک بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو موت پیاری ہے؟ تو فرمایا: نہیں۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: جوانی اور اس کی آفتیں اور شرارتیں جاتی رہیں، بڑھاپا آگیا اور اس کی بھلائیاں بھی آگئیں، اس لیے اب تو جب کھڑا ہوتا ہوں تو بسم اللہ کہتا ہوں، جب بیٹھتا تو الحمد للہ کہتا ہوں، لہٰذا میری

خواہش ہے کہ یہ نعمت باقی رہے۔

ایک بزرگ سے کہا گیا کہ اب آپ کو جینے کی خواہش کس لیے رہ گئی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اپنے گناہوں پر آنسو بہانے کے لیے۔

موت کی وجہ سے چوں کہ نیک اعمال کرنے کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اس لیے بعض اسلاف کی جب موت آئی تو اس غم کی وجہ سے رو پڑے، ان ہی میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی ہیں، چناں چہ جب ان سے رونے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"میں موت کے خوف سے نہیں رو رہا ہوں؛ بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ گرمی کی شدت میں روزے، ٹھنڈک کے موسم میں قیام اللیل اور علمائے کرام کی مجلسوں میں حاضری سے اب محروم ہوجاؤں گا"۔ [کتاب الزہد للامام احمد بن حنبلؒ]

اگر اطاعتِ الٰہی میں بڑھاپے کی گھڑیاں گزریں اور قربِ الٰہی میں ترقی ہو، تو کیا ہی حسین بڑھاپا ہے، اس بڑھاپے کے لمحات بھی کتنے قیمتی لمحات ہیں، ایسے بزرگوں کو اپنا بڑھاپا بوجھ نہیں معلوم ہوتا، نہ ہی وہ زندگی سے اُکتاتے ہیں؛ بلکہ ہر لمحے کو یادِ الٰہی میں گزار کر ذخیرۂ آخرت بناتے ہیں۔

اس عظیم نعمت کے حصول کے لیے اس دعا کا بھی اہتمام کرنا چاہیے جو رسول اکرم ﷺ سے منقول ہے:

«اللَّهُمَّ اجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِي فِي كُلِّ خَيْرٍ، وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِي مِنْ كُلِّ شَرٍّ». [صحيح مسلم]

"اے اللہ! میری زندگی کو ہر خیر میں اضافے کا ذریعہ بنادے اور موت کو ہر شر سے راحت کا ذریعہ بنادے"۔ [مسلم شریف]

بد ترین پیرانہ سالی سے پناہ کی دعا

پیرانہ سالی اور سن رسیدگی سے متعلق اوپر جو کچھ ذکر کیا گیا وہ سب اپنی جگہ صحیح ہے؛ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بڑھاپے کی کچھ آفتیں اور مصیبتیں بھی ہیں جو نہایت الم ناک ہوتی ہیں، مثال کے طور پر قوت حافظہ کا بالکل ختم ہو جانا، یا ذہنی توازن کھو بیٹھنا اور اول فول بکنا، یا اتنا لاغر اور کمزور ہو جانا کہ اپنی انسانی ضروریات میں دوسروں کا محتاج بن جانا وغیرہ۔

کتنی خوب صورت ہے ہماری شریعت، کتنا حسین ہے ہمارا دین، زندگی کے کسی شعبے کو تشنہ نہیں چھوڑا، لہٰذا یہاں بھی رہنمائی کی۔

رسول اللہ ﷺ کی مخصوص دعاؤں میں ایک دعا بد ترین پیرانہ سالی سے اللہ کی پناہ کی بھی تھی۔ اور یہ دعا حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کو بھی سکھاتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں یہ دعا ذکر کی ہے جس میں چند چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے، منجملہ ان کے یہ ہے:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُرَدَّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ ... »

"اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں رذیل ترین بڑھاپے کو پہنچنے سے"۔

[صحیح بخاری]

مذکورہ بالا دعا کی قبولیت کے دو واقعے

اس دعا کے حوالے سے چشم دید دو واقعے ایسے ہیں جنھیں ذکر کرنا مناسب معلوم

ہوتا ہے:

(۱) میرے محارم میں ایک خاتون نہایت عبادت گزار، تہجد کی پابند، بلکہ دیگر نوافل کی بھی پابند اور خوش اوقات تھیں، ان کی مخصوص دعاؤں میں ایک دعا ہمیشہ یہ بھی رہتی تھی کہ یا اللہ! مجھے چلتے پھرتے اٹھائیے گا، کسی کا محتاج نہ بنائیے گا، گویا کہ اپنی زبان میں ارذلِ عمر سے پناہ مانگتی تھیں، چناں چہ انھوں نے اللہ کی طرف سے تقریبًا ۹۰ سال کی عمر پائی، زندگی کے آخری دن تک فرض نمازوں کے ساتھ نوافل کا اہتمام کیا، آخری شب میں تہجد کی نماز بھی عادت کے مطابق ادا کی، پھر فجر بھی پڑھی، فجر کے بعد سینے میں تکلیف شروع ہوئی اور چند گھنٹوں کے اندر اپنے خالق ومالک سے جاملیں - رحمہا اللہ -۔

(۲) دوسرا قصہ اپنی والدہ ماجدہ کا ہے، بڑی خودداری کی زندگی گزاری، ان کی یہ تمنا تھی کہ اسی خودداری کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں، انسانی ضروریات کی تکمیل میں کسی کی محتاج نہ ہوں، اس کے لیے دعا بھی فرماتی تھیں، چناں چہ انھوں نے ستر سال سے زیادہ عمر پائی، زندگی کے آخری لمحات تک ہوش وحواس بالکل صحیح رہے، نماز اور قرآنِ پاک کی تلاوت کا اہتمام رہا، وفات سے تقریبًا ایک گھنٹہ قبل تک ہم سے مسکرا کے باتیں کرتی رہیں اور سکرات کی تھوڑی تکلیف کے بعد ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگئیں - رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ -۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کی قدر کرنے اور ان کے مقام ومرتبے کو پہچاننے کی توفیق بخشیں، پیرانہ سالی کی آفتوں سے محفوظ رکھیں اور اپنے اپنے وقت پہ اکملِ ایمان پہ خاتمہ نصیب فرمائیں۔

* * *

۲۱/ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تنگ دستی اور مال داری ——— شریعت کی نظر میں

اس دنیا کا ہر انسان امتحان کے دور سے گزر رہا ہے، اس دنیا کو ”دارالامتحان“ کہا گیا ہے، ہر ایک کی آزمائش کا انداز بھی مختلف ہے، اللہ تعالیٰ کسی کو خوب مال دار بنا کر آزماتے ہیں اور کسی کو مال سے محروم کرکے آزماتے ہیں، دونوں صورتوں میں اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ سورۃ الفجر میں ان دونوں حالتوں کو ابتلاء اور آزمائش سے تعبیر کیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص فقیر و تنگ دست ہے، تو وہ اپنے امتحان میں کام یاب ہوکر اپنے رب کی رضا حاصل کرسکتا ہے، اسی طرح اگر کوئی صاحبِ ثروت ہے تو وہ بھی امتحان میں کام یابی حاصل کرکے اپنے رب کی رضا کا مستحق ہوسکتا ہے ——— تنگ دستی کے بھی کچھ آداب ہیں اور مال داری کے بھی، ان دونوں کے آداب کی رعایت کی جائے تو دونوں نعمت ثابت ہوسکتی ہیں؛ لیکن اگر ان کے آداب کی رعایت نہ کی جائے اور ان حالتوں میں شرعی حدود کی پابندی نہ کی جائے تو دونوں صورتیں مصیبت بن سکتی ہیں اور انسان کی ناکامی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں۔

تنگ دستی ——— شریعت کی نظر میں

بنیادی طور پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تنگی دستی اور فقر و تہی دامنی کی اسلامی شریعت

نے حوصلہ افزائی نہیں کی ہے؛ بلکہ اس کے خاتمے کے لیے مختلف قسم کے اصول وآداب اور وسائل واسباب بتائے ہیں تاکہ اس سے خلاصی حاصل ہوسکے، تاہم تنگ دستی ہمیشہ مذموم نہیں ہوتی، اسی طرح ہمیشہ محمود اور قابل ستائش بھی نہیں ہوتی۔

اگر تنگ دستی کی وجہ سے کسی بندے کے اندر تواضع وانکساری پیدا ہوتی ہے، دعاؤں میں گریہ وزاری پیدا ہوتی ہے، اس کے صبر وثبات قدمی میں اضافہ ہوتا ہے، اسے عبادات کی لذت وحلاوت ملتی ہے تو بلا شبہ یہ حالت اس کے حق میں نفع بخش اور مفید ہے، کیوں کہ یہ دیگر مصائب کی طرح ایک مصیبت ہے جس میں وہ مبتلا ہوا اور صبر وتحمل کے ساتھ اسے جھیل کر بے حساب اجر کا مستحق ہوا۔

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾﴾ [الزمر: ١٠]

”جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں ان کا ثواب بے حساب دیا جاتا ہے“۔

[سورۃ الزمر:۱۰]

لیکن اگر تنگ دستی اور فقر وفاقہ کی وجہ سے ایمان متأثر ہو، یقین کمزور ہو، یا وہ کفرانِ نعمت کا ذریعہ بن جائے یا ذلتِ نفس کا باعث بنے، یا اس کی وجہ سے بندہ گھٹیا اور برے کاموں میں مبتلا ہوجائے، یا جرائم کا ارتکاب کرے تو یقینا یہ مذموم ہے، کیوں کہ یہ تنگ دستی خدانخواستہ اس کے لیے ایمان سوز ثابت ہوسکتی ہے۔ اسی لیے رسول اکرم ﷺ فرماتے تھے:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ، وَعَذَابِ الْقَبْرِ»

[رواه أحمد والنسائي]

”اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں کفر، تنگ دستی اور عذابِ قبر سے“۔

[احمد ونسائی]

ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فقر وفاقے سے پناہ مانگنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

«تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنَ الْفَقْرِ وَالذِّلَّةِ، وَأَنْ تَظْلِمَ أَوْ تُظْلَمَ»

[أحمد النسائي]

''تم اللہ کی پناہ مانگو تنگ دستی سے، قلت سے، ذلّت سے اور اس سے کہ تم کسی پر ظلم کرو یا تم پر کوئی ظلم کرے''۔ [احمد ونسائی]

حضور ﷺ کا کسی چیز سے اللہ کی پناہ مانگنا اور اس کی تعلیم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ شریعت کی نگاہ میں وہ پسندیدہ نہیں ہے۔

تنگیٔ معاش اور تسکینِ قلب

اگر کوئی شخص بلائے فقر و تنگ دستی کا شکار ہو جائے تو جس طرح دیگر مصائب کے سلسلے میں اسلام نے اس کی رہنمائی کی ہے، اسی طرح اس مصیبت میں بھی اسے ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے، مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے تمام تر جائز وسائل کو اختیار کرے، اس کے باوجود اگر اس سے خلاصی نہ مل سکے تو اسی کو قضا وقدر کا فیصلہ سمجھ کر صبر کرے، صبر پر اجر کی قوی امید رکھے، کیوں کہ اللہ کی رضا کے لیے اگر کوئی بندہ صبر کرتا ہے تو اسے بے حساب اجر ملتا ہے، جس طرح ہر آزمائش میں صبر اور ثابت قدمی مطلوب ہے اسی طرح اس آفت تنگ دستی میں بھی مطلوب ہے۔

تنگ دست شخص کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ تنگ دستی کی بلاء میں گرفتار ہے تو اسی طرح مال دار بھی مال داری کی آزمائش میں گھرا ہوا ہے، بلکہ تنگ دستی کی آزمائش

آسان ہے بہ نسبت مال داری کی آزمائش سے۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فَوَاللهِ لاَ الفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ، وَلَكِنْ أَخَشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ».

[صحيح البخاري]

”پس خدا کی قسم، میں تمہارے بارے میں تنگ دستی سے نہیں ڈرتا، لیکن مجھے اندیشہ اس کا ہے کہ تم پر دنیا کے دروازے اس طرح کھول دیے جائیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کھول دیے گئے تھے، پھر تم اسی طرح اس کی دوڑ میں لگ جاؤ جس طرح وہ لگ گئے تھے، پھر وہ تمہیں اسی طرح تباہ کردے جس طرح انہیں تباہ کردیا“۔

[بخاری شریف]

لہٰذا مال دار کی آزمائش بھی تنگ دستی سے کم نہیں، بلکہ اس سے سخت ہے، اس لیے رنجیدہ اور غم زدہ نہ ہوں، بلکہ صبر سے کام لیں اور دنیاوی امور میں اپنے آپ سے کم تر لوگوں پر نظر رکھیں، صحت وعافیت سے محروم لوگوں کو دیکھیں، بہت ممکن ہے کہ آپ سے زیادہ تنگ دست یا مصیبت زدہ لوگ نظر آئیں، انہیں دیکھ کر اپنی حالت پر اللہ کا شکر ادا کریں اور یوں کہیں:

«اللهُمَّ مَا أَصْبَحَ وَأَمْسَى بِي مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيكَ لَكَ، فَلَكَ الْحَمْدُ، وَلَكَ الشُّكْرُ».

تنگ دستی کے اسباب وعوامل

(۱) فقیری اور تہی دستی کے متعدّد اسباب ہوسکتے ہیں، جن میں سے ایک سستی اور کاہلی ہے۔ آرام پسندی اور تن آسانی کے ساتھ نہ مادی ترقی ممکن ہے نہ ہی معنوی ترقی، مثل مشہور ہے: «حَرِّكْ يَدَيْكَ تُرْزَقْ» یعنی ہاتھوں کو حرکت میں لاؤ تو روزی میسر ہوگی، اسی طرح ایک مشہور جملہ ہے: «فِيْ الْحَرَكةِ بَرَكة» یعنی حرکت میں برکت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر یہ صلاحیت ودیعت فرمائی ہے کہ وہ محنت ومشقت کے ذریعہ عزت کی روٹی حاصل کرسکے اور معاشرے میں باعزت زندگی گزار سکے، کسی دوسرے پر بوجھ بننے کے بہ جائے دوسروں کا بوجھ خود اٹھائے، وہ اس حدیث پر عمل کرے۔ «اليَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيدِ السُّفْلى» "اوپر والا ہاتھ بہتر ہوتا ہے نیچے والے ہاتھ سے "یعنی عطا کرنے والا ہاتھ، لینے والے سے بہتر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سست اور کاہل انسان عطا کرنے کے بہ جائے "تماشائے اہلِ کرم" ہی دیکھتا رہے گا، اسی لیے رسول اکرم ﷺ عاجزی اور سستی سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔

(۲) بعض دفعہ گناہوں کی وجہ سے انسان تنگیٔ رزق کا شکار ہوجاتا ہے، کیونکہ فقر وتنگ دستی بھی مصائب کی ایک قسم ہے جس کے پسِ پردہ انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے واضح طور پر کہا:

﴿ وَمَآ أَصَٰبَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ أَيۡدِيكُمۡ وَيَعۡفُواْ عَن كَثِيرٍ ﴿٣٠﴾ ﴾ [الشورى: ٣٠]

"اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کیے ہوے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے، اور بہت سے کاموں سے تو وہ درگزر ہی کر دیتا ہے"۔

[سورۃ الشوری:۳۰]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"نیکی کی وجہ سے انسان کے چہرے پہ چمک ہوتی ہے، دل میں نور پیدا ہوتا ہے، جسم میں قوت پیدا ہوتی ہے، روزی میں کشادگی ہوتی ہے اور مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ اور برائی کی وجہ سے اس کے چہرے پہ ایک قسم کی سیاہی (بے رونقی) ہوتی ہے، دل میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، جسم میں ضعف پیدا ہوتا ہے، روزی میں کمی اور بے برکتی آتی ہے اور مخلوق کے دلوں میں اس کے تئیں نفرت ڈال دی جاتی ہے"۔ [روضۃ المحبین لابن قیمؒ]

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ».

[رواه النسائي وابن ماجه وأحمد]

"بلا شبہ انسان گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے"

[نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد]

لہٰذا اگر کوئی شخص اس مصیبت (تنگ دستی) میں مبتلا ہوا ہے تو منجملہ دیگر امور کے اس باب میں بھی اپنا جائزہ لے کہ اس کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ کیسا ہے، تقویٰ اور عفت و پاک دامنی اور فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کی ادائیگی کے سلسلے میں، اسی طرح حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی اپنا محاسبہ کرے۔ اگر کوئی کوتاہی ہو رہی ہو تو صدق دل

سے توبہ کرے اور کثرت سے استغفار کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَزِمَ الِاسْتِغْفَارَ، جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجًا، وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ».

[رواه أبو داؤد]

"جو شخص استغفار کا التزام کرے گا (یعنی کثرت سے کرے گا) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کی راہ اور ہر غم سے نجات کا سامان پیدا فرمادیں گے اور ایسی جگہ سے رزق مہیا فرمائیں گے، جس کا اسے وہم وگمان بھی نہ ہو گا"۔[ابوداؤد]

(۳) مال کی قلت کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی بندے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے پاس زیادہ مال آئے گا تو اترانے لگے گا، سرکشی اور نافرمانی پر اتر جائے گا، تو اللہ پاک اس کی حفاظت کے لیے اور اس کے ایمان واعمال کو بچانے کے لیے بعض دفعہ اسے زیادہ عطا نہیں فرماتے؛ کیوں کہ مال کی کثرت کی وجہ سے وہ کبر وغرور میں مبتلا ہو کر اپنی آخرت برباد کر سکتا تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ كَلَّآ إِنَّ ٱلْإِنسَٰنَ لَيَطْغَىٰٓ ﴿٦﴾ أَن رَّءَاهُ ٱسْتَغْنَىٰٓ ﴿٧﴾ ﴾

[العلق: ٦ – ٧]

"بے شک انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے؛ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز (تونگر) سمجھتا ہے"۔[سورۃ العلق:٦-٧]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"بندہ کبھی کسی تجارت یا امارت کا یعنی حکمرانی کا ارادہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ

اسے حاصل بھی ہونے لگتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر عنایت فرماتے ہیں اور فرشتوں سے کہتے ہیں: اسے اس بندے سے دور رکھو؛ کیوں کہ اگر اسے یہ میسر آجائے تو (گناہوں اور نافرمانیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے) اسے میں جہنم میں داخل کردوں گا، لہٰذا وہ اس سے پھیر دیتے ہیں، پھر وہ بندہ مایوس ہوکر کہنے لگتا ہے: فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، فلاں نے مجھے چکّر میں ڈال دیا، حالاں کہ در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے"۔[الصواعق المرسلۃ، لابن قیمؒ]

(۴) تنگ دستی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی بندے کے لیے آخرت میں کوئی مرتبہ اور مقام متعیّن ہوتا ہے، جسے وہ اپنی نیکی کی وجہ سے حاصل نہیں کرپاتا تو پھر مالی، جسمانی یا عائلی مصائب میں مبتلا کردیا جاتا ہے جن پر صبر کرکے وہ اس مرتبے کو پالیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ، لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ ابْتَلَاهُ اللهُ فِي جَسَدِهِ، أَوْ فِي مَالِهِ، أَوْ فِي وَلَدِهِ». [أبو داؤد]

"بندے کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مرتبہ مقدر ہوتا ہے جسے وہ اپنے عمل کے ذریعہ حاصل نہیں کرپاتا تو اللہ تعالیٰ اسے جسمانی یا مالی یا اولاد کی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں تاکہ اس مرتبے کو پالے"۔[ابوداؤد]

چناں چہ بہت سارے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ یہی ہوا، ان کا امتحان نہایت سخت ہوا، ہر طرح کے مصائب میں مبتلا ہوئے، پھر ان پہ صبر کیا جس کی وجہ سے دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی رضامندی کا اعلان فرمادیا اور متعدّد صحابۂ کرامؓ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت اپنی زبانِ مبارک سے سنائی ـــــ عجب نہیں کہ اکثر اہل علم اور

اہل اللہ کی دنیاوی خستہ حالی اور تنگ دستی اسی نوع کی ہو، پھر اس پر صبر کی وجہ سے انھیں جو مقام ومرتبہ ملنا ہوگا وہ اللہ ہی کے علم میں ہے۔

تنگ دستی کا علاج

(۱) تنگ دستی اور فقیری کا سب سے اہم علاج اور سب سے پہلا حل یہ ہے کہ آرام پسندی چھوڑ کر محنت ومشقت کی عادت ڈالی جائے اور حلال ذرائع سے روزی حاصل کی جائے، اسی وجہ سے خود رسول اکرم ﷺ نے بھی تجارت کی اور صحابۂ کرام کو بھی حلال روزی کمانے کے لیے جدوجہد کا عادی بنایا، بعض صحابہ کو طریقۂ کار سکھا کر سرگرمِ عمل بنایا —— چناں چہ ایک صحابی ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوے اور کچھ سوال کیا، تو آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے گھر میں کوئی چیز ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپؐ نے فرمایا: انہیں لاؤ، جب وہ لے آئے تو آپؐ نے دیگر صحابۂ کرام کے سامنے اسے نیلام کیا، ایک صحابی نے ایک درہم میں خریدنا چاہا، آپؐ نے فرمایا: اس سے زیادہ کوئی دے گا؟ تو ایک دوسرے صحابی نے دو درہم میں اسے خریدلیا۔ آپؐ نے ان صحابی کو وہ دو درہم دے دیے اور فرمایا:

> ”ایک درہم سے خور ونوش کا سامان خرید کر گھر والوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم سے کلہاڑی خرید کر لاؤ، چناں چہ وہ کلہاڑی لے کر آئے تو آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس میں لکڑی کا دستہ باندھا اور ان سے فرمایا کہ جاؤ اور اس سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرو، پندرہ روز تک اپنی شکل مجھے نہ دکھلانا، چناں چہ وہ چلے گئے اور حضورؐ کے ارشاد کے مطابق کام کرتے رہے، جب واپس آئے تو دس درہم کما چکے

تھے، ان سے کپڑے بھی خریدے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی خریدیں۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا: یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ...‘‘۔[ابوداؤد وابن ماجہ]

دوسرے صحابۂ کرام نے بھی حضور ﷺ سے محنت و جفاکشی اور استغناء و خودداری سیکھی تھی، اسی لیے جب حضرت سعد بن الربیع الانصاریؓ نے حضرت عبد الرحمن بن عوف المہاجری کی خدمت میں اپنا مال پیش کیا تو انھوں نے دعا دیتے ہوے کہا کہ بھائی مجھے تو بازار کا راستہ دکھا دو —— چناں چہ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے اللہ پر توکل کر کے تجارت اور کاروبار شروع کیا، نہایت لگن اور اخلاص و امانت داری کے ساتھ کاروبار کرتے رہے یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے امیر ترین اور خوش حال ترین صحابۂ کرام میں ان کا شمار ہونے لگا، پھر کیا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے راہِ خدا میں اپنا مال لٹاتے رہے، یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے جنت کی بشارت کی سعادت بھی انھیں اسی دنیا میں مل گئی۔

قرآنِ کریم کی متعدّد آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ’’عمل‘‘ کے اوپر ابھارا ہے، زمین میں پھیل کر رزق کی جستجو کرنے کا حکم دیا ہے، سورۃ الملک میں بھی یہ حکم موجود ہے، اسی طرح سورۃ الجمعہ میں بھی یہ حکم دیا ہے کہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد اپنی روزی کی تلاش میں لگ جاؤ:

﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِى ٱلْأَرْضِ وَٱبْتَغُواْ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾ ﴾ [الجمعة: ١٠]

’’پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو‘‘۔[الجمعہ:۱۰]

لہٰذا فاقہ مستی، تنگ دستی اور فقیری کا سب سے اہم اور بنیادی علاج یہ ہے کہ تن آسانی کو تج کر جفاکشی اور محنت شعاری کو اپنایا جائے اور خود داری کے ساتھ زندگی گزارنے

کے لیے حلال روزی کمائی جائے۔

(۲) اگر استطاعت ہو تو بار بار حج و عمرہ کیا جائے، اس سے بھی تنگ دستی دور ہوتی ہے جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«تَابِعُوا بَيْنَ الحَجِّ وَالعُمْرَةِ، فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الكِيرُ خَبَثَ الحَدِيدِ، وَالذَّهَبِ، وَالفِضَّةِ».

[رواه الترمذي والنسائي وأحمد]

”حج اور عمرہ ایک کے بعد دوسرا ادا کرتے رہو، کیوں کہ یہ دونوں تنگ دستی اور گناہ کو اس طرح مٹادیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل کو مٹادیتی ہے...“۔[ترمذی، نسائی، احمد]

(۳) ایمان کے ساتھ تقویٰ شعاری فقر و فاقے کو مٹاتی ہے، برکتوں کے دہانے کھولتی ہے، قرآن کریم نے کہا:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ ٱلْقُرَىٰٓ ءَامَنُوا۟ وَٱتَّقَوْا۟ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَـٰتٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ وَلَـٰكِن كَذَّبُوا۟ فَأَخَذْنَـٰهُم بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾﴾ [الأعراف: ٩٦]

”اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین دونوں طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے؛ لیکن انھوں نے (حق) کو جھٹلایا، اس لیے ان کی مسلسل بدعملی کی پاداش میں ہم نے ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا“۔[سورۃ الاعراف:۹۶]

(۴) ایک علاج یہ ہے کہ اپنی فقیری اور تنگ حالی کی شکایت کسی انسان سے نہ کرے، نہ ہی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے؛ بلکہ اپنی حاجت صرف حاجت روا اور مشکل کشا حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ میں پیش کرے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ نَزَلَتْ بِهِ فَاقَةٌ، فَأَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتُهُ، وَمَنْ نَزَلَتْ بِهِ فَاقَةٌ فَأَنْزَلَهَا بِاللهِ، فَيُوشِكُ اللهُ لَهُ بِرِزْقٍ عَاجِلٍ أَوْ آجِلٍ». [رواه الترمذي]

”جو شخص فاقے کا شکار ہو، پھر وہ اسے لوگوں کے سامنے رکھے تو اس کا فاقہ ختم نہیں ہوگا، اور جو شخص فاقے کا شکار ہو، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیر یا سویر روزی عطا فرمادے“۔[ترمذی]

(۵) محنت وجاں فشانی کے ساتھ ساتھ نہایت اہم امر یہ ہے کہ دعاؤں کا اہتمام کرے؛کیوں کہ دنیا اور آخرت کی خیر وبرکت کے تمام خزانے اللہ ہی کے دست قدرت میں ہیں؛اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَسْـَٔلُوا۟ ٱللَّهَ مِن فَضْلِهِۦٓ﴾ [النساء: ٣٢]

”اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو“۔[سورۃ النساء:۳۲]

اسی طرح اس دعا کا بھی اہتمام کرے جو پہلے گزر چکی ہے۔

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ، وَعَذَابِ الْقَبْرِ».

[رواه أحمد والنسائي]

”اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں کفر، تنگ دستی اور قبر کے عذاب سے“۔

[احمد ونسائی]

مال ودولت کی فراوانی ـــــــ شریعت کی نظر میں

خوش حالی اور مال ودولت کی فراوانی شریعت میں مطلوب ہے، اسی لیے رسولِ

اکرم ﷺ نے اپنے خادم حضرت انسؓ کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

«اللَّهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ، وَوَلَدَهُ ... » [متفق عليه]

”اے اللہ! اسے مال وعیال کی کثرت نصیب فرما“۔[متفق علیہ]

اگر مال ودولت کی فراوانی کوئی بری چیز ہوتی تو حضور اپنے خادم خاص کو اس کی دعا نہ دیتے — البتہ یہ بات ذہن نشیں کرلیں کہ مال ودولت کی فراوانی مطلقاً محمود نہیں ہے، اگر یہ خدانخواستہ انسان کو معاصی، سرکشی اور بداعمالی میں مبتلا کردے، اللہ سے دور کردے، کبر اور دوسروں کی تحقیر وتوہین کا ذریعہ بن جائے تو بلاشبہ یہ مذموم ہے؛ اسی لیے مال داری کو بھی آزمائش اور ابتلاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر بندہ، صاحبِ ثروت ہونے کے باوجود اپنے خدا کو نہ بھولے، احکامِ شریعت کا پابند رہے، مال میں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں، انھیں ادا کرے، اپنے مال سے جنت تک پہنچنے کے لیے پل کی تعمیر کرادے، یعنی کارِ خیر میں کشادہ دلی کے ساتھ خرچ کرے، پابندی سے زکات ادا کرے، نفلی صدقات کے ذریعے محتاجوں اور رشتے داروں کی نگہ داشت کرے، اخلاص کے ساتھ اس طرح خرچ کرے کہ داہنے ہاتھ سے دے تو بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے، تو پھر «نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ» ایسے نیک بندے کے لیے اس کا مال سراپا خیر ہی خیر ہے۔

کار خیر کے بے شمار راستے ہیں، ان میں حصہ لے، ہم دردی اور غم گساری کے جذبات کے ساتھ اپنے مال سے دوسروں کی حاجت روائی کرے، اپنے اہل وعیال پہ خرچ کرے، والدین اگر حیات سے ہوں تو بے دریغ ان پہ خرچ کرے، اعزہ اقارب، ہم سایے اور مساکین کا، بیواؤں اور یتیموں کا خیال رکھے اور اپنا مال اللہ کی مرضی کے مطابق ہی خرچ کرے۔

اگر ایسا کرے گا تو یہ عمل اس کے مال کی بقاء کا ضامن ہوگا؛ بلکہ اس میں مزید اضافے اور برکت کا ذریعہ ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝٧ ﴾ [إبراهيم: ٧]

”اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو، میرا عذاب بڑا سخت ہے“۔[سورۂ ابراہیم:۷]

❋ ❋ ❋

۹/شوال ۱۴۳۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اتحادِ امت

عزت وذلت کے اسباب وعوامل

مسلمان اگر اپنے دین کی تعلیمات وہدایات پر عمل پیرا ہو تو وہ بلاشبہ باعزت ہوگا، اگر وہ اللہ کی رسّی (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھام لے اور رسول اکرم محمد بن عبداللہ ﷺ کی سنتوں کی اتباع کا خوگر بن جائے تو اللہ پاک اسے عزت ورفعت بخشیں گے؛ لیکن اگر وہ خدانخواستہ اپنے دین کی تعلیمات وہدایات سے غافل ہوجائے تو ذلیل ہوگا، اگر اپنے دین وعقیدے کے تقاضوں کو فراموش کرجائے تو ذلت ورسوائی اس کا مقدر بنے گی، اسی طرح اگر اختلاف وانتشار کا شکار ہوجائے اور آپس میں دست وگریباں ہوجائے تب بھی ذلت ورسوائی اور ہزیمت وپس پائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

سارے مسلمان اگر کلمۂ حق پر جمع ہوجائیں تو عزت ورفعت ان کے قدم چومے گی، اگر وہ باطل کے خلاف حق کی آواز پر لبیک کہیں، حق اور اہل حق کی مدد ونصرت کریں، حق سے دل بستہ ہوں اور باطل سے برگشتہ ہوں، مخلوق کی پرواہ کیے بغیر اپنے خالق کی رضا کو اپنا نصب العین بنالیں تو سربلند اور معزز ومکرم رہیں گے؛ لیکن اگر انھوں نے مخلوق کو

راضی کر کے خالق کو ناراض کیا، حق سے نفرت اور باطل سے محبت کی، باطل اور اہلِ باطل کی نصرت و مدد کی اور حق اور اہل حق سے روگردانی بلکہ بغاوت کی تو یقیناً ذلیل ورسوا ہوجائیں گے۔

کلمۂ حق اور اللہ کے تقوے کے زیر سایہ انھیں جمع ہونا ہے، سچے پکے مسلمان بنیں اور فیصلہ کریں کہ جب تک جییں گے، مسلمان بن کر جییں گے، اور جب مریں گے تو مسلمان بن کر مریں گے ـــــ لیکن اسلام پر وہی مرے گا جس نے اسلام کے سایے میں اپنی زندگی گزاری ہوگی، اسلام کے لیے زندہ رہا ہو، اسلام کا فروغ اس کی زندگی کا مقصد رہا ہو، اللہ کے لیے محبت کرتا ہو، اللہ ہی کے لیے عداوت رکھتا ہو، اس کی دوستی اور دشمنی اللہ کی رضا کی خاطر ہو، غیرت مند اور اپنے دین وعقیدے کے ساتھ وفادار ہو، تو اللہ کی توفیق سے اسی سچے دین وعقیدے پر اس کی موت بھی آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "امتِ واحدۃ" قرار دیا ہے

پوری کائنات کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں بسنے والے تمام مسلمان ایک امت ہیں، اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ یہ امتِ واحدۃ بن کر رہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے سب جمع ہوجائیں، اور کیوں نہ ہوں، ان سب کا عقیدہ ایک ہے، شریعت ایک ہے، قبلہ ایک ہے، کتاب ایک ہے، اسوہ اور نمونہ ایک ہے؛ بلکہ ان کے فکر ونظر، احساسات وجذبات اور عرف وعادات میں بھی وحدت اور یکسانیت ہے، لہٰذا ہر طرح سے یہ امت ایک ہے:

﴿إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ

فَٱعۡبُدُونِ ﴿٩٢﴾ [الأنبياء: ٩٢]

''یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو''۔[سورۂ انبیاء:۹۲]

اس امتِ واحدۃ کو کلمۂ واحدہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد پر اکٹھا ہونا پڑے گا، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اسی کلمے پر جیے، اسی پر مرے، اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دے، اسی کے لیے اپنی غیرت وحمیت کا اظہار کرے۔

﴿قُلۡ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾ [الأنعام: ١٦٢]

''آپ کہہ دیں کہ بیشک میری نماز، میری عبادت، اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔[سورۂ انعام:۱۶۲]

ان کی قیادت (Leadership) ایک ہے، اسوہ اور نمونہ بھی ایک ہے، یہ قیادت ہے، سرورِ کائنات رسول اکرم ﷺ کی، آپؐ پوری امتِ اسلامیہ کے قائدِ اعظم ہیں، اور قیامت تک کے لیے ہیں، یہ امت آپؐ کی قیادت کے سوا کسی کی قیادت کو اپنے لیے باعث نجات نہیں سمجھتی۔

اس امت کے افکار ونظریات بھی ایک ہیں اور یہ وہی ہیں جو قرآنِ مقدس اور احادیثِ نبویہ کی واضح تعلیمات کی روشنی میں وجود میں آتے ہیں اور فروغ پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے عادات واطوار میں بھی یکسانیت ہے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور اپنی ضروریات پوری کرنے میں بھی سارے مسلمان ایک ہی شریعت کے تابع ہیں، لہٰذا جب کوئی مسلمان کھاتا یا پیتا ہے تو داہنے ہاتھ سے۔ سونے جاگنے کی

دعاؤں کا اہتمام کرتا ہے، جب اپنے بھائی سے ملتا ہے تو سلام کرتا ہے، کھانے کی ابتدا بسم اللہ سے کرتا ہے، فارغ ہو کر الحمد للہ کہتا ہے؛ بلکہ پوری دعا پڑھتا ہے، اگر کوئی چھینک کر الحمد للہ کہے تو سننے والا یرحمک اللہ کہتا ہے، اسی طرح زندگی کے تمام شعبوں میں تمام مسلمان یکساں برتاؤ کرتے ہیں۔

تفریقِ ملت کے اسباب وعوامل

حقیقت وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی کہ یہ پوری امت ایک ہے، خواہ اس کا تعلق دنیا کے کسی خطے سے ہو؛ لیکن اس کی وحدت "دوسروں" سے دیکھی نہیں جاتی، اس لیے اس کو پاش پاش کرنے کے لیے ہمیشہ کوششیں ہوتی رہی ہیں، ان کوششوں کے متعدّد اغراض ومقاصد ہوتے ہیں، ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ یہ اتحاد واتفاق کی وجہ سے طاقتور ہوجائیں گے، اس لیے ان میں پھوٹ ڈالو تاکہ یہ کمزور ہوجائیں —— ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ طاقتور رہتے ہوے چوں کہ ان کا استحصال آسان نہیں ہوگا اس لیے ان میں اختلاف پیدا کرکے ان کا معاشی یا سیاسی استحصال کیا جائے، الغرض اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے لوگ اس امت کے اتحاد کو توڑ کر ان کو آپس میں ہی ایک دوسرے کے خلاف ابھار کر لڑا دیتے ہیں۔

عہدِ نبوی میں ایک یہودی کی شرارت اور فتنہ انگیزی

نفرت انگیز کوششوں کی ابتدا دراصل رسول اکرم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے عہدِ مبارک میں ہی ہوگئی تھی۔ مدینہ منورہ میں دو قبیلے ایسے تھے جو زمانۂ جاہلیت سے آپس میں دست وگریباں

رہتے تھے اور لڑتے رہتے تھے، ان کے درمیان دشمنی کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں، جب وہ مُشرف باسلام ہوئے تو آپس میں بھائی بھائی بن گئے، سب کے دل مل گئے، اپنے اختلافات کو اللہ کی رضا کے لیے سب نے بھلا دیا اور شیر و شکر ہو گئے — ایک قبیلے کا نا تھا اَوس اور دوسرے کا خَزْرَج — یہ اتحاد اور آپس کا بھائی چارہ یہودیوں کو کیسے بھاتا؟ ایک یہودی جس کا نام شاس بن قیس تھا ایک روز ان کے پاس سے گزرا تو اس سے یہ اخوّت و محبت دیکھی نہ گئی، اس نے دیکھا کہ دو ایسے قبیلے جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے اور عرصہ دراز سے ان کی جنگوں کا سلسلہ تھمتا نہ تھا، یہ کیسے ایک دوسرے کے ہم درد بن گئے، چناں چہ اس نے اپنی خباثت اور مکاری سے دوبارہ انھیں زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کی یاد دلانا شروع کر دیا، اس زمانے کے مقتولین کے ورثہ کو از سرِ نو انتقام پر ابھارنے لگا، قبیلۂ اوس نے فتح یابی کے بعد جو اشعار کہے تھے، پھر قبیلۂ خزرج نے اشعار میں ہی جواب دیا تھا، وہ انھیں یاد دلا کر نفرت کی آگ سلگانے لگا، پھر اس کو ہوا دیتے دیتے بالآخر انھیں اس بات پر آمادہ کر دیا کہ دونوں گروہوں نے اپنے جنگ جوؤں کو ہتھیاروں سے لیس کر کے دوبارہ جنگ کے لیے تیار کر دیا، جب رسول اکرم ﷺ کو اس گھناؤنی سازش کی خبر ملی تو آپ خود تشریف لائے اور ان دونوں قبیلوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

«أ بدعوى الجاهلية وَأَنَا بين أَظهُرِكُمْ» ؟

"کیا میرے ہوتے ہوئے جاہلیت کی باتیں ؟"

پھر آپؐ نے قرآنِ کریم کی آیتوں کی تلاوت فرمائی، چناں چہ وہ سمجھ گئے کہ یہ شیطانی حملہ تھا، نادم ہوئے، آپس میں صلح صفائی کی اور ایک دوسرے سے گلے مل گئے۔

[طبری، والشوکانی فی فتح القدیر]

ایک قبیلے والے دوسرے قبیلے والوں کے خلاف، یا ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کے خلاف، فرقہ واریت یا علاقائیت کی بنیاد پر کھڑے ہوجائیں، یا رنگوں اور نسلوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کی حمایت کرنے لگیں تو یہ حقیقت میں "دعوائے جاہلیت" ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، اسلام نے صرف حق کی بنیاد پر کسی کی حمایت کی اور باطل کی بنیاد پر مخالفت کی تعلیم دی ہے۔

مذکورہ بالا واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۂ آل عمران میں واضح ہدایات نازل فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تُطِيعُوا۟ فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَـٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَـٰنِكُمْ كَـٰفِرِينَ ﴿١٠٠﴾﴾ [آل عمران: ۱۰۰]

"اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لوگے تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تم کو دوبارہ کافر بنا کر چھوڑ دیں گے"۔ [سورۂ آل عمران:۱۰۰]

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم ان یہودیوں کی اختلاف انگیز باتوں کو مان لوگے تو وہ تمہیں اتحاد کے بعد، اختلاف وانتشار میں مبتلا کردیں گے، اس آیت میں اتحاد کو ایمان اور اختلاف کو کفر سے تعبیر کیا۔ آگے فرمایا:

﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُۥ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِٱللَّهِ فَقَدْ هُدِىَ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾﴾

[آل عمران: ۱۰۱]

اور تم کیسے کفر اپناؤ گے جب کہ اللہ کی آیتوں کی تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی ہے، اور اس کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے؟ اور جو شخص اللہ کا سہارا مضبوطی

سے تھام لے، وہ سیدھے راستے تک پہنچا دیا جاتا ہے"۔[آل عمران:۱۰۱]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحدت کا راستہ بتلایا کہ اگر تم متحد ہونا چاہتے ہو تو متقی بن جاؤ، دلوں کی اصلاح کرلو اور اللہ کی رسی اور اس کے دین کو اتنی مضبوطی سے تھام لو کہ زندہ رہو تو اسلام پر اور مرو تو اسلام پر:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسۡلِمُونَ ١٠٢﴾ [آل عمران: ۱۰۲]

"اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے، اور خبردار! تمہیں کسی اور حالت میں موت نہ آئے، بلکہ اسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو"۔[آل عمران:۱۰۲]

اجتماعیت کی بنیاد "حبلُ اللہ"

ایک ایسی چیز کا ہونا ضروری ہے جسے اتحاد کی اساس قرار دیا جائے، کیوں کہ اس کے بغیر اجتماعیت ناممکن ہے، چناں چہ ہمارے پاس وہ شے بغیر کسی تحریف وتبدیل کے اپنی اصلی صورت وشکل میں موجود ہے اور قیامت تک رہے گی، وہ ہے کتاب اللہ، "حبل اللہ" اللہ کی رسی، "الذکر الحکیم"، "الصراط المستقیم"، یہ وہ کتاب ہدایت ہے جو انسانوں کی رہبری کرکے انہیں ان کے خالق ومالک سے ملاتی ہے، جنت کا راستہ دکھاتی ہے، وحدت کا درس دیتی ہے:

﴿ إِنَّ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانَ يَهۡدِي لِلَّتِي هِيَ أَقۡوَمُ وَيُبَشِّرُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ٱلَّذِينَ يَعۡمَلُونَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أَنَّ لَهُمۡ أَجۡرٗا كَبِيرٗا ٩ ﴾ [الإسراء: ۹]

"حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے،

اور جو لوگ ایمان لاکر نیک عمل کرتے ہیں انھیں خوش خبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے“۔ [سورۂ بنی اسرائیل:۹]

اسی ”حبل اللہ“ کو مضبوطی سے تھامنا ہوگا، اسی کو بنیاد بناکر سب کو اکٹھا ہونا پڑے گا، کیوں کہ اگر اس بنیاد اور مرکز سے ہٹ جائیں گے تو پھر انتشار اور افتراق کا شکار ہو جائیں گے۔

﴿ وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْۚ وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءٗ فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ فَأَصۡبَحۡتُم بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنٗا وَكُنتُمۡ عَلَىٰ شَفَا حُفۡرَةٖ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنۡهَاۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمۡ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ ﴿١٠٣﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

”اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، اور اللہ نے تم پر جو انعام کیا ہے اسے یاد رکھو کہ ایک وقت تھا جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ نے تمہیں اس سے نجات عطا فرمائی۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں کھول کھول کر واضح کرتا ہے؛ تاکہ تم راہِ راست پر آجاؤ“۔ [سورۂ آل عمران:۱۰۳]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا عمل بتلایا، جو مسلمانوں کی وحدت ویکتائیت اور ان کے باعزت وجود کا ضامن ہے، باوقار اور باعزت وجود کو ثابت کرنے کے لیے اس عمل کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، وہ یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کا ایک مشن ہو، ایک دعوت ہو، ان کا ایک ابدی اور آفاقی پیغام ہو جس سے انسانیت کو روشناس کرائیں: وہ ہے دعوت الی اللہ، خیر کی دعوت، بھلائی، شرم وحیا، عصمت وعفت، صداقت وامانت اور تقویٰ وپارسائی کی دعوت،

جسے قرآن کریم نے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" سے تعبیر کیا ہے۔ جب مسلمان اس مبارک عمل کو اپنالیں گے تو اس کی وجہ سے باذن اللہ اتحاد پیدا ہوگا اور یہ امت واقعی "امتِ واحدہ" بنے گی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾﴾

[آل عمران: ١٠٤]

"اور تمہارے درمیان ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے، جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں، اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں"۔ [آل عمران:۱۰۴]

اسی سورت میں چند آیتوں کے بعد اللہ پاک نے دوبارہ اسی مضمون کو بیان فرمایا اور اس عظیم عمل کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

خبردار! اختلافات سے بچے رہنا

پھر خدائے پاک نے تمام مسلمانوں کو انتباہ دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ان لوگوں کی طرح اختلاف و انتشار میں مبتلا ہو جائیں جو اہل کتاب تھے اور اس تفرقہ بازی کی وجہ سے "عذابِ عظیم" کے مستحق ہوے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾﴾ [آل عمران: ١٠٥]

"اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن کے پاس کھلے کھلے دلائل آ چکے تھے، اس

کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی اور اختلاف میں پڑ گئے، ایسے لوگوں کو سخت سزا ہوگی"۔[سورۂ آل عمران:١٠٥]

اسی مضمون کو مزید واضح کرنے کے لیے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لاَ تَخْتَلِفُوا، فَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ اخْتَلَفُوا فَهَلَكُوا»

[صحيح البخاري]

"تم آپس میں پھوٹ نہ ڈالنا، کیوں کہ تم سے پہلے کی قوموں نے آپس میں پھوٹ ڈالا اور ہلاک ہوگئے"۔[بخاری شریف]

ہمارا آپسی اختلاف، دشمنوں کے لیے مژدۂ جاں فزا

مسلم دشمن عناصر کو سب سے زیادہ جس چیز سے مسرت ہوتی ہے وہ ہے مسلمانوں کا آپسی اختلاف وانتشار، باہمی جنگ وجدال، قتل وغارت گری وغیرہ، اس کی وجہ سے دشمن کو ہم پر ہنسنے کا، ہمارا مذاق اڑانے کا، ہماری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا اور اپنے تجارتی اور سیاسی استحصال کا موقع فراہم ہوتا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے ہمیں اس بدترین امر سے منع فرمایا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ساری دنیا، اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف متحد ہو چکی ہے، یہاں تک کہ نصاریٰ (عیسائی) جو بیس صدیوں سے یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے کا ذمہ دار قرار دیتے رہے، انہوں نے بھی اپنے اختلافات مسلمانوں کے خلاف متحد ہونے کے لیے ختم کر لیے؛ بلکہ چند سال قبل واٹکن نے باضابطہ تحریری شکل میں یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل سے بری قرار دے دیا۔

لیکن ہم ہیں کہ نہ تو ان کی سازشوں کو سمجھ پاتے ہیں، نہ اپنی پسپائیوں اور ناکامیوں

سے سبق لیتے ہیں، نہ ہی جانی، مالی، معاشی اور سیاسی نقصانات کا ادراک واحساس کر پاتے ہیں؛ حالاں کہ ہمارے ہاتھوں میں واضح ربّانی دستور: کتاب وسنت اپنی صحیح شکل وصورت میں موجود ہے اور ہم اس ابدی اور آفاقی پیامِ انسانیت کے امین ہیں جو ساری دنیا کو جہنم کی آگ سے بچانے کا ضامن ہے۔

جس قوم کا دین ایک ہو، تاریخ ایک ہو، سرچشمۂ دین کی زبان ایک ہو، انجام مشترک ہو، جس کی خوشی اور غمی کا معیار مشترک ہو، جس کی امیدیں اور آرزوویں مشترک ہوں —— وہ کلمۂ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر، قرآن کریم کو اپنا دستور بناکر، محمد عربی ﷺ کی قیادت میں متحد و متفق نہ ہوں تو کون ہو گا؟

فرقہ واریت کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں

اسلام، دراصل اتحاد واتفاق کی دعوت دیتا ہے، فرقہ واریت اور اختلاف وانتشار کی نہ صرف مذمت کرتا ہے؛ بلکہ اس سے براءت کا کھلم کھلا اعلان کرتا ہے، جو لوگ اسلام کی واضح تعلیمات کے باوجود آپس میں پھوٹ ڈالتے ہیں وہ حقیقت میں اپنے نفس کے غلام ہیں اور کسی اور کے اغراض ومقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسلام، اجتماعیت کا درس دیتا ہے اور فرقہ واریت کو بدترین جرم قرار دیتا ہے، تعمیر کو پسند کرتا ہے اور تخریب کو غیر اسلامی فعل قرار دیتا ہے، وہ مسلمانوں کو ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ کمزور اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے۔

یہی وہ "وحدتِ امت" ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے، قرآن وسنت نے جس پر زور دیا ہے، اور اسی وحدت کے نتیجے میں اللہ نے اس امت کا رعب دوسری قوموں

کے دلوں میں ڈالا تھا اور جس کی وجہ سے یہ امت فتح یاب ہوتی رہی، جس کی وجہ سے اس نے قیصر وکسریٰ کو فتح کیا، پھر بالآخر عدل وانصاف، علم وعرفان اور احسان وایمان کی بنیادوں پر تاریخ کا بے مثال نظام حکومت قائم کیا۔

خلاصۂ گفتگو

دینی اور دنیوی مصلحتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوجائیں اور تمام اختلافات کو پس پشت ڈال دیں، عقل وخرد کا تقاضا ہے کہ متحد ہوں، بلکہ جس زمانے میں ہم جی رہے ہیں وہ زمانہ بھی سوائے وحدت، یکتائی اور قوت وطاقت کی زبان کے اور کوئی زبان نہیں سمجھتا، لہٰذا اگر عزت وشرافت کے ساتھ جینا ہے تو متحد ہوکر اپنی معاشی، علمی، تہذیبی، سیاسی اور دفاعی پوزیشن کو مضبوط کرنا ہوگا۔

اس اتحاد کو بروئے کار لانے کے لیے تمام وسائل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے: مدارس ومکاتب اور اسکول وجامعات میں اس فکر کو اجاگر کیا جائے، اہل منابر ومحراب اپنے خطاب میں اس امر پر اپنی توانائی صرف کریں، اصحابِ قلم اپنی تحریروں کے ذریعہ وحدتِ امت کو مہمیز دیں، اسی طرح داعیانِ اسلام اپنی دعوتوں میں اتحاد کو خصوصی مقام دیں؛ کیوں کہ افراد کی قوت اجتماعی قوت سے وابستہ ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

* * *

۱۵/شوال ۱۴۲۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حبشہ کی پہلی ہجرت ــــــ اسباب ونتائج

ہجرت کے اسباب

آج اسلامی تاریخ کے کچھ صفحات آپ کی خدمت میں پیش کرنے جارہا ہوں، مکہ مکرمہ میں عہد نبوی کا ابتدائی دور ہے، ابھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا حکم نازل نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب وخلیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرمادیا ہے، آپؐ کو توحید اور اپنی رسالت ونبوت کی طرف دعوت دینے کا حکم آچکا ہے، آپؐ نے محدود پیمانے پر دعوت کا کام شروع فرمادیا ہے، خیر کے کاموں میں سبقت اور پہل کرنے والے، اسلام کی دعوت قبول کرکے مشرف باسلام ہونے لگے ہیں، آپؐ کے اردگرد ایک چھوٹی سی جماعت تیار ہوگئی ہے، یہ وہ آہنی عزم وحوصلے اور صبر وتحمل کی پیکر جماعت ہے جس نے اپنی قوم، برادری اور سوسائٹی کی مخالفت اور اذیت رسانی کی پرواہ کیے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہ لبیک کہا اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے جاں گداز اور روح فرسا حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوگئی ــــ انھیں یہ یقین ہوگیا تھا کہ جنت کا راستہ طے کرنا ایک غیر معمولی مشقت ومجاہدہ کا کام ہے، منزل تک پہنچنے

کے لیے نہ صرف کانٹوں اور ناموافق حالات سے گزرنا ہوگا؛ بلکہ نہایت جانبازی اور سرفروشی کا ثبوت دینا ہوگا۔

لیکن سب سے زیادہ جو چیز انھیں ستاتی تھی وہ یہ کہ انھیں آرام سے، چین وسکون اور خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت کرنے نہیں دیا جاتا تھا، دنیا کی ہر چیز لٹ جائے اس کی انہیں پرواہ نہیں تھی، دنیاوی مصیبتوں کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے، یہ بھی قابل برداشت تھا؛ لیکن دینی شعائر کی ادائیگی، لذتِ عبادت اور شوقِ مناجات میں جب رکاوٹ آتی تھی تو وہ بے چین ہوجاتے تھے، اس لیے انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں "حبشہ" کی جانب ہجرت کی اجازت مرحمت فرمادیں؛ تاکہ وہاں پہنچ کر سکون کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرسکیں، چناں چہ حضور ﷺ نے بادل ناخواستہ اجازت عطا فرمادی، لیکن آپؐ کے لیے ان کی جدائی نہایت مشکل چیز تھی، تاہم اس وقت، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کی جدائی کو برداشت فرمالیں، کیوں کہ آپؐ اور آپ کے یہ جاں نثار صحابہؓ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ قریش کا مقابلہ کرسکیں۔

مہاجرین کی روانگی اور کفارِ مکہ کی بے چینی

مہاجرین کا مبارک قافلہ حبشہ کی طرف روانہ ہوگیا، ان کے سربراہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ تھے، حبشہ پہنچ کر وہاں کے منصف اور نیک سیرت بادشاہ "نجاشی" کے زیر سایہ انھوں نے اپنے رختِ سفر کھول دیے، ان کی حمایت ونگرانی میں پرسکون اور پرامن فضا میں عبادت کی حلاوت محسوس کرنے لگے۔

لیکن کفار قریش کو کب گوارا تھا کہ یہ لوگ کسی مقام پر بھی چین وسکون کا سانس لے

سکیں، اپنے ایمان و عقیدے اور عبادت پر بآسانی جمے رہیں، چناں چہ انھوں نے نجاشی کی خدمت میں اپنے دو نمائندے بھیجے: عمرو بن العاص اور عبد اللہ بن ربیعہ کو اور ان کے ساتھ گراں قدر ہدایا اور تحائف بھی روانہ کیے تاکہ نجاشی اور ان کے مقرب ترین پادریوں کو بطور رشوت کے پیش کریں۔ انہیں یہ بھی ہدایت دی گئی کہ بادشاہ سے گفتگو کرنے سے پہلے ہر پادری کو بھرپور ہدیہ دے دیں، تاکہ مہاجرین کے خلاف بادشاہ کے سامنے ان کی حمایت کریں۔

جب دونوں نمائندے حبشہ پہنچے تو نجاشی کے درباری پادریوں سے ملے، ہر ایک کو قیمتی ہدایا دیے اور کہا کہ بادشاہ کی سرزمین پر ہمارے کچھ احمق نوجوان آگئے ہیں، جنھوں نے اپنے آباء واجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی قوم کے اتحاد کو پاش پاش کر دیا ہے، لہٰذا جب ہم بادشاہ سے ان کے متعلق بات کریں گے تو آپ حضرات انھیں مشورہ دیں کہ وہ ان سے ان کے مذہب کے سلسلے میں کچھ دریافت کیے بغیر ہی ہمارے حوالے کر دیں، کیوں کہ ان کی قوم کے سربراہ اور ان کے بزرگ ان کی حقیقت سے اور ان کے جدید عقائد سے زیادہ واقف ہیں۔

قریش کے نمائندوں کی شاہِ حبشہ کے دربار میں حاضری

پھر وہ شاہِ نجاشی کی خدمت میں پہنچے، انھیں بھی نہایت قیمتی ہدایا پیش کیے، چناں چہ بادشاہ نے بہ خوشی قبول کر لیا اور پسندیدگی کا اظہار کیا، اس کے بعد یہ قریش کے نمائندے ان سے مخاطب ہوے: بادشاہ سلامت! آپ کی سلطنت میں ہمارے چند شرپسند لڑکوں نے آکر پناہ لے رکھی ہے، جنھوں نے ایک ایسا مذہب اختیار کر لیا ہے جسے ہم

جانتے ہیں نہ آپ، انھوں نے ہمارا مذہب چھوڑ دیا ہے اور آپ کے دین میں داخل نہیں ہوے — ہمیں ان کی قوم کے سرداروں، رشتے داروں اور قبیلوں کے سربراہوں نے آپ کے دربار میں بھیجا ہے تاکہ آپ انھیں ہمارے حوالے کردیں، کیوں کہ ان کی قوم کے اکابر ان کی فتنہ انگیزی اور شرپسندی کے سلسلے میں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں — یہ سن کر بادشاہ نے اپنے درباری پادریوں اور دینی رہنماؤں کی طرف نظر اٹھائی تو انھوں نے کہا: عالی جاہ! یہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں، ان کی قوم کے سردار ہی زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ آپ انہیں ان کے سپرد کردیں۔

شاہ نجاشی نے جب پادریوں کی باتیں سنیں تو شدید ناراض ہوے اور کہا: جب تک ان پناہ گزینوں کو بلا کر ان کی طرف منسوب کیے گئے الزامات کی تحقیق نہیں کرلوں گا، تب تک ہرگز انھیں کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔

دربارِ شاہی میں مہاجرین کی پیشی

چناں چہ بادشاہ نے ان مسلمان مہاجرین کو اپنے دربار میں بلوایا، جب وہ حضرات دربار میں آئے تو دیکھا کہ بادشاہ کے دائیں بائیں دینی رہنما اور پادری اپنے مخصوص مذہبی عالمانہ وضع قطع کے ساتھ اپنی مذہبی کتابیں کھولے ہوے بیٹھے ہیں، اسی طرح دیکھا کہ قریش کے وہ دونوں نمائندے بھی پہلے سے حاضر ہیں۔ بادشاہ، ان مسلمان مہاجرین کی طرف متوجہ ہوے اور ان سے کہا:

> ”تم نے اپنے لیے یہ کون سا نیا مذہب ایجاد کرلیا ہے جس کی وجہ سے اپنی قوم کے مذہب کو ترک کردیا اور ہمارا، یا یہاں کا کوئی دوسرا مذہب اختیار نہیں کیا؟“۔

شاہ نجاشی کی مجلس میں حضرت جعفر بن ابی طالب کا بے باک خطاب

مہاجرین کی جماعت کی طرف سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ متکلّم طے ہوے اور آگے بڑھ کر نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ پر اعتماد لہجے میں فرمایا:

”بادشاہ سلامت! ہم جہالت میں ڈوبے ہوے لوگ تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کاری میں مبتلا تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہم سایوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے اور ہم میں کا طاقت ور شخص کمزور شخص کو کھاجاتا تھا، ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایسا رسول مبعوث فرمایا جو حسب ونسب، صداقت وامانت اور عفت وپاک دامنی میں معروف تھا، چناں چہ اس نے ہمیں صرف اللہ کی توحید وعبادت کی دعوت دی اور اس کے سوا پتھروں اور بتوں کی عبادت سے منع کیا جن کی عبادت ہم اور ہمارے آباو اجداد کیا کرتے تھے۔ اس رسول برحق نے ہمیں سچائی، امانت داری، صلہ رحمی اور ہم سایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا اور حرام کاری، خوں ریزی، فحش کاری، غلط بیانی سے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے ہمیں منع کیا۔ ہمیں یہ حکم دیا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اسی طرح ہمیں نماز، زکاۃ اور روزے رکھنے کا بھی حکم دیا۔ چناں چہ ہم نے اس رسول برحق کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی شروع کردی، لہٰذا ہم نے صرف ایک اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، جس چیز کو ہمارے لیے حرام بتایا اس کو ہم نے حرام سمجھا اور جس چیز

کو حلال بتایا اسے ہم نے حلال جانا۔ پھر ہماری قوم ہماری دشمنی پر آگئی، ہمیں سخت اذیتیں دیں، یہ سب اس لیے کیا تاکہ ہم یہ مذہب چھوڑ کر دوبارہ بتوں کی پوجا کرنے لگیں اور تمام حرام چیزوں کو حلال سمجھ کر دوبارہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔

جب انھوں نے ظلم وزیادتی کی انتہا کردی اور ہمارے اور دین کے درمیان رکاوٹ کھڑی کرنے لگے تو ہم نے آپ کے ملک کا رخ کیا، ہر ایک کو چھوڑ کر آپ کا انتخاب کیا، آپ ہی کی ہم سائگی کا ہمیں خیال آیا اور بادشاہ سلامت! ہم نے اس امید کے ساتھ آپ کے ہاں پناہ لی کہ یہاں ہمارے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوگا"۔

سورۂ مریم کی تلاوت اور نجاشی پر اس کا رقّت انگیز اثر

حضرت جعفرؓ کی ساری باتیں نجاشی نے بغور سنیں، سن کر ان کی طرف متوجہ ہوکر کہا: تمہارے نبی جو کلام الٰہی لے کر آئے ہیں، کیا تمہارے پاس ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، پھر شاہِ نجاشی نے کہا کہ پڑھ کر سناؤ! چناں چہ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کردی اور شروع کی چند آیات کے بعد حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق جو آیات ہیں وہ پڑھیں، جب نجاشی نے اللہ کا کلام سنا تو رو پڑے، اتنے روئے کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہوگئی، ان کے درباری پادری بھی رونے لگے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی کتابیں بھیگ گئیں۔

کلام اللہ سننے کے بعد شاہ نجاشی نے کہا:

"یقیناً جو کلام تمہارے نبی لے کر آئے ہیں اور جو کلام عیسیٰ لے کر آئے تھے وہ ایک ہی مشکاۃ سے نکلے ہوئے نور کی کرنیں ہیں"۔

اس کے بعد قریش کے نمائندوں کی طرف متوجہ ہوکر کہا:

"تم چلے جاؤ، خدا کی قسم میں انھیں تمہارے حوالے نہیں کروں گا"۔

جب مجلس برخاست ہوگئی، تو عمرو بن العاص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ بخدا کل دوبارہ بادشاہ کے پاس آؤں گا اور اِن کے سلسلے میں ایسی بات بتاؤں گا کہ جس سے بادشاہ کا سینہ غیظ وغضب سے پھول جائے گا اور اُن کا دل اِن لوگوں سے نفرت کرنے پر مجبور ہوجائے گا، انھیں ضرور آمادہ کرلوں گا کہ اِن کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں۔

دوبارہ نجاشی کے دربار میں حاضری اور قریش کے نمائندوں کی نئی چال

دوسرے روز پھر شاہ نجاشی کے دربار میں قریش کے نمائندے آئے، عمرو بن العاص نے بادشاہ کو مخاطب کرکے کہا:

"آپ نے جن لوگوں کو اپنی پناہ اور حمایت میں لیا ہے یہ لوگ حضرت عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں نہایت نامناسب باتیں کرتے ہیں، لہٰذا اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ان کو بلائیے اور دریافت کرلیجیے"۔

جب مسلمان مہاجرین کو خبر پہنچی تو بے حد فکر مند ہوے اور انہیں اندیشہ ہوا کہ اب تو ہماری خیر نہیں، کیوں کہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، جب کہ اسلامی عقیدے کے مطابق وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں؛ لیکن باہمی گفت وشنید کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہم وہی کہیں گے جو اللہ نے فرمایا ہے اور اپنے نبیؐ کی بتائی ہوئی باتوں سے ذرہ برابر بھی ہٹ کر کوئی بات نہیں کریں گے، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو، نیز یہ فیصلہ کیا کہ اس بار بھی متکلّم حضرت جعفرؓ ہی ہوں گے۔

بادشاہ کا سوال اور حضرت جعفرؓ کا جواب

مسلمانوں کا وفد دوبارہ دربارِ شاہی میں پہنچا، پہلی بار کی طرح اس بار بھی مجلس میں دینی رہنما (پادری) اور قریش کے نمائندے بادشاہ کے سامنے بیٹھے تھے، جب یہ حضرات نجاشی کے سامنے آئے تو ان سے سوال کیا: "تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" اس کے جواب میں حضرت جعفرؓ نے کہا: "ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبیؐ نے فرمایا"۔

نجاشی نے کہا: "تمہارے نبی نے کیا کہا؟"

حضرت جعفرؓ نے جواب میں کہا کہ ہمارے نبیؐ ان کے بارے میں یہ فرماتے ہیں:

«إِنَّهُ عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ، وَرُوحُهُ وَكَلِمَتُهُ الَّتِيْ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ الْعَذْرَاءِ الْبَتُولِ».

"بلاشبہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اور اس کی طرف سے روح اور کلمہ ہیں جسے پاک دامن اور عبادت گزار مریم تک پہنچایا"۔

یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مار کر کہا:

"اللہ کی قسم تمہارے نبی کے لائے ہوئے عقیدے سے حضرت عیسیٰ بن مریم کا عقیدہ ایک بال برابر بھی مختلف نہیں تھا"۔

نجاشی کے یہ جملے سن کر ان کے درباری علماء غصے سے بھنبھنانے لگے، اس پر نجاشی نے کہا کہ تم بھنبھناتے رہو، (حق بات وہی ہے جو انھوں نے کہی ہے) پھر مسلمانوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"تم جاؤ اور امن وامان کے ساتھ ہمارے ملک میں رہو، جو تمہیں برا بھلا کہے گا اسے تاوان دینا ہوگا اور جو تمہیں اذیت پہنچائے گا اسے سزا دی جائے گی، خدا کی قسم، تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے اور اس کے عوض مجھے سونے کا پہاڑ بھی مل جائے تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا"۔

اس کے بعد قریش کے نمائندے عمرو اور ان کے رفیق کی طرف دیکھ کر کہا:

"ان لوگوں کے ہدایا تحائف واپس کر دو، مجھے قطعاً ان کی ضرورت نہیں"۔

چناں چہ وہ دونوں ذلیل و خوار اور ناکام و نامراد ہو کر وہاں سے نکلے۔

دس سال بعد مسلمان مہاجرین کی مدینہ منورہ واپسی

شاہ نجاشی کی طرف سے کیے گئے عہد و پیمان اور امن وامان اور اعزاز واکرام کے نتیجے میں مسلمانوں نے تقریباً دس برس اس ملک حبشہ میں نہایت پر سکون زندگی گزاری، دس برس کے بعد یہ حضرات مدینہ منورہ واپس ہوگئے، کیوں کہ ان کی واپسی کے وقت حضور اکرمؐ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ رہے تھے، جب یہ حضرات مدینہ پہنچے، ٹھیک اسی وقت رسول اکرمؐ اپنے جاں نثار مجاہدین صحابۂ کرامؓ کے ساتھ خیبر فتح کر کے مدینہ واپس ہوے تھے، حضورؐ کو اس روز دُہری خوشی ملی تھی، ایک فتح خیبر کی دوسری مہاجرین کی ایک عرصے بعد واپسی کی، بالخصوص اپنے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ کی بہ خیریت واپسی پہ آپ بے حد خوش ہوے تھے، چناں چہ ان کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا:

«مَا أَدْرِي بِأَيِّهِمَا أَنَا أَفْرَحُ بِفَتْحِ خَيْبَرَ أَمْ بِقُدُومِ جَعْفَرٍ».

”میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے کس چیز سے زیادہ خوشی ملی ہے: خیبر کی فتح یابی سے یا جعفر کی آمد سے“۔[احمد والبیہقی]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہ نجاشی جن کا نام «اَصْحَمَة» تھا، انھوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن ملک کے حالات اور مصلحت کے پیش نظر اپنا اسلام چھپائے رکھا، جب ان کی وفات ہوئی تو حضورؐ نے ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی تھی۔[بخاری شریف]

اس قصے کے سبق آموز پہلو

اس ایمان افروز قصے میں متعدّد سبق آموز پہلو، پند و نصائح اور فوائد ہیں، جن میں سے بعض کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) اس قصہ کا سب سے نمایاں پہلو دین کی حفاظت کے لیے عظیم ترین قربانی ہے، ان حضرات مہاجرین نے اپنے دین کی حفاظت اور اس پر بآسانی عمل کرنے کے لیے اپنی جائے پیدائش، اپنا محبوب وطن، اپنے اعزہ واحباب جن میں سرفہرست ان کے نور نظر رسولِ پاکؐ تھے اور اپنا مال و متاع سب کچھ چھوڑ کر دوسرے ملک کی ہجرت اختیار کی۔

(۲) حق گوئی اور بے باکی، بالخصوص دوسری مجلس میں جب شاہِ نجاشی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق سوال کیا تو بلا تردد اور بغیر کسی کمی بیشی کے جو حق بات تھی وہ انھوں نے بیان کی، اس طرح ہر شخص کے لیے عملی درس دیا کہ مشکل ترین حالات میں بھی صداقت وامانت اور جرأت و شجاعت کے ساتھ حق بات کہنے میں کسی مخلوق کی ملامت کی پرواہ نہ کرے — جو لوگ دنیاوی اور عارضی منافع کے لیے اپنے بیانات بدل

دیتے ہیں، یا کذب بیانی سے کام لیتے ہیں، یا جھوٹی گواہی دیتے ہیں ایسے لوگوں کو ان برگزیدہ ہستیوں سے سبق لینا چاہیے۔

(۳) ایک اہم اور عبرت آموز پہلو اس قصہ کا یہ ہے کہ کوئی فیصلہ صادر کرنے یا کوئی امر نافذ کرنے سے پہلے یا کسی کے سلسلے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے معاملے کی تحقیق ضروری ہے۔ شاہ نجاشی کو جب قریش کے نمائندوں نے مہاجرین کی شکایتیں پہنچائیں اور ان سے یہ درخواست کی کہ ان سے کسی طرح کا استفسار کیے بغیر ہی ان کے حوالے کردیں، تو انھوں نے سختی سے انکار کردیا اور مہاجرین کو بلاکر ان سے صورت حال معلوم کی، تب انھیں معلوم ہوا کہ ان کی طرف منسوب کی گئی شکایتیں غلط تھیں اور یہ فیصلہ دیا کہ انھیں کسی کے حوالے نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ وہ اس ملک میں امن وامان کے ساتھ جب تک چاہیں زندگی گزاریں —— اگر ان سے براہ راست معاملے کی تحقیق کیے بغیر ہی صرف ایک طرف کی شکایت سن کر ملک بدر کرنے کا فرمان جاری کردیتے تو کتنا بڑا ظلم ہوتا۔

اس قصے میں ہر ذمے دار کے لیے درس عظیم ہے، خواہ وہ کسی ملک کا سربراہ ہو، کسی صوبے کا یا کسی کمپنی کا، یا کسی علاقے کا، کسی ادارے کا یا گھر اور قبیلے کا ذمے دار ہو، اگر کسی ماتحت سے متعلق کوئی شکایت پہنچے تو بذاتِ خود معاملے کی تصدیق کرے، اگر تصدیق کیے بغیر ہی کوئی رائے قائم کرے گا یا کوئی فیصلہ نافذ کرے گا تو عجب نہیں کہ کسی ظلم عظیم کا مرتکب ہوجائے؛ کیوں کہ شکایت کرنے والے نے ممکن ہے کہ اپنی باہمی عداوت اور کینہ وحسد کی وجہ سے یا ذاتی اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے شکایت کی ہو۔

(۴) اگر ضرورت پیش آجائے تو مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ کسی غیر مسلم

ریاست میں جاکر پناہ لے، جیسا کہ مہاجرین نے شاہِ نجاشی کے ملک میں پناہ لی جو اس وقت اہل کتاب میں سے تھے اور بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

(۵) کسی جماعت یا تنظیم کی نمائندگی یا متکلّم کی حیثیت سے کسی بڑے سے گفتگو کے لیے مناسب اور موزوں شخصیت کا انتخاب۔ مسلمانوں نے اپنی ترجمانی کے لیے حضرت جعفرؓ کو منتخب کیا تھا جو رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے چچازاد بھائی بھی تھے، آپ سے ظاہر وباطن میں مشابہت بھی رکھتے تھے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے، فصیح وبلیغ ہونے کے ساتھ نہایت ذکی، زیرک اور عبقری تھے، چناں چہ شاہ نجاشی کے سامنے ان کے خطاب کے ہر ہر جملے پہ غور کریں اور گفتگو کے تسلسل اور انداز پر نظر ڈالیں تو ان کی ذہانت وفطانت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے جاہلیت کی خرابیوں اور برائیوں کو ذکر کیا جسے سن کر دل متنفر ہوجائے اور معاشرے کی بدترین صورت سامنے آجائے، پھر اسی معاشرے میں پیدا ہونے والے نبی برحق کی صداقت وامانت اور عفت وعصمت کا تذکرہ کیا، اس کے بعد اسلام کے نمایاں ترین اخلاقیات کو بیان کیا، اس کے بعد عقائد وعبادات کو مختصراً ذکر کیا —— پھر بادشاہ کے عدل وانصاف کی تعریف کی جس سے ان کا متأثر ہونا فطری امر تھا۔ جب ان سے قرآن کی تلاوت کا مطالبہ کیا گیا تو سورۂ مریم کی شروع کی آیات کا انتخاب کیا جن میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کا ذکر خیر ہے جسے سن کر نہ صرف بادشاہ اشک بار ہوے بلکہ ان کے ہم نشین پادری بھی زار وقطار رو پڑے — اس پوری گفتگو میں حضرت جعفرؓ کی باکمال شخصیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

(٦) اس قصے کا ایک عظیم پہلو یہ ہے کہ انجام کار متقیوں اور ایمان والوں کے

لیے ہی مقدر ہے، حق وصداقت پر جمے رہنے والوں پہ صبر آزما حالات آتے ہیں، ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، قید وبند کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے، دردناک اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں؛ لیکن صبر کے ساتھ تقوے پر جمے رہنے والوں کا انجام کار ہمیشہ فتح وکامرانی کا اور تائید غیبی کا ہوتا ہے۔ مجاہدہ، تقویٰ اور صبر، یہ تین صفات جمع ہوجائیں تو کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

***

۱۴۳۷/۶/۲۳ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

خوش گوار زندگی

پر لطف زندگی بسر کرنے والے لوگ

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت، محبت اور انابت اپنے دل میں رکھتے ہیں اور ایمان ویقین کے ساتھ صالح اعمال کرتے ہیں، انہیں خوش گوار، پاکیزہ اور پر لطف زندگی نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَٰلِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُۥ حَيَوٰةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿٩٧﴾﴾ [النحل: ٩٧]

”جس شخص نے بھی ایمان کی حالت میں نیک عمل کیا ہوگا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ایسے لوگوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق ان کا اجر ضرور عطا کریں گے“۔ [سورۂ نحل:۹۷]

بعض مفسرین کرام نے ”حیاتِ طیبہ“ کی تفسیر میں یوں فرمایا ہے کہ اس سے مراد ہے: تھوڑے پہ قناعت کرلینا اور اچھے رزق کا میسر آجانا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی

تفسیر اس سے زیادہ عام اور وسیع ہے — جو تفسیر ذکر کی گئی، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ایمان والے مرد یا ایمان والی عورت کا دل، ایمان ویقین، اللہ کی معرفت، محبت، انابت، خشیت اور توکل سے معمور ہو، پھر اس کے نتیجے میں جو اسے کیف وسرور، راحت وسکون اور شوق وذوق محسوس ہوگا، یہ وہی شخص بتائے گا کہ اس کی زندگی میں کس قدر لطف، مزہ اور راحت ہے۔ چناں چہ ایک عارف باللہ نے اپنی اس طرح کی خوش گوار زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

> ”میں جس طرح کی پر لطف زندگی گزار رہا ہوں، اگر جنتیوں کو بھی ایسی ہی زندگی نصیب ہوگی تو بلا شبہ وہ بھی مزے میں ہوں گے“۔

ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں:

> ”بعض اوقات میں دل پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ مستی میں رقص کرنے لگتا ہے“۔ [ابن قیمؒ]

یہ وہ مزیدار زندگی ہے جو یقیناً قابلِ رشک ہے اور جسے حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے؛ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حصول کے لیے بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

خوش گوار زندگی کے اسباب ووسائل

کامیابی کے حصول کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ ایک منزلِ مقصود کا تعیُّن اور دوسرے اس منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح راستے پر گامزن ہونا، لیکن اگر منزل کا تعیّن نہ ہو، یا صحیح راستے کے بہ جائے غلط راستہ اختیار کیا جائے تو بلا شبہ کامیابی کا حصول ناممکن ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص "حیاتِ طیبہ" اور خوش گوار زندگی کا طالب ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان مقامات کو معلوم کرے جہاں یہ بیش بہا نعمت ملتی ہے، اسی طرح ان راہوں کو بھی معلوم کرے کہ جو راہیں ان مقامات تک پہنچاتی ہیں، تاکہ اس کی محنت ضائع نہ ہو اور ناکامی سے بچ سکے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لینے کی ضرورت ہے کہ خوش گوار، پاکیزہ اور پرسکون زندگی، اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی؛ لہٰذا اس زندگی کی تلاش میں اگر کوئی مخلص ہے تو اُسے زہد و تقویٰ، نیکی اور احسان، انابت الی اللہ، تلاوت قرآن میں تلاش کرنا چاہیے، پریشان حالوں کی داد رسی، محتاجوں کی مدد، صلۂ رحمی، خدمتِ والدین، پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، یتیموں کی کفالت اور رات کے آخری پہر کی نمازیں اور دعاؤں میں، آہِ سحر گاہی میں اور مالک الملک کے سامنے گریہ وزاری میں تلاش کرنا چاہیے۔

ایک صحابیؓ کا نماز کے ساتھ والہانہ شغف

نماز در حقیقت خدائے ذوالجلال کے ساتھ ہم کلامی اور مناجات کا نام ہے، ذیل کے قصے میں صحابیِ رسولؐ کا نماز کے ساتھ والہانہ شغف، محویت اور عشق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، تیر پہ تیر کھائے جانا اور جسم کا لہولہان ہوجانا ان کے نزدیک آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ نماز و تلاوت میں حاصل ہونے والے لطف سے دست بردار ہوجائیں۔

رسول اکرم ﷺ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ایک غزوے (ذات الرقاع) سے واپس ہو رہے تھے، راستے میں ایک وادی میں شب گزاری کا ارادہ فرمایا، چوں کہ دشمن ہمہ وقت

موقع کی تلاش میں رہا کرتے تھے، اس لیے آپؐ نے پوری جماعت کی حفاظت کے پیش نظر یہ فرمایا: ”وہ کون (بہادر اور دلیر) دو شخص ہیں جو آج رات دشمنوں سے ہماری حفاظت کا کام انجام دیں گے؟“ چناں چہ ایک مہاجری صحابی (عمار بن یاسرؓ) اور ایک انصاری صحابی (عَبّاد بن بِشرؓ) کھڑے ہوے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم نگہ بانی کا کام انجام دیں گے۔ چناں چہ وہ دونوں حضرات گھاٹی سے نکل کر اس کے دروازے پہ آگئے اور انصاری صحابیؓ نے مہاجریؓ سے کہا کہ ہم رات کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں، ایک حصے میں تم سو جاؤ اور میں بیدار رہوں گا اور دوسرے حصے میں اس کے برعکس، لہٰذا تمہیں کیا پسند ہے؟ مہاجری صحابی نے بیداری کے لیے آخری حصے کو ترجیح دیا۔

مہاجری صحابیؓ سو گئے اور انصاری صحابیؓ نے نماز کی نیت باندھ لی اور نماز میں قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو گئے، اسی اثناء میں ایک دشمن نے انھیں دیکھ لیا اور اس نے سمجھا کہ یہ قوم کا جاسوس ہے، اس لیے اس نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور ان کی طرف پھینکا، تیر نشانے پر لگا، صحابیؓ نے اسے نکال کر پھینک دیا، لیکن ذرا بھی حرکت نہیں کی جو نماز کے مُنافی ہو، دشمن نے دوسرا تیر پھینکا، وہ بھی صحابی کے جسم میں لگا، انھوں نے اسے بھی نکال کر پھینک دیا اور قرآن کی تلاوت میں مگن رہے، دشمن نے تیسرا تیر پھینکا، صحابی نے اسے بھی نکالا، پھر رکوع اور سجود کر کے نماز سے فارغ ہو کر اپنے مہاجری ساتھی کو بیدار کیا، دشمن نے جب دو شخصوں کو دیکھا تو بھاگ پڑا، لیکن جب مہاجری نے اپنے ساتھی کے جسم سے تیر لگنے کی وجہ سے بہتا ہوا خون دیکھا تو کہا: اللہ تجھے معاف کرے، جب اس نے پہلا تیر پھینکا اسی وقت مجھے کیوں نہ جگا دیا؟ انصاری صحابیؓ نے جواب دیا کہ ”میں نے ایک سورت کی تلاوت شروع کی تھی جس کی تکمیل سے پہلے نماز توڑنا مجھے ناپسند تھا، خدا کی قسم رسول اللہ ﷺ

نے جس مہم پہ مجھے لگایا تھا اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو سورت ختم کرکے ہی نماز پوری کرتا، اگرچہ مجھے اپنی جان سے ہی ہاتھ دھونے پڑتے"۔ [مسند احمد وابوداؤد]

اللہ اکبر! کیا اس لطف وسعادت اور لذت وراحت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کا زیاں، جان کے زیاں سے زیادہ مشکل اور جس کی قیمت جان کی قیمت سے زیادہ ہے۔ وہ کون سی لذت اور دل کی راحت تھی جس کی سرمستی نے انھیں تیروں کی بارش اور جسم کے لہولہان ہونے کے باوجود ذرا بھی حرکت کرنے سے روکے رکھا؟ —— یہی وہ حیاتِ طیبہ اور قلبی راحت وسعادت اور لذت وسرور ہے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں؛ لیکن جنہیں اس کا مذاق مل گیا اور اس کی حقیقت کو انھوں نے پالیا، انھوں نے اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دے ڈالی۔

خوش گوار زندگی کا ایک عظیم سرچشمہ قرآن کریم

بعض لوگوں نے اس پاکیزہ زندگی کا راز قرآن کریم کی تلاوت، اس کی آیتوں میں تدبُّر، غور وفکر اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے میں پالیا، چناں چہ قرآن ان کی زندگی کا وفادار دوست، ان کا صالح ہم نشیں اور ان کا بہترین غم خوار بن گیا، اور کیوں نہ ہو، حدیث پاک میں وارد ہے کہ:

"جب کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر میں جمع ہوکر قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے، رحمت الٰہی انھیں ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر خیر کرتے ہیں ان کے سامنے جو ان کے پاس رہتے ہیں یعنی فرشتے"۔ [مسلم شریف]

لٰہذا قرآن کریم، سکینت، رحمت، شفائے دل اور راحتِ نفس کا مصدر ہے، اسی لیے امام احمد بن حنبلؒ سے منقول ہے کہ وہ ہر روز (حدیث پاک اور فقہ کی دیگر مصروفیات کے ساتھ) پورے قرآن کا ساتواں حصہ پڑھتے تھے، اس طرح ہر سات روز میں قرآن ختم کرتے تھے، اسی طرح ابھی بھی امت کے بعض افراد ایسے ہیں جو اس سے بھی زیادہ کی تلاوت روزانہ کرتے ہیں یا تہجد کی نماز میں پڑھتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے حقیقی زندگی کا راز اور چین وسکون اور حیاتِ طیبہ کا سرچشمہ کثرتِ تلاوت اور خدائے ذوالجلال کے سامنے عاجزی وانکساری میں پایا۔

ایک صاحبِ قرآن کہتے ہیں کہ میرے ایک دوست نے ایک روز فون کرکے کہا کہ میں اپنی زندگی کے ایک مشکل ترین مرحلے سے گزر رہا ہوں، بالکل چوراہے پہ کھڑا ہوں، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس آیت کریمہ کو غور سے پڑھو اور اس کے معانی پر گہری نظر ڈالو، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے راہیں کھول دیں گے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تَتَّقُواْ ٱللَّهَ يَجۡعَل لَّكُمۡ فُرۡقَانٗا وَيُكَفِّرۡ عَنكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡۗ وَٱللَّهُ ذُو ٱلۡفَضۡلِ ٱلۡعَظِيمِ ﴿٢٩﴾ ﴾ [الأنفال: ٢٩]

”اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے ساتھ تقویٰ کی روش اختیار کروگے تو وہ تمہیں (حق وباطل کے درمیان) تمیز عطا کردے گا، اور تمہاری برائیوں کا کفارہ کردے گا، اور تمہیں مغفرت سے نوازے گا، اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے“۔[سورۂ انفال:۲۹]

چند روز کے بعد ہی ان کا میسیج آیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ میں اس آیت کو بار بار پڑھتا گیا اور اس کے معانی پر غور کرتا گیا اور اللہ تعالیٰ سے تقویٰ شعاری کی زندگی گزارنے کا

عہد کرتا گیا اور میری مشکلات کی تاریکیاں چھٹتی چلی گئیں، میں نے تو قرآن کریم کی کئی سورتیں یاد کر رکھی ہیں، انھیں میں یہ سورۂ انفال بھی ہے، لیکن ایسا محسوس ہوا کہ پہلی بار اس آیت کو پڑھ رہا ہوں، اب حال یہ ہے کہ میری پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں، اور بحمد اللہ ایسی خوش گوار اور پر سکون زندگی گزار رہا ہوں جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

حیاتِ سعیدہ اور دعوت الی اللہ

کچھ مبارک لوگوں کو حیاتِ طیبہ کا راز دعوت الی اللہ میں مل گیا، چناں چہ دوسرے بندگانِ خدا کو خدائے پاک سے وابستہ کرنے اور اللہ کا تعارف کرانے میں انھیں قلبی سکون اور سرور حاصل ہوتا ہے۔

میں نے ایک بزرگ اور عظیم داعی کو دیکھا جنھوں نے اپنی پوری زندگی اور زندگی کا پورا سرمایہ دعوت الی اللہ میں لگا دیا تھا، دنیا کے چپے چپے اور بالخصوص افریقہ کے شہروں اور بستیوں میں اپنا بیشتر وقت گزارتے رہے اور لوگوں کو اسلام کے ابدی اور آفاقی پیغام سے روشناس کراتے رہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے کالج کے زمانے کے دوست احباب نے بڑے بڑے منصب اور عہدے پائے، تجارتیں کیں، خوب دولت و ثروت کمائی؛ لیکن میں نے سب کچھ اللہ کے فضل و کرم سے اللہ کی رضا اور اس کے دین کی اشاعت کے لیے قربان کر دیا، غربت، اجنبیت اور بیگانگی کی زندگی گزارتا رہا، دربدر پھرتا رہا، اور اس پر مجھے قطعاً کوئی ندامت نہیں ہے؛ بلکہ خدائے پاک کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اپنے دین کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا —— مزید فرمایا کہ جب کوئی شخص میرے سامنے اسلام میں داخل ہوتا اور أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله کہتا تو فرطِ مسرت سے

اشکبار ہوجاتا، اس وقت دل میں جو خوشی اور فرحت وانبساط محسوس کرتا، خدا کی قسم اس کا اندازہ صرف میرا اللہ ہی لگا سکتا ہے، میں بیان نہیں کرسکتا۔

انھوں نے سعادت، راحت اور چین وسکون کو دعوت الی اللہ میں تلاش کیا اور حاصل بھی کیا اور مال ودولت کے حصول سے زیادہ لطف انھیں اسی مبارک مشغلہ میں حاصل ہوا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَآ إِلَى ٱللَّهِ وَعَمِلَ صَـٰلِحًا وَقَالَ إِنَّنِى مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾﴾ [فصلت: ٣٣]

”اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے، اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں فرماں برداروں میں شامل ہوں“۔

[سورۂ حم السجدہ:۳۳]

ضرورت مندوں کی حاجت روائی

بعض لوگوں نے حیاتِ طیبہ کا راز دوسروں کی حاجت روائی میں دریافت کرلیا۔ کسی محتاج کی داد رسی کرنا، کسی نادار کی کفالت کرنا، کسی پریشان حال کی مدد کرنا، کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، یا کسی پیاسے کو پانی پلانا، یا کسی بھٹکے ہوے کو راستہ بتلانا، کسی ننگے کو کپڑے پہنانا، کسی مقروض کا قرضہ ادا کردینا یا کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کرنا ان کے نزدیک ہر فرحت بخش اور روح پرور غذا بلکہ ہر طرح کی دولت وعزت سے زیادہ محبوب ہوتا ہے، اس طرح کی نیکی اور بھلائی کے کام کرکے ان کا دل خوشی سے رقص کرنے لگتا ہے؛ کیوں کہ انھیں پتہ ہے:

﴿وَمَا تُقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ ٱللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ

أَجۡرًاۚ وَٱسۡتَغۡفِرُواْ ٱللَّهَۖ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمُۢ ﴿٢٠﴾﴾ [المزمل: ٢٠]

”اور تم اپنے آپ کے لیے جو بھلائی بھی آگے بھیجو گے، اسے اللہ کے پاس جاکر اس طرح پاؤ گے کہ وہ کہیں بہتر حالت میں اور بڑے زبردست ثواب کی شکل میں موجود ہے۔ اور اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، یقین رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے“۔[سورۂ مزمل:۲۰]

قناعت اور راضی بہ رضائے الٰہی

سعادت کی ایک بڑی کنجی قناعت ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہنا ہے۔ انسان کی خواہشات کی کوئی حد نہیں، کبھی بھی یہ نعمتوں سے سیر نہیں ہوتا، ایک چیز کی آرزو کرتا ہے، جب وہ پالیتا ہے تو دوسرے کی آرزو فوراً پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح خود سے زیادہ خوش حال کو دیکھتا ہے تو اپنی حالت پر ماتم کرنے لگتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چینی، بے سکونی اور بے کلی کی زندگی گزارنے لگتا ہے ـــــ بلند خیالی اور بلند حوصلگی ہونی چاہیے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، اس کے لیے اپنی بساط بھر کوشش بھی ہونی چاہیے؛ لیکن جتنا میسر ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور باقی امور اللہ کے سپرد کردے۔

اس دنیا میں سارے انسان مختلف معیار کے ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی چیز سے محروم ہے تو بہ جائے اس کے کہ محرومی پر آہ وزاری کرے، اللہ کی تقسیم پر راضی رہے، صبر وتحمل اور قناعت پسندی کو اپنی زندگی کا شعار بنالے، قضاوقدر کے فیصلے کے سامنے سرتسلیم خم کردے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۗ وَمَن يُؤۡمِنۢ بِٱللَّهِ يَهۡدِ

قَلْبَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١﴾ [التغابن: ١١]

”کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی، اور جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا ہے، وہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔

[سورۃ التغابن:۱۱]

لوگ کیا کہیں گے...؟

”لوگ کیا کہیں گے؟“ اس جملے کو اپنے ذہن سے نکال دیں، ورنہ کبھی بھی چین سے نہیں جی سکیں گے، کیوں کہ آپ کے بس میں ہرگز یہ نہیں کہ سارے لوگوں کو خوش کر سکیں، اس لیے اگر خوش گوار زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ذمہ داریاں پوری کر لیں، اس کے بعد اپنی مصروفیات میں لگ جائیں، اس کی فکر نہ کریں کہ لوگ خوش ہوے یا ناخوش ہوے، جس خدائے ذوالجلال نے ساری کائنات کو پیدا کیا اور لوگوں پر اپنی نعمتوں کی بارش برسا رکھی ہے، جب سارے لوگ اس سے بھی راضی نہیں ہو سکے تو آپ سے کیسے ہوں گے؟۔

حدیث قدسی ہے:

«يَشْتُمُنِي ابْنُ آدَمَ، وَمَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَشْتُمَنِي، وَيُكَذِّبُنِي وَمَا يَنْبَغِي لَهُ، أَمَّا شَتْمُهُ فَقَوْلُهُ: إِنَّ لِي وَلَدًا، وَأَمَّا تَكْذِيبُهُ فَقَوْلُهُ: لَيْسَ يُعِيدُنِي كَمَا بَدَأَنِي» [صحيح البخاري]

”ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اس کے لیے مناسب نہ تھا کہ مجھے گالی دیتا، اور اس نے مجھے جھٹلایا اور اس کے لیے یہ بھی مناسب نہ تھا۔ اس کی گالی یہ ہے کہ وہ یہ

کہتا ہے کہ میرا بیٹا ہے، اور اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح اللہ نے مجھے پہلی بار پیدا کیا، دوبارہ (موت کے بعد) وہ مجھے زندہ نہیں کر سکے گا"۔

[بخاری شریف]

ایک جلیل القدر عالم باعمل کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوے اور کہا کہ فلاں شخص آپ کو برا بھلا کہتا ہے، تو انھوں نے فرمایا: اپنی عزت وآبرو کا صدقہ بہت پہلے کر چکے ہیں، اسی طرح ہماری حرمتوں کو پامال کرنے والے اور برا بھلا کہنے والے کو بھی پیشگی طور پر معاف کر چکے ہیں۔

کینہ اور حسد

سکون دل اور حیاتِ طیبہ کے لیے دل کا کینہ اور حسد سے پاک ہونا ضروری ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو خوش حالی، تونگری اور دیگر نعمتوں سے مالا مال کیا ہے تو اس پر حسد نہ کریں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، آپ کے حسد کرنے کی وجہ سے اس محسود کا کچھ نہیں بگڑے گا؛ لیکن آپ کبھی بھی چین وسکون کا سانس نہیں لے سکیں گے، حسد کی بیماری نہایت بدترین اور مہلک بیماری ہے، جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے، اسی طرح حاسد کی صحت وعافیت اور سکون واطمینان کو بھی غارت کر دیتی ہے۔

خوش گوار اور دل بہار زندگی کے چند اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگرچہ سب کا احاطہ یہاں دشوار ہے، تاہم بنیادی اصولوں پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ سکونِ دل حاصل ہو گا، راحت نفس اور حیاتِ طیبہ نصیب ہو گی۔

❋ ❋ ❋

۱۴۲۸/٦/۲۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعتدال اور میانہ روی

اقتصادی قوت کی اہمیت

قوموں کی ترقی اور ان کی بالادستی میں اقتصادی طاقت (Economic Power) اور دولت کے مناسب صرفے کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسی طرح ملکوں اور قوموں کے مرتبے ومقام کی تعیین، ان کے تحفظ اوران کے اغراض ومقاصد کی تکمیل میں بھی معاشی استحکام کو بڑا دخل ہے، بالخصوص موجودہ زمانے میں دنیا کے تمام ممالک کو دو حصوں: ترقی یافتہ اور ترقی پذیر یا غیر ترقی یافتہ کے درمیان تقسیم کے سلسلے میں معاشی اور صنعتی قوت وضعف کو بنیادی مقام حاصل ہے۔

لیکن معاملہ صرف آمدنی کا نہیں ہے؛ بلکہ آمد وخرچ کے درمیان توازن، خرچ کرنے میں اعتدال اور میانہ روی اور مقصد اور ذریعہ کی پہچان بھی نہایت ضروری ہے۔

قرآن کریم کی واضح تعلیمات

فضول خرچی سے اجتناب اور راہِ اعتدال پر چلنے کے سلسلے میں قرآن کریم نے اپنا

فیصلہ واضح طور پر سنا دیا ہے اور اسلام کا موقف صاف صاف بیان کر دیا ہے:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ ٱلْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ ﴾ [الإسراء: ٢٩]

"اور نہ تم (ایسے کنجوس بنو کہ) اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ کر رکھو، اور نہ (ایسے فضول خرچ کہ) ہاتھ کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دو جس کے نتیجے میں تمہیں قابل ملامت اور عاجز ہو کر رہنا پڑے"۔ [سورۂ اسراء:۲۹]

چناں چہ ہمارے دین نے راہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے اور بخالت اور فضول خرچی دونوں سے منع کیا ہے، اسلام میں بخالت بھی قابل مذمت اور قابل نفرت عادت ہے، اسی طرح اسراف و فضول خرچی بھی ممنوع، بلکہ بدترین خصلت ہے، یہاں تک کہ قرآن کریم نے فضول خرچی اور مال کا بے جا استعمال کرنے والوں کو "اخوان الشیاطین" شیطانوں کے بھائی بتلایا ہے۔

﴿ إِنَّ ٱلْمُبَذِّرِينَ كَانُوٓاْ إِخْوَٰنَ ٱلشَّيَٰطِينِ ۖ وَكَانَ ٱلشَّيْطَٰنُ لِرَبِّهِۦ كَفُورًا ﴿٢٧﴾ ﴾ [الإسراء: ٢٧]

"یقین جانو کہ جو لوگ بے ہودہ کاموں میں مال اڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے"۔ [سورۂ اسراء:۲۷]

فضول خرچی کی تباہ کاریاں

تاریخ میں ایسے بہت سارے گھرانوں اور خاندانوں کے قصے محفوظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آباؤ اجداد نے انتھک محنت اور شب و روز کی جد و جہد سے مال و دولت

کمائے، زمینیں اور جائیدادیں خریدیں اور پر شکوہ عمارتیں بنوائیں، تاکہ ان کی نسلیں ان سے فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کی محتاج نہ ہوں؛ لیکن ان کی نالائق اولاد نے اسراف، فضول خرچی اور فخر ومباہات یا شہوت رانیوں میں اس طرح بے تحاشا اور بے دریغ مال اڑائے کہ کچھ ہی دنوں میں سب کچھ ختم کر کے کنگال ہوگئے اور دیکھتے دیکھتے ہی تماشائے اہل کرم دیکھنے لگے۔

فضول خرچی کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں، اس کی وجہ سے انسان، ظلم وزیادتی اور امانت میں خیانت کرنے پر بھی مجبور ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ جو شخص اپنی خواہشات نفس کا غلام بن جاتا ہے، وہ نفس کی دہکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے کہیں سے بھی مال جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ حلال طریقے سے ہو یا حرام، دوسرے کے مال کی طرف دست درازی کرنا، رشوت لینا یا غصب کرنا اور ہر باطل طریقے سے مال اکٹھا کرنا اس کے لیے آسان ہوجاتا ہے۔

فضول خرچی کی بدترین عادت انسان کو خیر اور بھلائی کے کاموں میں مال خرچ کرنے سے بھی روک دیتی ہے؛ کیوں کہ ناجائز مصارف اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ جائز یا دیگر مشروع مصارف کی طرف توجہ بھی نہیں جاتی۔

مؤمن، اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایمان والے کی زندگی بے ایمان کی زندگی کی طرح نہیں ہے، جو اس دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے، جس کے نزدیک پہلی اور آخری فرصت اسی دنیا کا عیش وآرام ہے، آخرت کا تصور اس کے نزدیک ایک وہم اور خیال ہے، ایسے بے ایمانوں

کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا ہے:

﴿ذَرۡهُمۡ يَأۡكُلُواْ وَيَتَمَتَّعُواْ وَيُلۡهِهِمُ ٱلۡأَمَلُۖ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُونَ ۝٣﴾ [الحجر: ۳]

"(اے پیغمبر) انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دو کہ یہ خوب کھالیں، مزے اڑالیں، اور خیالی امیدیں انھیں غفلت میں ڈالے رکھیں، کیوں کہ عنقریب انھیں پتہ چل جائے گا (کہ حقیقت کیا تھی)"۔ [سورۂ حجر: ۳]

ایک مؤمن قطعا ان کی اس روش پہ نہیں چلتا جو دنیا کی راحت وآرام اور لذت وآرائش کو آرزوؤں کی آخری منزل سمجھتے ہیں؛ بلکہ وہ اپنی امیدوں اور دلچسپیوں کو دنیا اور آخرت کے درمیان تقسیم کرتا ہے اور حال ومستقبل دونوں کی بھلائی اور سعادت مندی اللہ سے مانگتا ہے، اسی لیے قرآن کریم نے دنیا اور آخرت دونوں کی خیر وسعادت کی دعا کرنے والوں کی دعا کو اللہ تعالیٰ کا بڑا ذکر بتلایا ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيۡتُم مَّنَٰسِكَكُمۡ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَذِكۡرِكُمۡ ءَابَآءَكُمۡ أَوۡ أَشَدَّ ذِكۡرٗاۗ فَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا وَمَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ خَلَٰقٖ ۝٢٠٠ وَمِنۡهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةٗ وَفِي ٱلۡأٓخِرَةِ حَسَنَةٗ وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ۝٢٠١﴾ [البقرة: ۲۰۰ – ۲۰۱]

"پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا اس طرح ذکر کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔

اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دعا میں بس) یہ کہتے ہیں کہ: "اے ہمارے

پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور انھیں میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ 'اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے'۔" [سورۂ بقرۃ:۲۰۰-۲۰۱]

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قارون کے لیے خیر خواہی اور نصیحت کے تذکرے کے ضمن میں اس امر پر زور دیا ہے کہ آخرت کو تو اپنا مقصد بناؤ، لیکن اس دنیا کی بھلائی اور سعادت کو بھی فراموش نہ کرو، کیوں کہ دنیا کی زندگی آخرت کی کامیابی کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہے، اور وسیلے کی درستگی منزل مقصود کی کامیابی کا پتہ دیتی ہے:

﴿وَٱبْتَغِ فِيمَآ ءَاتَىٰكَ ٱللَّهُ ٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ ٱلدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَآ أَحْسَنَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ ٱلْفَسَادَ فِى ٱلْأَرْضِ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾﴾ [القصص: ۷۷]

"اور اللہ نے تمہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس کے ذریعے آخرت والا گھر بنانے کی کوشش کرو، اور دنیا میں سے بھی اپنے حصے کو نظر انداز نہ کرو، اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی (دوسروں پر) احسان کرو، اور زمین میں فساد مچانے کی کوشش نہ کرو۔ یقین جانو اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ [سورۂ قصص:۷۷]

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے آخرت بنانے اور اس کے لیے تقویٰ اور عمل صالح کی تلقین کے ساتھ دنیاوی لذتوں سے بھی لطف اندوز ہونے کی تعلیم دی ہے، آخرت کی فکر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ دنیا کی حلال چیزوں سے خود کو محروم کر دے، البتہ فضول خرچی،

اسراف اور حدود تجاوز کرنے سے اسلام نے سختی سے منع کیا ہے۔

اسراف کے مظاہر

وضوء ایک عبادت ہے، خوب اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاہم اگر تین تین بار سے زیادہ اعضاء کو دھویا جائے، یا زیادہ پانی استعمال کیا جائے تو اسلام اسے اسراف اور فضول خرچی تصور کرتا ہے۔

حضرت سعدؓ وضو کررہے تھے، پانی کا استعمال زیادہ کررہے تھے، اسی اثناء میں رسولِ اکرم ﷺ کا گزر ہوا، آپؐ نے دیکھ کر فرمایا: «ما هذَا السَّرف؟» یہ کیا اسراف ہورہا ہے؟، حضرت سعد نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وضوء کے وقت زیادہ پانی کا استعمال ہو تو اسے بھی اسراف کہا جائے گا؟ تو حضورؐ نے فرمایا: «نَعم وَلَوْ كنتَ عَلى نَهْرٍ جارٍ» ”ہاں، اگرچہ تم بہتی ہوئی نہر سے ہی وضوء کررہے ہو“۔ [ابن ماجہ]

روشنی وغیرہ کے استعمال میں اسراف

بعض دفعہ ہم اسراف کے گناہ کے مرتکب ہورہے ہوتے ہیں؛ لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا، مثال کے طور پر بجلی کا بیجا استعمال، ضرورت سے زیادہ روشنی جلانا، جلتی ہوئی لائٹیں چھوڑ کر باہر نکل جانا، پنکھے یا ایرکنڈیشنر کو بے ضرورت استعمال کرنا یا انھیں آن کرکے چھوڑے رکھنا جب کہ ان سے مستفید ہونے والا کوئی نہ ہو، اسی طرح مطبخ یا حمام کی روشنی ہر وقت آن رکھنا یا ٹیلی ویژن چلا کر چھوڑ دینا وغیرہ، یہ سب صورتیں اسراف اور فضول خرچی کے ضمن میں آتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللهَ كَرِهَ لَكُمْ ثَلاَثًا: قِيلَ وَقَالَ، وَإِضَاعَةَ المَالِ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ». [بخاري ومسلم]

"اللہ تعالیٰ تمہاری تین چیزیں ناپسند کرتا ہے: بلاوجہ گپ شپ، مال کو برباد کرنا (فضول خرچی کرنا) اور لوگوں سے بہت مانگنا"۔ [بخاری ومسلم]

تقریبات اور دعوتیں

ضرورت کے وقت تقریبات منعقد کرنا یا دعوتوں کا اہتمام کرنا شریعت میں قابل تحسین امر ہے؛ لیکن شریعت نے اعتدال اور توسّط پر ان امور میں بھی زور دیا ہے، حدود کو تجاوز کرنا اور مبالغہ آرائی کے ساتھ ان کا اہتمام کرنا قابل مذمت اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ خورد ونوش کی اشیاء میں ہر وقت "تَفَنُّن" اور "ہل من مزید" کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد ہی پر تکلف کھانے سے شکم سیر ہونا ہے، عام طور پر ایسے لوگ اعلیٰ سطح کی سوچ اور بلند خیالی سے عاری ہوتے ہیں اور مقصد زندگی سے ناواقف ہوتے ہیں یا اسے نظر انداز کر کے زندگی بسر کرتے ہیں۔ رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

«مَا مَلَأَ ابْنُ آدَمَ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنِهِ». [الترمذي]

"آدم کے بیٹے کا اپنے پیٹ کو پُر کرنے سے زیادہ بدترین کسی بھی ظرف کو پُر کرنا نہیں ہے"۔ [الترمذی]

نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑرہا ہے کہ تقریبات اور دعوتوں کی

ہماری فضول خرچی اور مبالغہ آرائی ضَربُ المَثَل بن چکی ہے، جس دین نے سادگی اور اعتدال پسندی کی ہر معاملے میں تعلیم دی ہے، اسی دین کے نام لیوا اپنی تقریبات میں اس تعلیم کو یکسر نظر انداز کردیتے ہیں، اسراف اور فضول خرچی کی، نمائش اور زیبائش کی ساری حدیں پار کرجاتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ جو لوگ بڑے بڑے شادی ہالوں اور معروف و مشہور ہوٹلوں میں تقریبات منعقد کرنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتے وہ یا تو جائیدادیں فروخت کرکے یا دوسروں سے قرض لے کر اس "معاشرتی نمائش" کی تکمیل کرتے ہیں، پھر اس قرض کی ادائیگی کے لیے پریشان رہتے ہیں، ذلیل ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ جب قرض خواہوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے تو کورٹ کے ذریعہ قید خانوں میں محبوس کیے جاتے ہیں۔

ملبوسات میں اسراف

لباس اور پوشاک کے سلسلے میں بھی اسلامی تعلیمات واضح ہیں، اسلام نے یہاں بھی میانہ روی کا حکم دیا ہے، خوب صورت اور قیمتی لباس پہننے سے منع نہیں کیا، بلکہ اسلام نے جمالیات کے پہلو کو فروغ دیا ہے، اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں، اچھے لباس پہننے کی استطاعت کے باوجود معیوب اور گھٹیا لباس کا استعمال حقیقت میں اللہ کی نعمت کی ناشکری کا اشارہ دیتا ہے۔

ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوے جن کے جسم پر نہایت معمولی اور پراگندہ لباس تھا، حضور ﷺ نے دیکھ کر دریافت فرمایا: "کیا تمہارے پاس مال و دولت ہے؟" انھوں نے عرض کیا: جی ہے، آپؐ نے فرمایا: "کون سا مال ہے؟" عرض کیا کہ اللہ

نے ہر طرح سے نوازا ہے: اونٹ، بکریاں، گھوڑے اور خدمت گزار سب ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا:

«فَإِذَا آتَاكَ اللهُ مَالًا فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ، وَكَرَامَتِهِ».

[أبو داؤد و أحمد]

”جب اللہ نے تمہیں مال سے نوازا ہے تو اس کے تم پر انعام واکرام کے آثار بھی نظر آنے چاہئیں“۔[ابوداؤد واحمد]

دینِ اسلام، لباس کے سلسلے میں انسانی فطرت اور اس کی خواہش کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے صاف ستھرے اور عمدہ سے عمدہ اور نفیس لباس پہننے کو جائز ٹھہراتا ہے؛ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کوئی شخص اپنے جسم کو فیشن شو کا مرکز بنالے اور اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہن کر اتراتا ہوا، اکڑتا ہوا چلے اور لوگوں کی مدح سرائی کا منتظر رہے، عام طور پر اس طرز فکر کے لوگ ظاہری چمک دمک میں ایسے مشغول ہوجاتے ہیں کہ اندرونی اور باطنی کمالات پیدا کرنے کی انھیں فرصت ہی نہیں ہوتی، بلکہ متوسط درجے کے لوگ یا قدرتی طور پر ادنیٰ درجے کے لوگ باطنی کمالات کے ایسے معیار پر پہنچ جاتے ہیں کہ خالق کائنات بھی ان کی فریاد رد نہیں کرتا، حدیث پاک میں ہے:

«كَمْ مِنْ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِيْ طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ ...». [الترمذي]

”کتنے ہی پراگندہ بال، غبار آلود اور پرانے کپڑے والے ہیں کہ جن کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، اگر وہ اللہ پہ بھروسہ کرکے قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری کردے“۔[ترمذی شریف]

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ باطنی کمالات پیدا کرنا چاہتے ہیں یا اعلیٰ ترین فکر ونظر کے حامل ہوتے ہیں اور قوم وملت کے لیے سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں، انھیں ظاہری آراستگی پر فضول خرچی یا مبالغہ آرائی کی فرصت اور اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

گھروں کی سجاوٹ میں سادگی

گھروں اور کمروں کی سجاوٹ اور ڈیکوریشن سے اسلام نے منع نہیں کیا ہے؛ لیکن ان پر بے جا خرچ اور اسراف سے منع کیا ہے، بقدر ضرورت، معقول اور مقبول حد تک سجاوٹ کی گنجائش ہے، لیکن مبالغہ اور حدود تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن کا سربراہ بنا کر بھیجا تو منجملہ وصیتوں کے ایک وصیت یہ بھی فرمائی تھی:

«إِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ، فَإِنَّ عِبَادَ اللهِ لَيْسُوا بِالْمُتَنَعِّمِينَ». [أحمد]

”خبردار! عیش پرستی سے دور رہنا، کیوں کہ اللہ کے (حقیقی) بندے عیش پرست نہیں ہوتے“۔ [احمد]

اسلام یہ چاہتا ہے کہ امت مسلمہ کے فرد اور جماعت سے تعیُّش پسندی کے مزاج کی جڑیں اکھیڑ ڈالے، ہر فرد اور ہر جماعت کی زندگی ایک طاقت ور فوجی اور بہادر سپہ سالار کی طرح ہو، اعلائے کلمۃ اللہ، اپنی ملت اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت تیار رہے، بلکہ کاربند رہے، اور یہ مجاہدانہ مزاج تعیش پسندی اور بہت ناز ونعمت میں پرورش پا کر پیدا نہیں ہوسکتا، اس کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں توسط اور اعتدال لانا ہوگا ـــــــ قرآن کریم نے عباد الرحمن کے جو اَوصاف بیان کیے ہیں ان میں یہ بھی ہے:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُواْ لَمۡ يُسۡرِفُواْ وَلَمۡ يَقۡتُرُواْ وَكَانَ بَيۡنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ۝٦٧ ﴾ [الفرقان: ٦٧]

”اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں؛ بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے“۔[سورۂ فرقان:۶۷]

خلاصۂ گفتگو

اسلام کے اعتدال پسند اور متوازن مزاج میں سراسر حکمتیں ہی حکمتیں ہیں، میانہ روی کی متعدّد حکمتوں اور مصلحتوں میں سے ایک عظیم حکمت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مال ودولت کو تحفظ ملتا ہے جس مال کو اللہ تعالیٰ نے ﴿جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمۡ قِيَٰمًا﴾ ”زندگی کا سرمایہ اور زندگی کا ذریعہ“ بتلایا ہے، کیوں کہ فضول خرچی اور اسراف کی وجہ سے اس نعمت کو زوال آجاتا ہے، میانہ روی کی وجہ سے پائیداری نصیب ہوتی ہے، جب کہ اسراف کی وجہ سے تباہی اور بربادی مقدر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَمۡ أَهۡلَكۡنَا مِن قَرۡيَةِۭ بَطِرَتۡ مَعِيشَتَهَاۖ فَتِلۡكَ مَسَٰكِنُهُمۡ لَمۡ تُسۡكَن مِّنۢ بَعۡدِهِمۡ إِلَّا قَلِيلٗاۖ وَكُنَّا نَحۡنُ ٱلۡوَٰرِثِينَ ۝٥٨ ﴾ [القصص: ٥٨]

”اور کتنی ہی بستیاں وہ ہیں جو اپنی معیشت پر اتراتی تھیں، ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا، اب وہ ان کی رہائش گاہیں تمہارے سامنے ہیں، جو ان کے بعد تھوڑے عرصے کو چھوڑ کر کبھی آباد ہی نہ ہو سکیں، اور ہم ہی تھے جو ان کے وارث بنے“۔

[سورۂ قصص:۵۸]

اسی طرح جن لوگوں نے دنیاوی زندگی کو ابتدا اور انتہا سمجھ لیا، یہیں اپنی تمام تر خواہشات اور لذاتِ نفسانی کی تکمیل میں کوشاں رہے، آخرت کے تصور سے، حساب وکتاب کے عقیدے سے اور جنت وجہنم کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ خدائے پاک نے قیامت کے دن کی ان کی بدحالی کا نقشہ قرآن کریم میں یوں کھینچا ہے:

﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ عَلَى ٱلنَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَٰتِكُمْ فِى حَيَاتِكُمُ ٱلدُّنْيَا وَٱسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿٢٠﴾﴾ [الأحقاف: ٢٠]

”اور اس دن کو یاد رکھو جب ان کافروں کو آگ کے سامنے پیش کیا جائے گا (اور کہا جائے گا:) تم نے اپنے حصے کی اچھی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں ختم کرڈالیں اور ان سے خوب مزہ لے لیا، لہٰذا آج تمہیں بدلے میں ذلت کی سزا ملے گی؛ کیوں کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے، اور کیوں کہ تم نافرمانی کے عادی تھے“۔

[سورۂ احقاف:۲۰]

لہٰذا میانہ روی اور اعتدال پسندی کی عادت ڈالیے، اپنی آمدنی اور خرچ میں توازن پیدا کیجیے، چادر میں جتنی گنجائش ہو اسی کے بقدر پاؤں پھیلائیے، ورنہ پاؤں ننگا ہو جائے گا، اگر آمدنی زیادہ بھی ہو تب بھی ہر گوشۂ حیات میں بیچ بیچ کی راہ اختیار کیجیے۔

﴿وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾﴾

[الأعراف: ٣١]

”اور کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو— یاد رکھو کہ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا“۔ [سورۂ اعراف:۳۱]

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کیجیے، ناقدری سے نعمتیں چھن جاتی ہیں—

ام المؤمنین حضرت میمونہؓ نے زمین پر انار کا ایک دانہ گرا ہوا پایا تو اسے اٹھالیا اور کہا:

«إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ» "بلاشبہ اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند فرماتے ہیں"۔

یہ ہرگز نہ بھولیں کہ قیامت کے روز تمام نعمتوں کے بارے میں ہم سے سوال کیا جائے گا۔

﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ ٱلنَّعِيمِ ۝٨ ﴾ [التكاثر: ٨]

"پھر تم سے اس دن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا (کہ ان کا کیا حق ادا کیا)۔ [سورۂ تکاثر:۸]

❊ ❊ ❊

۱۴۳۰/۲/۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غصہ — اسباب ونتائج اور علاج

«لَا تَغْضَبْ» غصہ نہ کرو

ایک صحابیؓ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے وصیت فرمائیں! آپؐ نے فرمایا: «لَا تَغْضَبْ»، یعنی غصہ مت کرو، انھوں نے بار بار استفسار کیا اور حضورؐ نے ہر بار ایک ہی جواب عنایت فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔ [بخاری]

دوسری روایت میں ہے کہ صحابی نے یہ بھی عرض کیا کہ آپ وصیت فرمائیں، لیکن مختصر ہو، کیوں کہ لمبی باتیں میں یاد نہیں رکھ پاتا، چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں غصہ نہ کرنے کی وصیت فرمائی۔ [مسند احمد]

غصہ نہ کرنے کا مطلب محدثین نے بیان فرمایا ہے کہ غصے کے اسباب سے ہی بچنے کی کوشش کرو، یا غصہ آجائے تو اس کی وجہ سے بھڑکنے، مُنفَعِل ہونے اور اس کا اثر ظاہر کرنے سے پرہیز کرو، یعنی اگر غصہ آہی جائے تو اس کو تقوے کی لگام دو، کوئی احمقانہ حرکت نہ کر بیٹھو جس کی وجہ سے پچھتانا پڑے اور کفِ افسوس ملنا پڑے۔

امام جردانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث رسولِ اکرم ﷺ کے "جوامع الکلم"

میں سے ہے، کیوں کہ صرف ایک کلمے میں دنیا اور آخرت کی بھلائیاں جمع کر دی گئی ہیں۔

ایک ایمان والے کی یہی شان ہونی چاہیے، اوّلاً تو وہ ان اسباب سے بچنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے غصہ آتا ہے، اور اگر غصہ آ ہی جائے تو اپنی زبان اور ہاتھ پر قابو رکھے، زبان سے خیر کے سوا کوئی بات نہ کہے اور ہاتھوں کو بھلائی کے علاوہ کہیں استعمال نہ کرے۔

غصہ پینے کے فوائد

ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو گالی دی، برا بھلا کہا، حالاں کہ رسول اکرم ﷺ بھی وہیں تشریف فرما تھے، اس کی گالی سن کر حضرت ابوبکرؓ خاموش رہے، غصے پہ قابو رکھا، یہ دیکھ کر حضورؐ مسکرا رہے تھے، جب اس شخص نے حد کر دی تو حضرت ابوبکرؓ سے رہا نہ گیا اور انھوں نے بھی جواب میں کچھ فرمایا۔ ان کی بات سن کر حضورؐ مجلس سے کھڑے ہو کر جانے لگے تو حضرت ابوبکرؓ دوڑے ہوے حضورؐ کے قریب گئے اور عرض کیا کہ اس شخص نے مجھے گالی دی تو میں خاموش رہا اور آپ بھی بیٹھے رہے، لیکن جب میں نے بولنا شروع کیا تو آپ اٹھ گئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

> ”جب تم خاموش تھے تو فرشتہ تمہاری طرف سے اس شخص کو جواب دے رہا تھا، لیکن جب تم نے بولنا شروع کیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آکر بیٹھ گیا، لہٰذا اب مجھے شیطان کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ ہوا“۔ [مسند احمد]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے برا بھلا کہنا شروع کر دیا، دوسرا شخص اس کی گالی سن کر ”علیک السلام“ کہتا رہا، (وہ

دراصل قرآن کی اس آیت پہ عمل کر رہا تھا:

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلْجَٰهِلُونَ قَالُوا۟ سَلَٰمًا ﴿٦٣﴾﴾

[الفرقان: ٦٣]

”یعنی رحمن کے بندوں کا ایک وصف یہ ہے کہ جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کرتے ہیں۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«أَمَا إِنَّ مَلَكًا بَيْنَكُمَا يَذُبُّ عَنْكَ، كُلَّمَا يَشْتُمُكَ هَذَا قَالَ لَهُ: بَلْ أَنْتَ، وَأَنْتَ أَحَقُّ بِهِ، وَإِذَا قَالَ لَهُ: عَلَيْكَ السَّلَامُ، قَالَ: لَا بَلْ لَكَ أَنْتَ، أَنْتَ أَحَقُّ بِهِ». [مسند أحمد]

”خبردار! بیشک تمہارے درمیان ایک فرشتہ ہے، جو تیری طرف سے دفاع کرتا ہے، وہ آدمی جب بھی تجھے برا بھلا کہتا ہے تو وہ فرشتہ اس کو کہتا ہے: (وہ نہیں) بلکہ تم، اور تم ہی اس گالی کے زیادہ حق دار ہو۔ اور جب مظلوم کہتا ہے: تم پر سلامتی ہو تو وہ فرشتہ کہتا ہے: نہیں، بلکہ یہ سلامتی تمہارے لیے ہے، اور تم ہی اس کے زیادہ مستحق ہو“۔ [مسند احمد]

غصے پہ قابو رکھنا قابل ستائش وصف ہے، کیوں کہ اگر غصے کو تقویٰ کے ذریعہ قابو میں نہ رکھا جائے اور اسے اصول وآداب کے دائرے میں نہ رہنے دیا جائے جس کے پیش نظر اللہ کا خوف، اس کی رضا کی طلب اور اجر و ثواب کی امید ہو——تو یہ غصہ ایک مہلک بیماری ہے جس کا بدترین اور حسرت ناک انجام ہوتا ہے۔

غصے کی دو قسمیں

ہر طرح کا غصہ قابل مذمت اور ملامت نہیں ہے، بلکہ بعض دفعہ برہم ہونا اور غصہ کرنا شرعانہ صرف جائز ہوتا ہے بلکہ مطلوب اور مستحسن ہوتا ہے، اسی لیے غصے کی دو قسمیں کی گئی ہیں:

(۱) ایک وہ جو ممدوح اور مطلوب ہے۔

(۲) دوسرا وہ جو مذموم اور برا ہے۔

اگر اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا جائے، اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا جائے، کلامِ الٰہی کی توہین کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو نشانہ بنایا جائے اور اسلامی مقدسات پر ناجائز اور غاصبانہ قبضہ ہو رہا ہو تو ایمانی غیرت اور اسلامی حمیّت کا تقاضا ہے کہ ناراضگی، برہمی اور غم وغصے کا اظہار کیا جائے؛ تاہم یہ خیال ضرور رہے کہ غیظ وغضب کے جوش میں دانشمندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، اس غصے کی قیادت عقل وخرد اور حکمت ودانائی کے ہاتھوں میں ہو، کیوں کہ انسان جب شدید غضبناک ہوتا ہے اور دانائی اور سنجیدگی کھو بیٹھتا ہے تو معاملہ فہمی کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوجاتی ہیں جو ذلت ورسوائی یا حسرت وافسوس کا سبب بن جاتی ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا حالات میں غصہ کرنا مطلوب ہے، لیکن عقل ودانائی اور ہوش وحواس پہ پوری طرح قابو رکھتے ہوئے۔

غصے کی دوسری قسم وہ ہے جو مذموم ہے، یہ وہ غصہ ہے جو اپنے نفس کے لیے ہو، کوئی شخص اپنی توہین محسوس کرے، یا اس کے اپنے تصور وخیال کے مطابق اس کا احترام نہ

کیا گیا ہو، یا استقبال نہ کیا گیا ہو، یا خاطر تواضع نہ کی گئی ہو یا اسی طرح کے کسی اور سبب سے بھڑک اٹھے، غضبناک ہوجائے پھر دست وزبان بھی بے قابو ہوجائے تو بلاشبہ یہ غصہ قابل مذمت ہوگا۔

محض غصے کا آنا قابل مذمت نہیں

غصہ دراصل انسان کی فطرت میں شامل ہے، کسی بھی غضب انگیز چیز کی وجہ سے اگر کوئی شخص متأثر ہو اور اسے غصہ آجائے تو یہ بذاتِ خود مذموم نہیں، البتہ غصہ اپنے آثار ونتائج کے اعتبار سے بھلا یا برا ہوجاتا ہے، اگر انسان اس غصے کو پی جائے، برداشت کرلے اور نامعقول حرکت نہ کر بیٹھے تو یہ غصہ قابل تعریف ہوگا؛ لیکن اگر غصے کی شدت اتنی بڑھ جائے کہ انسان اپنے جذبات پر بے قابو ہوکر احمقانہ حرکت کر بیٹھے تو یقیناً یہ غصہ برا اور قابل مذمت ہوگا، اسی وجہ سے جو شخص غصے کی حالت میں جلدبازی اور طیش میں آکر ناروا سلوک انجام دے بیٹھتا ہے اسے عربی میں ''احمق مُتَہَوِّر'' یعنی بے قوف اور جلد باز کہتے ہیں، جب کہ غصے کو پی جانے والے یا اس کے عواقب کو سوچ کر سنجیدگی کا مظاہرہ کرنے والے کو ''حلیم'' یعنی بردبار کہا جاتا ہے۔ یہ حِلم ان اخلاقِ کریمانہ میں سے ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو محبوب ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت اشجؓ عبدالقیس رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا:

«إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ: الْحِلْمُ، وَالْأَنَاةُ». [مسلم]

''بیشک تمہارے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں: ایک حِلم (بردباری) دوسری سنجیدگی''۔ [مسلم شریف]

ایک اور روایت میں ہے:

«إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ، وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ». [مسلم]

"اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے اور نرمی کرنے والے کو پسند فرماتا ہے، اور نرمی کی بنا پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو سختی کی بنا پر نہیں عطا کرتا، اور اس کے علاوہ کسی اور بات پر بھی اتنا عطا نہیں فرماتا"۔ [مسلم شریف]

لہٰذا شریعت نے اگر کسی کو غصہ کرنے سے منع کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غصے کے اسباب سے دور رہے یا غصہ آجائے تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہیجانی اور شیطانی کیفیات سے بچے، بلکہ اس غصے کی باگ ڈور اپنی عقل ودانش کو سونپ دے جو شریعت کے دائرے میں اس کی رہنمائی کرے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو مستحضر رکھے جس میں اس نے غصہ پینے والے کی مدح سرائی فرمائی ہے اور اس وصف کو ان متقیوں کا وصف بیان فرمایا ہے جو جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿وَسَارِعُوٓاْ إِلَىٰ مَغۡفِرَةٖ مِّن رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ أُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِينَ ﴿١٣٣﴾ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي ٱلسَّرَّآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَٱلۡكَٰظِمِينَ ٱلۡغَيۡظَ وَٱلۡعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاسِۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿١٣٤﴾﴾ [آل عمران: ١٣٣ - ١٣٤]

"اور اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور جنت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھاؤ جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں تمام آسمان اور زمین سما جائیں — وہ ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوش حالی میں بھی اور

بدحالی میں بھی (اللہ کے لیے) مال خرچ کرتے ہیں، اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کردینے کے عادی ہیں۔ اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے“۔

[سورۂ آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جاہلوں کی جاہلانہ حرکتوں پر درگزر کرنے اور ان سے دور رہنے کا حکم دیا ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾ ﴾

[الأعراف: ١٩٩]

”آپ درگزر کو اختیار کریں، نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجائیں“۔ [سورۂ اعراف: ۱۹۹]

حضرت عمرؓ کے غصے کی حرارت کو قرآن کی آیت نے ٹھنڈا کردیا

صحیح بخاری میں یہ قصہ درج ہے کہ عیینہ بن حصن بن حذیفہ نے (جو نہایت تند مزاج اور اپنی قوم کے سردار تھے) اپنے بھتیجے حُر بن قیس کے یہاں آکر قیام کیا۔ حُر، ان چند خاص لوگوں میں سے تھے جنھیں حضرت عمرؓ اپنے بہت قریب رکھتے تھے، جو لوگ قرآن کریم کے زیادہ ماہر اور قاری ہوتے تھے، حضرت عمرؓ کی مجلس میں انھیں کو زیادہ نزدیکی حاصل ہوتی تھی اور ایسے لوگ آپ کے مشیر ہوتے تھے، اس کی قید نہیں ہوتی تھی کہ وہ عمر رسیدہ ہوں یا نوجوان —— عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ تمہیں اس امیر کی مجلس میں بہت نزدیکی حاصل ہے، میرے لیے بھی مجلس میں حاضری کی اجازت لے لو، حر بن قیس نے کہا کہ میں آپ کے لیے بھی حاضری کی اجازت لے لوں گا —ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ انھوں نے

عیینہ کے لیے مجلس میں حاضری کی اجازت مانگی اور حضرت عمرؓ نے انھیں حاضری کی اجازت دے دی، مجلس میں جب وہ پہنچے تو کہنے لگے: اے خطاب کے بیٹے! اللہ کی قسم! نہ تو تم ہمیں پورا مال دیتے ہو اور نہ عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہو، حضرت عمرؓ کو ان کی اس بات پر بڑا غصہ آیا اور آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ حُر بن قیس نے عرض کیا: یا امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے خطاب کرکے فرمایا ہے:

﴿ خُذِ ٱلۡعَفۡوَ وَأۡمُرۡ بِٱلۡعُرۡفِ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡجَٰهِلِينَ ١٩٩ ﴾

[الأعراف: ١٩٩]

”آپ درگزر کو اختیار کریں، نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجائیں“۔[سورۂ اعراف:۱۹۹]

اور یہ بھی جاہلوں میں سے ہیں، اللہ کی قسم جب حُر نے قرآن مجید کی تلاوت کی تو عمرؓ بالکل ٹھنڈے پڑ گئے، اور کتاب اللہ کے حکم کے سامنے ان کی یہی حالت ہوتی تھی۔

ایک مسلمان کی یہی شان ہونی چاہیے، نادان اور جاہلوں کی باتوں کا اثر نہ لے، اس طرح کی باتوں پر اپنی فکر ونظر کو مرکوز کرنے کے بہ جائے ان سے بالاتر سلوک اور رویہ اختیار کرکے ان سے درگزر کرے اور ان سے اعراض کرے اور سُنی اَن سُنی کردے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا حِلم

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ جس وقت خلیفہ تھے اور امیر المؤمنین تھے، ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان پر برسنے لگا، بہت سخت گوئی سے پیش آیا، حضرت عمر نے سر جھکا کر تھوڑا سا غور وفکر کرنے کے بعد سر اٹھایا اور فرمایا:

«أَرَدْتَ أَنْ يَسْتَفِزَّنِي الشَّيْطَانُ، بِعِزِّ السُّلْطَانِ فَأَنَالُ مِنْكَ الْيَوْمَ مَا تَنَالُ مِنِّي غَدًا».

"تم نے چاہا کہ شیطان مجھے سلطنت کے غرور میں مبتلا کرکے اس پر آمادہ کرے کہ آج میں تم سے انتقام لے لوں جس کے نتیجے میں کل (قیامت کے دن) تم آکر مجھ سے اپنا بدلہ لے لو"۔

ایک بدزبان شخص نے انھیں کہا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم فُسّاق میں سے ہو"، تو انھوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: "تمھاری گواہی قابل قبول نہیں"۔

امام شعبیؒ کو ایک شخص نے گالی دی تو بہ جائے اس کے کہ اس سے انتقام لیتے یا اسے برا بھلا کہتے، کہنے لگے:

"اگر تم سچے ہو تو اللہ میری مغفرت فرمائے اور اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تمھاری مغفرت فرمائے"۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے نفوس کی کبریائی اور بڑائی کو مٹا دیا تھا، اس لیے ان کے لیے غصے کو پینا آسان ہو گیا تھا، یہی حقیقی قوت کی علامت ہے کہ شدید غصے کی حالت میں یا غصے پہ آمادہ کیے جانے کی صورت میں اپنے نفس اور غصے پہ قابو ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الغَضَبِ». [متفق عليه]

"طاقت ور وہ نہیں جو (مد مقابل) کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقت ور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پہ قابو رکھے"۔ [متفق علیہ]

مؤمن اپنے نفس کے لیے برہم نہیں ہوتا، بلکہ ضبطِ نفس کی کوشش کرتا ہے، بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک لفظ بھی اپنے خلاف کہیں سن لیا تو اس کے لیے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، صرف ایک لفظ کی وجہ سے دل کینے کی آگ میں جلنے لگتا ہے، پھر اس ایک لفظ کی وجہ سے انتقام کی ساری تدبیریں اختیار کرلیتے ہیں، صبح سے شام تک محض اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح بدلہ لے سکیں، بعض دفعہ اس ایک لفظ کو بنیاد بنا کر سال ہا سال بات چیت بند رکھتے ہیں —— حالاں کہ نفس کے تقاضے کو پورا کرنا اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اپنے بھائی سے منھ پھیر لیا جائے، یا جنگ وجدال کی نوبت آجائے۔ اس دنیا کی زندگی ہے ہی کتنی لمبی؟ اس دنیا کی قیمت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، پھر اس کو یا نفس کو ”انا“ کا مسئلہ بنالینا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

غصّے کا علاج

غصہ انسان کے اوپر بعض مرتبہ اتنا زوردار اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو معطّل کردیتا ہے اور اسے احمقانہ، بلکہ ظالمانہ اور مجنونانہ حرکتیں انجام دینے پر مجبور کردیتا ہے۔ اسی طرح غصہ، انسان کی صحت وتندرستی کے لیے بھی نہایت نقصان دہ ہے، کیوں کہ بار بار شدید غصے کے نتیجے میں کئی طرح کے امراض پیدا ہوتے ہیں جن کی تلافی مشکل ہوتی ہے؛ اس لیے رسول اکرم رحمت للعالمین ﷺ نے غصے کے متعدّد علاج بیان فرمائے۔

سلیمان بن صُردؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں

دیکھا کہ دو شخص آپس میں گالم گلوج کررہے ہیں، ان میں سے ایک شخص کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہوگیا اور گلا پھول گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ، لَوْ قَالَ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ، ذَهَبَ مِنْهُ مَا يَجِدُ». [متفق عليه]

''بیشک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جسے اگر وہ کہتا تو اس کا غصہ ختم ہوجاتا، اگر وہ ''اعوذ باللہ من الشیطان'' کہتا تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا''۔[متفق علیہ]

دوسری روایت میں ہے:

«إِنَّ الغَضَبَ جَمْرَةٌ فِي قَلْبِ ابْنِ آدَمَ، أَمَا رَأَيْتُمْ إِلَى حُمْرَةِ عَيْنَيْهِ وَانْتِفَاخِ أَوْدَاجِهِ، فَمَنْ أَحَسَّ بِشَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ فَلْيَلْصَقْ بِالأَرْضِ». [رواه الترمذي]

''تم جان لو! غصہ آدمی کے دل میں ایک چنگاری ہے، کیا تم غصہ ہونے والے کی آنکھوں کی سرخی اور اس کی گردن کی رگوں کو پھولتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ لہٰذا جس شخص کو غصے کا احساس ہو وہ زمین سے چپک جائے ''یعنی بیٹھ جائے)۔[ترمذی شریف]

ایک اور روایت میں ہے:

«إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ، وَإِنَّمَا تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ، فَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ» [أبوداؤد]

رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''غصہ شیطان کے سبب پیدا ہوتا ہے، اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، لہٰذا تم میں سے کسی کو جب غصہ آئے تو وضو کرلے''۔[ابوداود شریف]

ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ، فَإِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ، وَإِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ».

"جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، لہٰذا اگر غصہ ختم ہوجائے (تو بہتر ہے) ورنہ لیٹ جائے"۔

مذکورہ بالا روایتوں میں غصے کے کئی علاج بتائے گئے ہیں؛ ایک یہ ہے کہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھ لے۔ دوسرے یہ کہ اپنی ہیئت تبدیل کر دے، یعنی اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور اگر بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ تیسرے یہ کہ وضو کر لے، کیونکہ غصہ کی آگ دراصل شیطان کی بھڑکائی ہوئی ہوتی ہے، اور وہ آگ سے ہی پیدا کیا گیا ہے، اور آگ کو پانی بجھاتا ہے، اس لیے وضو یا غسل کے ذریعے غصہ کی آگ بجھائی جا سکتی ہے۔

اسی طرح جب غصہ آئے تو غصہ پینے کے اجر و ثواب اور فضائل کو بھی یاد کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَٱلَّذِينَ يَجۡتَنِبُونَ كَبَٰٓئِرَ ٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡفَوَٰحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُواْ هُمۡ يَغۡفِرُونَ ﴿٣٧﴾ ﴾ [الشورى: ٣٧]

"اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو درگزر سے کام لیتے ہیں"۔ [سورۂ شوریٰ: ۳۷]

رسول اکرم ﷺ کے حلم اور بردباری کو یاد کر کے اتباعِ سنت میں اپنے غصے پہ قابو رکھے اور اللہ کی رضا کے لیے اسے پی جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی حرمتوں کی پامالی کے وقت غصہ کرنا اور دانشمندی کے

ساتھ اس کے بموجب عمل کرنا مطلوبِ شرع ہے، البتہ اپنے نفس کے لیے غصہ کرنا مذموم ہے، اگر غصہ آجائے تو اسے پینے کی کوشش کی جائے اور جو علاج شریعت نے بتلائے ہیں ان کے ذریعہ علاج کیا جائے تاکہ غصے کی وجہ سے ہونے والے دینی اور دنیوی نقصانات سے بچا جاسکے۔

* * *

۲۷/۷/۱۴۳۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رنج وغم ـــــــ ایک جائزہ اور حل

رنج وغم کے سلسلے میں دو نظریے

ہم میں سے ہر ایک کے دل ودماغ میں کوئی نہ کوئی فکر اور سوچ ضرور ہوتی ہے، بلکہ مختلف اور متعدّد افکار ہوتے ہیں، بعض دفعہ یہ افکار اتنی شدت کے ساتھ دل ودماغ پر حاوی ہوجاتے ہیں کہ انسان کو بیمار بنادیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ High Tension کی وجہ سے یہ بیماری رونما ہوئی ہے، اس دنیا کی سرشت میں یہ ہموم وغموم، الجھنیں اور پریشانیاں داخل ہیں، البتہ ان تفکرات کے محور کے سلسلے میں دو طرح کے نظریات ہیں، ایک اسلامی نقطۂ نظر ہے، دوسرا غیر اسلامی یا خالص مادی نقطۂ نظر۔ اس غیر اسلامی یا مادّی نظریہ کے اعتبار سے ان کی فکروں کا محور ومرکز صرف یہ دنیا اور یہاں کی زندگی ہے، اول اور آخر سب کچھ یہی ہے:

﴿وَقَالُوٓاْ إِنۡ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا ٱلدُّنۡيَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوثِينَ ﴿٢٩﴾﴾

[الأنعام: ۲۹]

”اور وہ یوں کہتے ہیں: جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے، اور ہم مرکر دوبارہ

زندہ نہیں کیے جائیں گے‘‘۔[سورۂ انعام:۲۹]

اسلامی نقطۂ نظر سے چوں کہ ہر انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ تُبْعَثُونَ ﴿١٦﴾ ﴾ [المؤمنون: ١٦]

’’پھر قیامت کے دن تمہیں یقیناً زندہ کیا جائے گا‘‘۔[سورۂ مؤمنون:۱۶]

اس لیے ایک مسلمان کی فکر ونظر کا محور اس دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی ہے، بلکہ آخرت ہی اصل ہے، تاہم ان دونوں جہانوں کی خیر و بھلائی اور اصلاح کی فکر کرنا اور دونوں جگہوں میں سعادت وراحت کے لیے سامان مہیا کرنا اور اس کے لیے اللہ سے دعا کرنا شرعاً مطلوب ہے، اسی لیے ایک مسلمان یوں کہتا ہے:

﴿ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْـَٔاخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿٢٠١﴾ ﴾ [البقرة: ٢٠١]

’’اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے‘‘۔[سورۂ بقرۃ:۲۰۱]

رسول اکرم ﷺ سے منقول دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے:

«اللهُمَّ أَصْلِحْ لَنَا دِيْنَنَا الَّذِي هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِنَا، وَأَصْلِحْ لَنَا دُنْيَانَا الَّتِي فِيهَا مَعَاشُنَا، وَأَصْلِحْ لَنَا آخِرَتَنَا الَّتِي إِلَيْهَا مَعَادُنَا، وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لَنَا فِي كُلِّ خَيْرٍ، وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لَنَا مِنْ كُلِّ شَرٍّ». [مسلم]

’’اے اللہ! تو ہمارے دین کو درست کردے جو ہمارے ہر کام کی حفاظت کا

ذریعہ ہے، اور ہمارے لیے ہماری دنیا کو درست کردے، جس میں ہمیں زندگی بسر کرنا ہے، اور ہمارے لیے ہماری آخرت کو درست فرمادے جہاں ہمیں لوٹ کر جانا ہے اور ہماری زندگی کو ہر اچھے کام میں زیادتی کا ذریعہ بنادے اور موت کو ہمارے لیے ہر شر سے نجات کا ذریعہ بنادے"۔ [مسلم شریف]

دنیا اور آخرت کی فکروں کے درمیان توازن

مسلمان، دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیوں کے لیے تگ ودو کرتا ہے اور دونوں کے لیے فکر مند بھی رہتا ہے؛ لیکن ان میں توازن رکھنا بھی ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ فکر جہاں میں اس قدر مشغول اور منہمک ہوجائے کہ آخرت کو بھول جائے، دنیاوی ہموم وغموم میں اخروی ہموم وغموم کو فراموش کردے؛ بلکہ اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آخرت کے غم اور فکر وسوچ کو دنیا کے غم پر غالب رکھے، کیوں کہ دنیا عارضی ہے اورآخرت دائمی ہے، دنیا فانی ہے اور آخرت جاودانی ہے۔ اگر فکر آخرت غالب ہوجائے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ اسی کو حضور ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

«مَنْ جَعَلَ الْهُمُومَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهِ كَفَاهُ اللهُ هَمَّ دُنْيَاهُ، وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُومُ فِي أَحْوَالِ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللهُ فِي أَيِّ أَوْدِيَتِهَا هَلَكَ». [رواه ابن ماجه]

"جس نے اپنی تمام تر سوچوں کو ایک سوچ یعنی آخرت کی سوچ بنالیا، تو اللہ اس کے دنیاوی غموں کے لیے کافی ہوگا، اور جس کی تمام تر فکریں دنیاوی امور میں بکھر گئیں، تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوجائے"۔ [ابن ماجہ شریف]

ایک دوسری روایت میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَتِ الآخِرَةُ هَمَّهُ، جَعَلَ اللهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ، وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ، وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ، وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ، جَعَلَ اللهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ، وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ، وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلاَّ مَا قُدِّرَ لَهُ». [الترمذی وأبوداؤد]

”جس کی فکر و سوچ کا محور آخرت ہو، اللہ اس کے دل میں استغناء پیدا کر دیتا ہے، اور اسے دل جمعی عطا کرتا ہے (اس کے بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹ کر سکون دل عطا فرماتا ہے) اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے۔ اور جس کا مقصود زندگی اور فکر و نظر کا مرکز صرف دنیا طلبی ہو تو اللہ اس کی محتاجی اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس کی سمٹی ہوئی چیزوں کو بکھیر کر پریشان کر دیتا ہے، اور دنیا اس کے پاس اتنی ہی آتی ہے جتنی اس کے مقدر میں ہوتی ہے“۔ [ترمذی، ابوداؤد]

اب ہمیں خود اپنا محاسبہ کرنا ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک ہم کس کے غم اور کس کی فکر میں اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں صرف کرتے ہیں، ہمارے دل و دماغ اور تمام اعصاب پر کس طرح کے تفکرات سوار رہتے ہیں؟ اگر صحیح توازن نہیں ہے تو پھر توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

اپنے فکری رجحان کو کیسے معلوم کریں

اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ دنیا اور آخرت، دونوں میں سے کس کی اہمیت اس کے نزدیک زیادہ ہے اور کس کی فکر غالب اور کس کی مغلوب ہے تو اپنے حالات کا خود

ہی جائزہ لے: سونے سے قبل، بیدار ہوتے وقت، نمازوں کے درمیان، صبح و شام، شب و روز چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کس سوچ میں رہتا ہے؟ خوشی اور غمی کے پیچھے کیا راز ہے؟ کس چیز سے غصہ ہوتا ہے اور کس سے راضی ہوتا ہے؟ امیدیں اور آرزوئیں کیا ہیں؟ دعاؤں میں حق تعالیٰ سے کیا مانگتا ہے؟ نیند کی حالت میں خواب کس طرح کے آتے ہیں (کیوں کہ عام طور پر انسانی فکر و سوچ کے اثرات خوابوں پہ پڑتے ہیں) اپنی زندگی میں جو اہم فیصلے لیتا ہے ان کے پس منظر کیا چیز کارفرما ہوتی ہے؟ مثال کے طور پر شریک حیات کے انتخاب میں دینداری اور اخلاق کی اہمیت زیادہ ہے یا حسن و جمال کی؟ رہائش گاہ کے انتخاب میں نیک خداترس اور تقویٰ شعار ہم سایہ اور مسجد وغیرہ کا قرب پیش نظر ہے یا کچھ اور؟ اس طرح کے امور کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیا جائے تو آسانی سے پتہ چل سکتا ہے کہ ہم فکر دنیا میں مصروف ہیں یا فکر آخرت میں؟ اور کس کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی فکر و سوچ اور مقصد زندگی

رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو آپؐ کی پوری سیرت میں فکرِ امت، فکرِ انسانیت اور دعوت الی اللہ کے لیے تڑپنا، دربدر کی ٹھوکریں کھانا، لوگوں کی طرف سے آنے والی اذیتوں اور بدسلوکیوں پر صبر کرنا اور برائی کا بدلہ بھلائی سے اور بدتمیزی کا بدلہ حسن اخلاق سے دینا بلکہ ان کے لیے دعائیں کرنا ہر جگہ نظر آتا ہے، آپؐ کی یہی فکر تھی کہ کسی طرح یہ انسانیت دوزخ کی آگ سے بچ جائے اور اللہ کی بنائی ہوئی جنت کی مستحق بن جائے، انسانیت کے اس غم اور فکر نے آپؐ کو اتنا گھلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ پر ترس آگیا اور تسلی کے لیے فرمایا:

﴿ لَعَلَّكَ بَٰخِعٌ نَّفۡسَكَ أَلَّا يَكُونُواْ مُؤۡمِنِينَ ۝٣ ﴾ [الشعراء: ٣]

”(اے پیغمبر!) شاید تم اس غم میں اپنی جان ہلاک کیے جا رہے ہو کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لائے“۔[سورۂ شعراء:۳]

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ فَلَعَلَّكَ بَٰخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِمۡ إِن لَّمۡ يُؤۡمِنُواْ بِهَٰذَا ٱلۡحَدِيثِ أَسَفًا ۝٦ ﴾ [الكهف: ٦]

”پس اگر یہ لوگ (قرآن کی) اس بات پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے؟“[سورۂ کہف:۶]

﴿...وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِي ضَيۡقٖ مِّمَّا يَمۡكُرُونَ ۝١٢٧ ﴾ [النحل: ١٢٧]

”...اور آپ ان کے حال پر رنجیدہ نہ ہوں، اور جو مکاریاں یہ لوگ کر رہے ہیں ان کی وجہ سے تنگ دل نہ ہوں“۔[سورۂ نحل:۱۲۷]

شب وروز اور صبح وشام آپ کی ایک ہی فکر رہتی تھی اور ایک ہی غم ستاتا تھا کہ کسی طرح یہ رحمتِ الٰہی کے مستحق بن جائیں، یہی فکر آپ کو اندر سے کھائے جا رہی تھی، لیکن ستم یہ تھا کہ آپ تو لوگوں کی بھلائی اور ان کی ہدایت کے لیے تڑپ رہے تھے اور لوگ آپ کا نہ صرف مذاق اڑاتے تھے؛ بلکہ بعض دفعہ (بالخصوص شروع کے دنوں میں) نہایت سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے اور تمام انسانی، اخلاقی اور قرابت داری کی روایات کو بالائے طاق رکھ کر ایذا رسانی کی تمام حدیں پار کر جاتے تھے، جس کی وجہ سے آپ بہت رنجیدہ ہوتے تھے، اور اس رنجیدگی کی وجہ ان کی حق سے بیزاری اور دعوتِ توحید و رسالت کی عدم قبولیت تھی،

چناں چہ اللہ تعالیٰ بار بار آپ کی اس رنجیدگی پر آپ کو تسلی دیتے تھے۔ فرمایا:

﴿ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُۥ لَيَحْزُنُكَ ٱلَّذِى يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾ ﴾ [الأنعام: ٣٣]

"(اے رسول!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ کو ان کی باتیں غم زدہ کر دیتی ہیں؛ کیوں کہ حقیقت میں یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے، بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں"۔ [سورۂ انعام: ۳۳]

انسانیت کی اور امت کی یہی فکر آپؐ کی آخری سانس تک رہی، چناں چہ جس وقت بسترِ مرگ پر تھے، اس وقت بھی نماز کی اور غلاموں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید فرماتے رہے، بلکہ آپ کے آخری جملے یہی تھے۔

حضرت انس ابن مالک کہتے ہیں:

«كَانَتْ عَامَّةُ وَصِيَّةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ، وَهُوَ يُغَرْغِرُ بِنَفْسِهِ «الصَّلَاةَ، وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ». [أبوداؤد وابن ماجه]

"رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات کے قریب جب آپ کا سانس اٹک رہا تھا تو آپؐ کی عام وصیت یہ تھی: لوگو! نماز اور غلام ولونڈیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنا"۔

[ابوداؤد وابن ماجہ]

آپ کی خوشی اور غمی، غصہ اور انتقام یہ سب کچھ آخرت کے لیے تھا، اسی لیے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

«مَا انْتَقَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ يُؤْتَى إِلَيْهِ حَتَّى يُنْتَهَكَ مِنْ حُرُمَاتِ اللهِ، فَيَنْتَقِمَ لِلهِ». [صحيح البخاري]

”رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملات میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب اللہ کی قائم کی ہوئی حد پامال کی جاتی تو پھر آپؐ اللہ کے لیے بدلہ لیتے تھے“۔

[بخاری شریف]

ایک روز حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ تو اب بوڑھے ہو چلے، کیوں کہ انھوں نے حضور ﷺ کے اوپر کمزوری اور ضعف کے آثار محسوس کیے، تو حضور ﷺ نے فرمایا:

«شَيَّبَتْنِي هُودٌ، وَالْوَاقِعَةُ، وَالْمُرْسَلَاتُ، وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ، وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ». [رواه الترمذي]

”مجھے (سورۂ) ہود، والمرسلات، عم یتساءلون اور سورۂ اذا الشمس کورت نے بوڑھا کردیا“۔[ترمذی شریف]

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان سورتوں میں قیامت کے دن کی ہولناکی اور پچھلی قوموں کے عذاب کا ذکر ہے، اسی طرح ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ سورۂ ہود کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا کہ جیسا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسی طرح جم جائیے اور استقامت اختیار کیجیے ـــــ یہ وہ چیزیں تھیں جن کے غم میں اور جن کی فکر میں آپ اپنے آپ کو گھلاتے تھے اور ان کی وجہ سے رنجیدہ وغم زدہ رہتے تھے۔

صحابۂ کرامؓ کا دائرۂ فکر و نظر

رسول اللہ ﷺ کے زیرِ سایہ تربیت پانے والے صحابۂ کرامؓ نے آپؐ سے وہی طرز فکر اور طرز عمل سیکھا جو خود آپؐ کا تھا، ان کا جینا اور مرنا بھی صرف آخرت، دین کی

سربلندی اور رضائے الٰہی کے لیے تھا ــــ ان کے احوال اور ان کی سیرت پڑھنے سے اندازہ لگتا ہے کہ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں کیا تھیں جن سے ان کی فکر و نظر کی بلندی اور مقصدِ زندگی کا پتہ ملتا ہے۔

ایک روز حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے رفقاء سے فرمایا: تم میں سے ہر ایک اپنی اپنی تمنا اور آرزو بیان کرے، چناں چہ ایک صاحب نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ یہ گھر سونے سے بھر جائے جسے میں اللہ کے راستے میں خرچ کر ڈالوں ــــ دوسرے صاحب نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ یہ گھر ہیرے، موتی اور زمرّد سے بھر جائے اور میں ان سب کو راہِ خدا میں صرف کردوں ــــ ایک صاحب نے کہا کہ امیر المؤمنین! میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا عرض کروں، تو حضرت عمرؓ نے اپنی آرزو بیان کی، فرمایا کہ میری تمنا یہ ہے کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن الجراح جیسے لوگوں سے بھر جائے (جن کو خود حضورؐ نے امین کا لقب عنایت فرمایا تھا اور امانت داری میں اپنی مثال آپ تھے)۔[صفوۃ الصفوۃ]

اس طرح کی ان حضرات کی امیدیں اور آروزوئیں ہوا کرتی تھیں، ان کے سینے کے اندر کا دل، فکرِ آخرت، فکرِ امت اور نصرت دین کے گراں قدر جذبات سے تڑپتا رہتا تھا، یہاں تک کہ روح نکلتے وقت بھی اس کے علاوہ کوئی فکر انھیں دامن گیر نہیں ہوتی تھی۔

غزوۂ احد کے موقع پہ حضور ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَأْتِينِي بِخَبَرِ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ الْأَنْصَارِيِّ» ”سعد بن الربیع الانصاری کی خبر میرے پاس کون لائے گا؟“، ایک صاحب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں لاؤں گا۔ چناں چہ وہ گئے، شہداء کی لاشوں کے درمیان جستجو میں لگے تھے کہ اچانک حضرت سعد نے انھیں آواز دی اور کہا: ”کیا بات ہے؟“ انھوں نے کہا کہ مجھے حضورؐ نے تمہاری خبر لانے کے لیے بھیجا ہے۔ حضرت سعد نے فرمایا:

جاؤ اور حضورؐ کو میرا اسلام کہنا، اور یہ بتا دینا کہ مجھے بارہ نیزے لگے ہیں اور اتنے گہرے ہیں کہ بچ نہیں سکتا اور اپنی قوم کو میرا پیغام پہنچا دینا کہ اگر خدانخواستہ رسول اللہ ﷺ کی شہادت ہوگئی اور ان میں کا ایک شخص بھی زندہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر نہیں چلے گا"۔[مؤطا]

ان پاکیزہ ہستیوں کی تقریروں اور نصیحتوں میں بھی اسی فکر آخرت کی تاکید اور ترغیب ملتی ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے لوگوں کو خطاب کرکے فرمایا:

"لوگو! میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں، میں تمہارا مشفق ہوں، (سن لو) قبر کی وحشت کو دور کرنے کے لیے رات کی ظلمت و تاریکی میں نماز پڑھا کرو، قیامت کی تپش سے بچنے کے لیے دن میں روزے رکھو اور اس مشکل ترین دن کے خوف سے صدقہ کیا کرو"۔[حیاۃ الصحابہ]

فکر دنیا سے تو کوئی بھی اپنا دامن چھڑا نہیں سکتا اور نہ یہ مطلوبِ شرع ہے، کیوں کہ استغناء، عزت وعافیت اور سرخ روئی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اس کی فکر میں لگنا اور رزقِ حلال کے لیے جدوجہد کرنا ضروری ہے، البتہ یہ خیال رہے کہ فکر آخرت ہمیشہ غالب رہے اور فکر دنیا مغلوب رہے، آخرت کو ہمیشہ دنیا پر ترجیح دیں، اسی لیے حضور ﷺ عام طور پر یہ دعا فرماتے تھے:

«...اللهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا».

[الترمذي]

"...اے اللہ! تو دنیا کو ہمارا سب سے بڑا مقصد اور ہمارے علم کی انتہا نہ بنا"۔

[ترمذی شریف]

دنیاوی ہموم وغموم کا علاج

بعض دفعہ ایسے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں جن کی بنا پر انسان کے دل ودماغ پر المناک حد تک تفکرات حاوی ہوجاتے ہیں اور وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہوجاتا ہے، پھر اگر یہ صورتِ حال بڑھتی جائے اور تادیر قائم رہے تو مختلف قسم کے امراض بھی رونما ہونے لگتے ہیں؛ اس لیے ان سے خلاصی کے لیے کچھ اذکار یہاں درج کیے جارہے ہیں جو ان تفکرات اور غموں کے ازالے میں معاون ثابت ہوں گے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوے تو آپ کی نظر اچانک ایک انصاری صحابی پر پڑی جنہیں ابوامامہ کہا جاتا تھا، آپؐ نے ان سے فرمایا: ابوامامہ! کیا وجہ ہے کہ میں تمھیں نماز کے وقت کے علاوہ بھی مسجد میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! غموں اور قرضوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں کہ جب تم انھیں کہو تو اللہ تم سے تمھارے غم غلط اور قرض ادا کرادے؟ میں نے عرض کیا: ضرور، کیوں نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: صبح وشام یہ کہا کرو:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ، وَقَهْرِ الرِّجَالِ». [أبوداؤد]

ترجمہ: ”اے اللہ! میں فکروغم سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بے بسی اور سستی سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بزدلی اور بخالت سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور قرض کے غلبے اور لوگوں کے قہر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ عمل کیا تو اللہ نے میرا غم دور کر دیا اور میرا قرض بھی ادا کرا دیا"۔[ابوداؤد شریف]

دوسری چیز کثرت سے استغفار کرنا ہے جس کی وجہ سے غم سے نجات ملتی ہے، تنگی میں کشادگی نصیب ہوتی ہے اور ایسی جگہ سے روزی عطا ہوتی ہے جہاں تک اس کے ذہن کی رسائی بھی نہیں ہوتی۔

«مَنْ لَزِمَ الاِسْتِغْفَارَ، جَعَلَ اللهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجًا، وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ».

[أبو داؤد، ابن ماجه، أحمد]

"جو شخص استغفار کا التزام کرے (یعنی کثرت سے کرے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے اور ہر رنج و غم سے نجات پانے کی راہ ہموار کر دیتے ہیں اور اسے ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتے ہیں جو اس کے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہو"۔

[ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد]

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح کے وقت اور شام کے وقت سات مرتبہ «حَسْبِيَ اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ» کہے۔

ترجمہ: "مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور وہی عرش عظیم کا رب ہے" تو اس کی مشکلات کے لیے اللہ کافی ہو جائے گا، ان کے کہنے میں وہ سچا ہو یا جھوٹا۔[ابوداؤد]

کثرت سے درود شریف پڑھنے سے بھی غموں سے نجات ملتی ہے، ٹینشن ختم ہوتی

ہے اور گناہوں کی مغفرت بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابیؓ بن کعبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ پر بہت درود پڑھا کرتا ہوں، تو درود کے لیے کتنا وقت مقرر کرلوں؟ آپ نے فرمایا: "جتنا تم چاہو" میں نے عرض کیا: چوتھائی؟ آپؐ نے فرمایا: "جتنا تم چاہو اور اگر اس سے زیادہ کرلو تو تمہارے حق میں زیادہ اچھا ہو"، میں نے عرض کیا: دوتہائی؟ آپؐ نے فرمایا: "تم جتنا چاہو اور اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لیے اور بھی بہتر ہے"۔ میں نے عرض کیا: پھر اپنے پورے وقت میں درود ہی پڑھوں گا (یعنی وظیفے کے اوقات میں) آپؐ نے فرمایا: "تب تو یہ درود تمہارے تفکرات کے لیے کافی ہوجائے گا اور تمہارے گناہوں کی بخشش بھی ہوجائے گی"۔ [ترمذی شریف]

❊ ❊ ❊

۱۸/۳/۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ظلم اور اس کا بدترین انجام

اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے

مسلم شریف میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی روایت بیان کی ہے جسے آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے بیان کی ہے (یعنی حدیث قدسی) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالَمُوا...». [مسلم]

”اے میرے بندو! میں نے ظلم کرنا اپنے اوپر حرام کیا ہے اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام قرار دیا ہے، اس لیے تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو...“۔

[مسلم شریف]

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عادلانہ اور منصفانہ ذاتِ اقدس کا تعارف کرایا ہے اور متعدّد مقامات پر اپنی ذات سے ظلم کی نفی فرمائی ہے:

﴿ مَّنْ عَمِلَ صَٰلِحًا فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ

بِظَلَّـٰمٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٤٦﴾ [فصلت: ٤٦]

”جو کوئی نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے، اور جو کوئی برائی کرتا ہے وہ اپنے ہی نقصان کے لیے کرتا ہے، اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے“۔[سورۂ حم السجدۃ:۴۶]

﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ﴿٤٩﴾﴾ [الكهف: ٤٩]

”اور تمہارا پروردگار کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا“۔[سورۂ کہف:۴۹]

ظلم کی تین قسمیں

ظلم کی تین قسمیں ہیں: ایک ظلم یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ ظلم کا برتاؤ کرے، دوسرا یہ ہے کہ خدا کے بندوں پر ظلم کرے، تیسرا یہ ہے کہ خود اپنی ذات پر ظلم کرے۔

سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ انسان اپنے رب کے ساتھ ظلم کرے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک کرے، شرک کو اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے، اسی لیے حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تو فرمایا:

﴿يَـٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِٱللَّهِ ۖ إِنَّ ٱلشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿١٣﴾﴾

[لقمان: ١٣]

”اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، یقین جانو کہ شرک بڑا بھاری ظلم ہے“۔[سورۂ لقمان:۱۳]

خدا کے بندوں پر ظلم کی بے شمار صورتیں ہیں، کسی کو ناحق قتل کرنا، کسی کو بلاوجہ مارنا یا گالی دینا، کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا، کسی کا مال ہڑپ لینا، کسی کے اوپر تہمت لگانا،

کسی کو خوف زدہ کرنا یا مایوس کرنا، کسی کو اذیت دینا یا ناحق سزا دینا یا گرفتار کرنا اور قید خانے میں ناحق محبوس رکھنا۔ یہ تمام صورتیں ظلم میں داخل ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ القِيَامَةِ» [صحيح البخاري]

"قیامت کے روز ظلم کا انجام تاریکیاں ہیں"۔[بخاری شریف]

دوسری روایت میں ہے:

«مَنِ اقْتَطَعَ أَرْضًا ظَالِمًا، لَقِيَ اللهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ».

[مسلم]

"جس نے ظلم کر کے کوئی زمین غصب کی (یا چھینی) تو وہ اس حال میں اللہ تعالی سے ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا"۔ [مسلم شریف]

بعض لوگ طاقت کے بل بوتے پر یا جھوٹی قسمیں کھا کر یا جھوٹے گواہوں کے توسط سے یا رشوت وغیرہ دے کر دوسروں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیتے ہیں اور اسے اپنی ذہانت، زیرکی اور چالاکی سمجھتے ہیں، حالاں کہ ایسے لوگوں کے لیے نہایت سخت وعیدیں ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ». [مسلم]

"جس نے زمین کی ایک بالشت بھی بطور ظلم کے کاٹ لی، خدائے پاک قیامت کے دن اسے سات زمینوں سے اس کا طوق بنا کر پہنائے گا" (اس طرح سب کے سامنے ذلیل اور رسوا ہوگا)۔ [مسلم شریف]

اسی طرح کسی نے اپنا مال بطور امانت کے کسی پر اعتماد کر کے اس کے پاس رکھا، اس

شخص نے امانت میں خیانت کرڈالی یا صاف صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی امانت نہیں رکھی گئی ـــــ یا کسی سے قرض لیا تھا اور بعد میں نہایت ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ اس کے قرض کا انکار کر دیا۔ یہ صورتیں بھی ظلم میں داخل ہیں۔

کسی حق دار کا حق اس تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ ڈالے، یا کسی منصب و عہدے یا ملازمت کے مستحق شخص کو اس کے حق سے محروم کر دے اور دوسرے غیر مستحق شخص کو قرابت داری، یا دوستی یا رشوت کی وجہ سے اس پر ترجیح دے تو یہ بھی سراسر ظلم ہے۔

ملازمت کے باب میں ظلم وستم

کسی ملازم اور عامل کا متعیّنہ شروط کے مطابق کام نہ کرنا، اس میں سستی کرنا یا کام میں خیانت کرنا بھی صاحب عمل کے ساتھ ظلم ہے۔ کسی ملازم، عامل یا نوکر سے کوئی کام کرایا گیا؛ لیکن اس کی پوری اجرت نہیں دی گئی تو یہ بھی اس کے ساتھ ظلم تصور کیا جائے گا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«ثَلاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ القِيَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ». [صحيح البخاري]

”تین طرح کے لوگ ہیں جن کا قیامت کے دن خود میں مدعی بنوں گا: ایک تو وہ شخص جس نے میرے نام پہ کوئی عہد کیا پھر اس نے بدعہدی کردی، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی اور تیسرا وہ شخص جس نے کسی کو مزدوری کے لیے رکھا، پھر مزدور نے کام پورا کر دیا، لیکن اس شخص نے اس کی

مزدوری نہ دی"۔ [بخاری شریف]

اس لیے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے فرائض انجام دینے چاہییں، مزدور یا ملازم اپنا کام نہایت ذمے داری اور امانت داری کے ساتھ پورا کر کے اور صاحب عمل اسے مکمل اجرت اور مزدوری دے، نہ تو ٹال مٹول سے کام لے نہ ہی اس کی مزدوری میں بلا جواز کوئی کمی کرے۔

ایک ظالم حکمراں کا عبرت ناک انجام

امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب "سیر اعلام النبلاء" میں لکھا ہے کہ ایک خدا ترس عالم باعمل ایک روز ایک جابر و سرکش حاکم کے پاس گئے اور اسے نصیحت کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا؛ لیکن اس بدبخت نے اس کے بدلے میں ان کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا، ان بزرگ نے کہا کہ "تم نے مجھے تھپڑ مارا ہے حالاں کہ میں تمہاری خیر خواہی کے لیے آیا تھا اور جو کچھ کہا وہ تمہارے فائدے کے لیے تھا، جس ہاتھ سے تم نے مجھے مارا ہے اللہ وہ ہاتھ کاٹ ڈالے"۔ وہ بدبخت کہنے لگا کہ مجھے معاف کر دیجیے، انھوں نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، ہمارا تمہارا معاملہ احکم الحاکمین کے سپرد ہے۔ امام ذہبی کہتے ہیں کہ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ گیا، اس کو اس کے محل سے بے دخل کر دیا گیا، اس کا ہاتھ کاٹ کر لوگوں کے سامنے لٹکا دیا گیا۔

تکبر اور گھمنڈ کسی بندے کے لیے روا نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی چادر ہے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس چادر کو باری تعالیٰ سے چھیننے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں پھینک دیں گے"۔ [ابوداؤد شریف]

کبریائی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے حرام قرار نہیں دیا، لیکن ظلم کو اپنی ذات پر بھی حرام قرار دیا ہے اور تمام انسانوں کے لیے بھی، اسی لیے ظالم کی گرفت دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ حَتَّى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ» قَالَ: ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَآ أَخَذَ ٱلْقُرَىٰ وَهِىَ ظَٰلِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُۥٓ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾﴾ (هود: ١٠٢)» [صحيح البخارى]

”اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، لیکن جب پکڑتا ہے تو نہیں چھوڑتا۔ راوی نے کہا کہ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَآ أَخَذَ ٱلْقُرَىٰ وَهِىَ ظَٰلِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُۥٓ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾﴾ (ہود:۱۰۲)

”اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے، جب وہ بستی والوں کو پکڑتا ہے جو ظلم کرتے رہتے ہیں، بیشک اس کی پکڑ بڑی ہی الم ناک اور سخت ہے“۔[بخاری شریف]

مظلوم کی بد دعا سے بچو

کتنے ایسے لوگ ہیں جو دولت، عہدہ یا طاقت کے نشے میں مدہوش ہو کر کمزوروں اور غریبوں پر ظلم کرتے ہیں، ان کی زمین وجائیداد غصب کرتے ہیں، ان کی عزت وآبرو پہ حملے کرتے ہیں، انھیں ذلیل وخوار کرتے ہیں، ناحق انھیں ستاتے اور قید خانوں میں ڈال کر ان کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں، حکومت وطاقت کے جنون میں معصوموں کی جانیں لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، جیسا کہ فرعون اور قارون جیسے ظالموں

نے سوچا اور سمجھا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ وہ ظالموں کو فرصت دیتا ہے، انھیں راہِ راست پر آنے اور ظلم سے باز آنے کے لیے موقع فراہم کرتا ہے، لیکن جب وہ باز نہیں آتے، توبہ نہیں کرتے تو پھر اللہ پاک اپنی سخت گرفت میں انھیں لے لیتے ہیں:

﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ﴿١٢﴾﴾ [البروج: ١٢]

”یقیناتیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے“۔[سورۂ بروج:۱۲]

پھر انھیں دوسروں کے لیے بھی نشانِ عبرت بنادیتے ہیں، لیکن عبرت بھی اہل بصیرت اور اہل نظر ہی حاصل کرتے ہیں، ورنہ بے بصیرت اور نادان تو پھر بھی نہیں سنبھلتے، ان کا نشہ صرف اسی وقت ٹوٹتا ہے جب خدائی عذاب کا کوڑا ان کے سر پر پڑتا ہے۔

یہ بات یاد رکھیں کہ مظلوم کی آہ اور عرش الٰہی کے درمیان کوئی حجاب اور پردہ نہیں ہے، قطع نظر اس کے کہ مظلوم کی صورت وشکل کیا ہے، اس کا رنگ وروپ اور دین ومذہب کیا ہے۔ اسی لیے جب حضور ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا حاکم بناکر بھیجا تو انھیں جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی:

«وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ».

[صحيح البخاري]

”اور مظلوم کی بددعاء سے بچنا، کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں“۔[بخاری شریف]

لا تَظْلِمَنَّ إذا ما كنتَ مُقتدِرًا فَالظُّلْمُ ترجِعُ عُقْبَاهُ إلى النَدَم
تَنَامُ عَيْنَاكَ، وَالمَظْلُومُ مُنتبِه يَدْعُوْ عَلَيْك، وعَيْنُ الله لَم تَنَم

”جب تم بااختیار بن جاؤ تو ہرگز ظلم نہ کرنا، کیوں کہ ظلم کا انجام ندامت وپشیمانی

ہے، تم تو سو جاؤ گے لیکن مظلوم نہیں سوئے گا، وہ اپنی آہیں اُس خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں پہنچائے گا جو کبھی نہیں سوتا"۔

ایک مظلوم کی بد دعا اور اس کی قبولیت کا واقعہ

ظلم کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی بے گناہ یا بے قصور شخص پر فسق وفجور یا خیانت و بد دیانتی وغیرہ کی تہمت لگائی جائے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ صحابیِ جلیل ہیں، بلکہ ان دس خوش نصیب صحابۂ کرام میں ان کا شمار ہے جنہیں رسول اکرم ﷺ نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت سنائی تھی۔ ان کے خلاف ایک عورت نے جس کا نام اَرْویٰ بنت اویس تھا، مروان بن الحکم کے ہاں دعویٰ پیش کیا کہ انھوں نے اس کی زمین کے کچھ حصے پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے، جب ان کی پیشی ہوئی تو فرمایا کہ اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان سننے کے بعد بھی میں اس زمین پر ناجائز قبضہ کر سکتا ہوں؟ مروان نے کہا کہ آپ نے حضور ﷺ کا ارشاد کیا سنا ہے؟ چناں چہ حضرت سعیدؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِنَ الأَرْضِ ظُلْمًا، فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ».

"جس نے ایک بالشت زمین بھی بطور ظلم کے لی ہوگی تو اسے سات زمینوں کا طوق لگا کر پہنایا جائے گا"۔

یہ سن کر مروان نے کہا کہ اب اس کے بعد میں آپ سے کسی ثبوت یا گواہ کا مطالبہ نہیں کروں گا، بس یہی آپ کی برأت کے لیے کافی ہے، لیکن اس عورت نے چوں کہ انھیں

اعلانیہ طور پر بدنام کیا تھا، ان کی عزت پہ حملہ کیا تھا اس لیے اس کے لیے بد دعا کی اور کہا:

«اللهُمَّ، إِنْ كَانَتْ كَاذِبَةً فَعَمِّ بَصَرَهَا، وَاقْتُلْهَا فِي أَرْضِهَا».

”یعنی اے اللہ اگر یہ جھوٹی ہے تو اس کی بینائی سلب کر لے اور اسی کی زمین میں اس کا خاتمہ کر دے“۔

کہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے بالکل اندھی ہو گئی تھی اور اپنے گھر میں ایک روز چلتے چلتے ایک گڑھے میں گر کر مر گئی۔[بخاری شریف]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ اندھی ہو گئی تھی اور دیواروں کو پکڑ کر چلتی تھی اور کہتی تھی: ”مجھے سعید کی بد دعا لگ گئی ہے“۔

اس لیے ظلم سے ہر شخص کو بچنے کی ضرورت ہے، ظالم کا انجام نہایت ذلت آمیز اور المناک ہوتا ہے، مظلوم کی آہوں کو اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر اٹھا لیتے ہیں اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

«... وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ يَرْفَعُهَا اللهُ فَوْقَ الْغَمَامِ وَيَفْتَحُ لَهَا أَبْوَابَ السَّمَوَاتِ، وَيَقُولُ الرَّبُّ: وَعِزَّتِي لَأَنْصُرَنَّكِ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ». [الترمذي]

”(تین طرح کے لوگ ہیں جن کی دُعا رد نہیں ہوتی، ان میں ایک) مظلوم کی بد دعا ہے، جسے اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر اٹھا لیتے ہیں اور آسمان کے دروازے کھول دیتے ہیں اور باری تعالیٰ فرماتے ہیں: میری عزت کی قسم، میں تیری مدد ضرور کروں گا اگرچہ کچھ مدت کے بعد ہی کیوں نہ ہو“۔[ترمذی شریف]

ظلم کی مزید صورتیں

ایک بہت بڑا ظلم یہ ہے کہ اولاد اپنے والدین یا ان میں سے ایک کے ساتھ ناروا سلوک کرے یا ان کی نافرمانی کرے یا ان کا دل دکھائے۔ والدین اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی خاطر جو شب و روز کی قربانیاں دیتے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ یہی بچے ان کی اذیت، پریشانی اور تکلیف و بیماری کا ذریعہ بن جائیں، ان قربانیوں کا صلہ یہ تھا کہ ان کے بڑھاپے میں ان کا سہارا بنیں، ان کے لیے راحت اور چین و سکون کا ماحول مہیا کریں اور ان کی دعائیں لے کر اپنی دنیا اور آخرت سدھاریں؛ لیکن افسوس کہ بعض اولادیں ظلم و ستم، بدبختی، سنگ دلی اور احسان فراموشی کی تمام حدیں پار کر جاتی ہیں اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین ناراضگی کی حالت میں اس دنیا سے عالم آخرت کو سدھار جاتے ہیں، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان اولادوں پر دنیا میں ہی خدائی قہر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ان کے کرتوتوں کا بدلہ اضافے کے ساتھ ملنے لگتا ہے۔

خرید و فروخت اور لین دین میں کسی بھائی کو دھوکہ دینا بھی ظلم ہے، کسی کا مال باطل طریقے سے حاصل کرنا، یا جھوٹی قسمیں کھا کر ہڑپنا بھی ظلم ہے، جھوٹی گواہی دینا اور اس کے ذریعہ کسی کا حق مارنا بھی ظلم ہے۔ بلاوجہ اپنی بیویوں کو مارنا یا انھیں ہراساں کرنا یا ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ظلم و ستم کی ایک بدترین قسم ہے، اس کمزور اور نازک مخلوق کے اوپر ظلم کرنا اور اپنی قوت و طاقت کا اس کے خلاف استعمال کرنا کوئی بہادری اور مردانگی نہیں ہے، اس کے ساتھ نرمی، محبت اور خیر و بھلائی کا معاملہ کرنے کا شریعت نے ہمیں حکم دیا ہے، اس لیے رحمت دو عالم ﷺ نے فرمایا:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي».

[رواه مسلم]

”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بہتر ہو، اور میں اپنے اہل خانہ کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں“ (یعنی ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہوں)۔ [مسلم شریف]

دوسروں پر کیے گئے مظالم کا کفارہ

خدا کی مخلوق پر اگر کسی نے ظلم وستم کیا ہو تو چوں کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس لیے محض توبہ واستغفار یہاں کافی نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ مظلومین اسے معاف کردیں، ظالم ان سے معذرت کرے، معافی طلب کرے اور اگر مالی اور مادی معاملات ہوں تو حق داروں کے حقوق انھیں واپس کرے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ مَظْلِمَةٌ لِأَخِيهِ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهَا، فَإِنَّهُ لَيْسَ ثَمَّ دِينَارٌ وَلاَ دِرْهَمٌ، مِنْ قَبْلِ أَنْ يُؤْخَذَ لِأَخِيهِ مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَخِيهِ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ». [صحيح البخاري]

”جس نے اپنے بھائی پہ کوئی ظلم کیا ہو تو اسے چاہیے کہ اس سے (اس دنیا میں ہی) معافی تلافی کرالے، اس لیے کہ آخرت میں دینار ودرہم (یعنی روپے پیسے) نہیں ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ اس کے بھائی کے لیے اس کی نیکیوں میں سے لے کر حق دلایا جائے۔ اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس (مظلوم) بھائی کی برائیاں

اس پر ڈال دی جائیں گی"۔ [بخاری شریف]

کسی کی زمین وجائیداد پر ناجائز قبضہ کرنے والے یا کسی کا ناحق خون بہانے والے یا کسی پر تہمت لگانے والے یا بلاوجہ کسی کو زدوکوب اور سب وشتم کرنے والے یا کسی اور طریقے سے ظلم وزیادتی کرنے والے ظالم نے اگر مظلوموں سے معافی تلافی نہیں کرالی اور ان کے غصب کیے ہوے حقوق واپس نہیں کیے تو قیامت کے دن اس سے بڑا مفلس کوئی نہیں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ؟» قَالُوا: الْمُفْلِسُ فِينَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ وَلَا مَتَاعَ، فَقَالَ: «إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِي يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ، وَصِيَامٍ، وَزَكَاةٍ، وَيَأْتِي قَدْ شَتَمَ هَذَا، وَقَذَفَ هَذَا، وَأَكَلَ مَالَ هَذَا، وَسَفَكَ دَمَ هَذَا، وَضَرَبَ هَذَا، فَيُعْطَى هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، وَهَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْضَى مَا عَلَيْهِ أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ». [مسلم]

"تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟ صحابۂ کرام نے کہا کہ ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ کوئی درہم ہو اور نہ ہی کوئی ساز وسامان۔ آپؐ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ اور زکاۃ لے کر آئے گا، (لیکن) وہ اس طرح آئے گا کہ اس نے اس کو گالی دی ہوگی (یعنی دنیا میں) اس پر تہمت لگائی ہوگی، اس کا مال (ناجائز طریقے سے) کھایا ہوگا، اس کا خون (ناحق) بہایا ہوگا، اور اس کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیوں میں سے اس کو بھی دے دیا جائے گا اور اس کو بھی دے دیا جائے گا اور اگر اس پر عائد ہونے والے حقوق کی ادائیگی مکمل ہونے سے پہلے اس کی ساری نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو ان کے گناہ اس پر ڈال

دیے جائیں گے، پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا"۔ [مسلم شریف]

ظلم کی تیسری قسم "اپنی ذات پر ظلم" اور اس کا کفارہ

ایسے کبیرہ گناہ کا ارتکاب جن کا وبال دنیا میں بھی نظر آتا ہے اور آخرت میں ان پر وعید سنائی گئی ہے۔ یہ خود اپنی ذات پر ظلم کرنا ہے، مثال کے طور پر اپنی نگاہوں کا غلط استعمال، کان کا ناجائز استعمال، ہاتھ پاؤں کا بے جا استعمال، اپنی شہوت کی تکمیل حرام طریقے سے کرنا، اسی طرح فرائض وواجبات کو قصداً چھوڑنا، اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنا، نماز جیسے اہم فریضے میں کوتاہی کرنا یا سرے سے اس سے غافل رہنا، بلاعذر رمضان کے روزے نہ رکھنا، زکاۃ فرض ہونے کے باوجود ادا نہ کرنا، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہ کرنا، یہ ساری صورتیں اپنی جانوں پر ظلم وستم ڈھانے کی ہیں، حالاں کہ انسان یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ مہربانی اور راحت رسانی کا معاملہ کر رہا ہے۔

اگر کسی نے گناہ کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہو تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ صدق دل سے توبہ اور استغفار کرے۔ پچھلے گناہوں پر ندامت ہو، انھیں چھوڑ دے، بلکہ ان کے قریب بھی نہ جائے اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو۔ ظلم کی پہلی قسم جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے اس کے لیے بھی اخلاص کے ساتھ شرک سے توبہ کر کے پکا مُوَحّد بننا ضروری ہے اور اس تیسری قسم کے لیے بھی توبہ واستغفار ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عظمت کے استحضار اور آخرت کی فکر کے ساتھ ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور رسول اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی وہ دعا پڑھے جو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہر نماز میں پڑھنے کی ہدایت فرمائی تھی:

«اللَّهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا، وَلاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الغَفُورُ الرَّحِيمُ». [متفق عليه]

''اے اللہ! میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے، اور گناہوں کو تیرے سوا کوئی نہیں بخشتا، لہٰذا تو اپنے خزانۂ بخشش سے میری بخشش فرمادے اور میرے اوپر رحم فرما، تو ہی بخشش کرنے والا مہربان ہے''۔[متفق علیہ]

خلاصہ یہ ہے کہ ظلم نہایت خطرناک چیز ہے، دنیا میں بھی اس کا بدترین انجام ہے اور آخرت میں تو ''ظلمات'' تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں، اس لیے بلا تاخیر اس بدترین خصلت سے باز آجانا چاہیے، اگر ظلم کی دوسری قسم کا مرتکب ہے تو توبہ کے ساتھ مظلومین سے معافی طلب کرے اور ان کے حقوق لوٹائے اور اگر پہلی (شرک) اور تیسری قسم کے ظلم میں مبتلا ہے تو سچے دل سے ندامت کے ساتھ توبہ اور استغفار کرے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کے اس ظلم وستم کو معاف کرے گا۔

﴿ وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾ ﴾ [النساء: ١١٠]

''اور جو شخص کوئی برا کام کرگزرے یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے، پھر اللہ سے معافی مانگ لے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا بڑا مہربان پائے گا''۔[سورۂ نساء:۱۱۰]

اللہ تعالیٰ ہمیں ظلم کرنے اور دوسروں کے ظلم کا شکار بننے سے بچائے رکھے۔

* * *

۱۴۳۲/۸/۲۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسان کی قدر وقیمت اسلام کی نظر میں

اسلام میں انسان ایک گراں قدر اور نہایت قیمتی مخلوق ہے، اسلام نے اسے بہت اونچا مقام دیا ہے، اس تکریم وتعظیم کے دو بنیادی پہلو ہیں:

تکریم کی پہلی بنیاد

(ا) پہلا پہلو اور اساس عقیدۂ توحید ہے، کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ ہے، یہ صرف کلمہ نہیں، بلکہ ایک نئے عالم کا اعلان ہے، انسان کے لیے از سر نو ولادت کا فرمان ہے، انسان کی غلامی کی زندگی سے آزادی کا منشور ہے، یہ کلمہ یہ بتاتا ہے کہ اب کوئی انسان کسی انسان کی عبادت نہیں کر سکتا، کسی انسان کے آگے اپنا سر نہیں جھکا سکتا، اب اس کا سر صرف اس کے خالق ومالک کے آگے جھکے گا، اس کلمے کے ذریعے کسی بھی بشر کے لیے عبودیت کے خاتمے کا اعلان کیا گیا ہے، انسان کسی انسان کا معبود بھی کیسے ہو سکتا ہے جو خود مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، مٹی میں اسے مل جانا ہے۔

﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ﴿٥٥﴾﴾

[طه: ٥٥]

”اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں

گے اور اسی سے پھر تمہیں دوبارہ نکال لائیں گے"۔[سورۂ طہٰ:۵۵]

البتہ سارے کے سارے انسان ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں گے، وہ سب ایک باپ کی اولاد ہیں، ایک رب کے بندے ہیں، اس بات کا اعلان رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پہ، مشاعر مقدسہ سے، صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت کے سامنے فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى». [البيهقي]

"اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارے والد ایک ہیں، یاد رکھو، کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، ہاں تقویٰ کی بنیاد پر ہے"۔[بیہقی]

اس طرح اسلام نے حقوقِ انسانی اور قیمتِ انسانی کی بنیاد توحید پر رکھی یعنی اس بات پر کہ سارے انسان ایک ہی رب کے بندے ہیں، انھیں صرف اسی ایک رب کی عبادت کرنی ہوگی، اسی کے سامنے سربسجود ہونا پڑے گا، ان کو یہ قطعاً زیب نہیں دیتا کہ ایک رب کے سوا کسی اور کے سامنے جھکیں۔

اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ جب بادشاہوں اور گورنروں کو خطاب بھیجتے تھے مثلاً قیصر، نجاشی اور مقوقس وغیرہ کو تو خطاب کے آخر میں یہ آیتِ کریمہ لکھواتے تھے:

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا

أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾ [آل عمران: ٦٤]

ترجمہ: "آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، پھر بھی اگر وہ منھ موڑلیں تو تم کہہ دو: تم گواہ رہو ہم مسلمان ہیں"۔

[سورۂ آلِ عمران:۶۴]

لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بند کے لیے اس کی گنجائش نہیں کہ کسی دوسرے بندے کے سامنے خود کو ذلیل وخوار کرے اور اس کے سامنے جھکے، عبودیت صرف اللہ جل جلالہ کے لیے ہوگی۔

دوسری بنیاد: تکریمِ انسانی

اسلام میں انسان ایک مکرّم مخلوق ہے، انسان ایک قابل احترام وتعظیم ہستی کا نام ہے، اس کے خالق نے اس کی تکریم کا خود ہی اعلان فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ ءَادَمَ وَحَمَلْنَٰهُمْ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ وَرَزَقْنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَفَضَّلْنَٰهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴿٧٠﴾﴾

[بني إسرائيل: ٧٠]

"اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے، اور انھیں خشکی اور سمندر دونوں کی سواریاں مہیا کی ہیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے"۔ [سورۂ بنی اسرائیل:۷۰]

انسان کی تکریم کے متعدّد طریقے اختیار کیے گئے، کئی چیزوں سے انھیں تعظیم بخشی گئی:

(۱) انسان کو اللہ نے زمین کی خلافت عطا فرمائی، یہ وہ منصبِ عظیم تھا جس کی فرشتوں نے آرزو کی تھی، اس آرزو کا برملا اظہار بھی انھوں نے کیا تھا، بلکہ اسے مُدلل کرنے کی بھی کوشش کی تھی، لیکن "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا" جب انہوں نے یہ کہا کہ جس انسان کو آپ خلیفہ بنا رہے ہیں یہ تو زمین میں فساد پھیلائیں گے اور خون خرابے کریں گے، حالاں کہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ۝٣٠﴾ [البقرة: ٣٠]

"میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔ [سورۂ بقرۃ:۳۰]

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تعلیم دے کر اور تمام چیزوں کے نام سکھا کر فریضۂ خلافت کی ادائیگی کے لیے تیار کیا اور اس تکریم سے سرفراز کیا۔

(۲) انسان کی تکریم کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت و شکل نہایت حسین بنائی، حسن و جمال کا وافر حصہ اسے عطا فرمایا، خود ہی فرمایا:

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا ٱلۡإِنسَٰنَ فِيٓ أَحۡسَنِ تَقۡوِيمٖ ۝٤﴾ [التين: ٤]

"یقیناً ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا"۔ [سورۂ التین:۴]

﴿خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ بِٱلۡحَقِّ وَصَوَّرَكُمۡ فَأَحۡسَنَ صُوَرَكُمۡۖ وَإِلَيۡهِ ٱلۡمَصِيرُ ۝٣﴾ [التغابن: ٣]

"اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورتیں بنائی ہیں،

اور تمہاری صورتیں اچھی بنائی ہیں، اور اسی کی طرف آخر کار لوٹ کر جانا ہے"۔

[سورۂ تغابن:۳]

﴿ٱلَّذِى خَلَقَكَ فَسَوَّىٰكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾﴾ [الانفطار: ۷]

"جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے ٹھیک ٹھیک بنایا، پھر تیرے اندر اعتدال پیدا کیا"۔ [سورۂ انفطار:۷]

(۳) ظاہری حسن وجمال کے ساتھ ایک باطنی چیز بھی ایسی عنایت فرمائی جس کی کوئی نظیر نہیں، جس میں انسان کا کوئی شریک نہیں، وہ یہ ہے کہ خود باری تعالیٰ نے اپنی روح اس میں پھونکی:

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَٰجِدِينَ ﴿٢٩﴾﴾

[الحجر: ۲۹]

"لہٰذا جب میں اس کو پوری طرح بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گرجانا"۔ [سورۂ حجر:۲۹]

(۴) انسان کے مقام کو اللہ نے اس قدر بلند کیا کہ زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو اس کے لیے مسخّر کردیا، اس کے تابع کردیا اور اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی؛ شمس وقمر، برّوبحر، یعنی خشک وتر، پرند وچرند کو، پہاڑوں اور صحراؤں کو، پیڑ پودوں کو انسان کی خدمت کے لیے بنایا، اس کی نفع رسانی کے لیے پیدا فرمایا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلشَّمْسَ وَٱلْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلَّيْلَ وَٱلنَّهَارَ ﴿٣٣﴾﴾ [إبراهيم: ۳۳]

"اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو اس طرح کام پر لگادیا کہ وہ مسلسل سفر میں

ہیں، اور تمہاری خاطر رات اور دن کو بھی کام پر لگا دیا"۔ [سورۂ ابرہیم:۳۳]

پورے وجود کائنات کو اس کے لیے مسخر کردیا؛ خواہ وہ شمسی توانائیاں ہوں، زمینی توانائیاں ہوں، معدنی توانائیاں ہوں، آپٹیکل یا نیومیٹک توانائیاں ہوں، ان سب کو انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمایا اور اس کے تابع کردیا —— کیا یہ "قلب حقائق" نہیں ہے کہ جس چیز کو اس کے فائدے کے لیے بنایا، اس کے تابع کردیا، اس کو اپنا معبود بنا کر اس کی پرستش اور عبادت کرے؟ اس سے بڑی حماقت اور باعثِ شرم اور کیا بات ہوگی کہ انسان کو اللہ نے جس کا مخدوم بنایا تھا یہ اس کا خادم بن جائے، جس کا آقا بنایا تھا اس کا غلام بن جائے۔

انسان کی تکریم جنین سے جنازے تک

یہ اسلام ہی ہے جس نے انسان کو اس کا احترام واکرام دیا، بحیثیت انسان کے انسان کی تکریم وتعظیم کا درس دیا، جب وہ ماں کے شکم میں "جنین" ہوتا ہے اس وقت سے موت تک، بلکہ موت کے بعد تک اس کے احترام واکرام کی تعلیم دی، اسی لیے اگر بچہ ماں کے پیٹ میں ہو تب بھی اس کے ساتھ زیادتی اور اس کی توہین کی اجازت نہیں دی ہے، اس کے اسقاط اور اس کے قتل سے منع کیا ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَوْلَٰدَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَٰقٍۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْـًٔا كَبِيرًا ﴿٣١﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٣١]

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے نہ مار ڈالو، ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ یقین جانو کہ ان کا قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے"۔ [سورۂ بنی اسرائیل:۳۱]

اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کی تکریم کا حکم دیا، اسلامی تعلیمات کے مطابق مُردے کو غسل دیا جائے گا، اسے کفن پہنایا جائے گا، خوشبو لگائی جائے گی، اس کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی، نہایت عزت واحترام کے ساتھ لے جاکر اسے دفن کیا جائے گا، اس کی وصیت پوری کی جائے گی، اس کے ترکے کی تقسیم سے پہلے اس کے قرض ادا کیے جائیں گے ـــــ یہاں تک کہ اگر میدانِ جنگ میں کوئی دشمن مارا گیا ہو تو اس کی لاش کی توہین کی اجازت نہیں، اس کی شکل نہیں بگاڑی جائے گی، اس کی ہڈیاں نہیں توڑی جاسکتیں۔

بلاتفریق ہر انسان قابل احترام ہے

اسلام نے ہر انسان کی بحیثیت انسان کے تکریم کا حکم دیا ہے، خواہ وہ کسی جگہ کا رہنے والا ہو، کسی بھی رنگ ونسل اور حسب ونسب کا ہو، اسلام میں رنگوں، نسلوں اور سرحدوں کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ انسان کے اندر جو انسانیت چھپی ہے، جو آدمیّت اس کے سینے میں ہے، جو روح اللہ نے پھونکی ہے، اس کا اعتبار ہے، مختلف رنگ ونسل کا ہونا تو دراصل اللہ تعالیٰ کی آیات ونشانیوں میں سے ہے:

﴿ وَمِنْ ءَايَـٰتِهِۦ خَلْقُ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَـٰفُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَٰنِكُمْ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَـَٔايَـٰتٍ لِّلْعَـٰلِمِينَ ﴿٢٢﴾ ﴾ [الروم: ٢٢]

”اور اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں دانش مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں“۔ [سورۂ روم:۲۲]

اسلام نے طبقہ واریت کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی ہیں، یہاں انسان ہونے میں

کوئی معزز اور کوئی ذلیل نہیں ہے، مال داری اور تنگ دستی، حاکمیت اور محکومیت اور حسب ونسب کی بنیاد پر کوئی عزیز اور کوئی ذلیل نہیں ہو سکتا، کنگھی کے دندانوں کی طرح سارے برابر ہیں، البتہ اگر کوئی معزز ہے تو تقویٰ اور حسنِ عمل کی بنیاد پر ہے، اگر کوئی ذلیل ہے تو اپنے حقیر وذلیل کردار کی وجہ سے۔ اسلام میں ہر انسان کی تکریم ہے، اس کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔

امام بخاریؒ نے حضرت سہل بن حُنیف اور قیس بن سعدؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے قریب سے ایک جنازہ گزرا تو آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے، تو آپؐ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے، یعنی صحابۂ کرام کو یہ محسوس ہوا کہ حضورؐ کو معلوم نہیں کہ یہ کس کا جنازہ ہے، شاید مسلمان کا جنازہ سمجھ کر آپؐ کھڑے ہو گئے، تو آپؐ نے فرمایا: «أَلَيْسَتْ نَفْسًا» کیا یہ جان نہیں ہے؟ کیا یہ نفس نہیں ہے؟ یعنی یہ بھی کسی انسان ہی کا جنازہ ہے، اور اسلام میں ہر انسان کا احترام ہے، خواہ وہ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔

اسی وجہ سے اگر کوئی زندہ ہے تو اس کی غیبت کرنے سے اسلام نے سختی سے منع کیا ہے، اور اگر وفات پا چکا ہو تب بھی اس کی برائی بیان کرنے سے منع کیا ہے۔

«لاَ تَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا».

[صحيح البخاري]

”مُردوں کو برا نہ کہو، کیوں کہ انہوں نے جیسا عمل کیا اس کا بدلہ انہیں مل گیا“۔

[بخاری شریف]

انسانی مساوات کی یہ حسین وجمیل صورت ہماری عبادتوں میں اور عبادت گاہوں میں نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے، چناں چہ آپ مسجد میں جائیں تو ایک مال دار کو ایک فقیر

ومسکین کے ساتھ، ایک مخدوم کو اپنے خادم کے ساتھ اور حاکم کو اپنے محکوم کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے پائیں گے۔ اسی طرح حج کے ایام میں اور مقاماتِ مقدسہ میں بھی ہر طبقے اور ہر معیار کے لوگوں کو ایک ہی لباس میں، ایک ہی خطے میں ایک ہی تلبیہ کا ورد کرتے ہوئے پائیں گے، یہاں سب کے سب برابر ہیں، اگر کسی پر کسی کو فوقیت ہے تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

اسلامی عدالت اور انسانی قدر وقیمت

اسلامی عدالت میں انسانی مساوات کا ایسا تعامُل ملتا ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے۔ چناں چہ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے عہد میں قریش کی ایک مخزومی عورت سے چوری سرزد ہوگئی، آپؐ کی عدالت میں یہ کیس پہنچ گیا، قریش کو بڑی فکر ہوئی کہ ان کے شریف قبیلے کی عورت کو سزا دی جائے گی اور ہاتھ کاٹا جائے گا جس سے بڑی رسوائی ہوگی، چناں چہ حضورؐ سے سفارش کے لیے آپ کے حبیب حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو آمادہ کیا، جب انھوں نے حضورؐ سے اس موضوع پہ گفتگو کی تو آپؐ بہت ناراض ہوے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعیّن کی ہوئی حد میں تم سفارش کرتے ہو؟ پھر آپؐ نے صحابہ کو جمع فرما کر خطبہ دیا اور فرمایا:

”تم سے پہلے کے لوگ اس لیے ہلاک ہوگئے کہ ان میں کا اگر کوئی شریف شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور اگر کوئی کمزور شخص چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے (یعنی سزا دیتے)۔ اللہ کی قسم، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا“۔

[بخاری شریف]

دوسری مثال حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد خلافت کی ذکر کرتا ہوں، حضرت عمرؓ

کے دربار میں ایک مصری قبطی (غیر مسلم) حاضر ہوتا ہے، مصر سے مدینہ منورہ کا سفر طے کر کے اس لیے آتا ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسلامی عدالت میں انصاف ضرور ملے گا، چناں چہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کرتا ہے: «عَائِذٌ بِكَ مِن الظُّلْمِ» ظلم سے آپ کی پناہ میں اپنی فریاد لے کر آیا ہوں، پھر اس نے قصہ بیان کیا کہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے کے ساتھ دوڑ میں میرا مقابلہ ہوا، میں آگے بڑھ گیا تو اس نے مجھے کوڑے سے مارتے ہوئے کہا کہ تم معزز خاندان کے فرزند سے آگے کیسے بڑھ سکتے ہو؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاص کے پاس خط بھیجا اور ان کو صاحب زادے کے ساتھ طلب کیا۔ جب وہ آگئے تو واقعے کی تحقیق کے بعد اس مصری کو حضرت عمرؓ نے کوڑا دیا اور کہا کہ معزز خاندان کے فرزند کی پٹائی کرو، چناں چہ اس نے کوڑا لے کر اتنا مارا کہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم دل ہی دل میں کہنے لگے کہ اب یہ بس کر دیتا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو ابن العاص سے اپنا تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

«مُذْ مَتَى اسْتَعْبَدتُّمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدتْهُمْ أَمَّهَاتُهُمْ أَحْرَارًا؟». "تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا ہے، حالاں کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا؟"۔

حضرت عمروؓ نے کہا: امیر المؤمنین! مجھے تو اس واقعے کی کوئی خبر ہی نہ تھی اور نہ ہی یہ شخص میرے پاس آیا، یعنی اگر وہ ان کی خدمت میں گیا ہوتا تو وہاں بھی اسے انصاف ملتا، کہ وہ بھی اسی مدرسۂ نبوت کے تربیت یافتہ تھے جس کے تربیت یافتہ حضرت عمرؓ تھے۔ [کنزل العمال]

یہ ہے عظیم اسلامی شریعت اور اس کی عدالت جہاں انسانی حقوق کی رعایت صرف

قول سے نہیں، بلکہ فعل سے کی گئی ہے، جس نے انسان کی قدر وقیمت اور اس کی عزت وکرامت کو اتنا بلند کیا اور ایسا مقام عطا کیا کہ ایک غیر مسلم کو بھی یقین تھا کہ اسلامی عدالت میں اس کے حقوق پامال نہیں ہوسکتے، اور ایسا ہی ہوا، ایک عام آدمی کے لیے گورنر کے بیٹے سے انتقام لیا گیا۔

اپنی قوم سے خطاب

انسان کی تکریم اور حقوق انسانی کی تعلیم کا اسلام نے صدیوں پہلے اعلان کردیا تھا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ خود خالقِ کائنات نے انسان کو حسین سانچے میں ڈھال کر، نہایت اعتدال کے ساتھ اس کی تخلیق کرکے اس کے اندر روح پھونکی، پھر تمام مخلوقات پر اسے فضیلت بخشی، اس کے حقوق وواجبات بیان کیے ——— ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنا کر نبی اسلام خاتم النبیین محمد ﷺ نے نظامِ الٰہی کا نمونہ پوری دنیا کے سامنے پیش فرمایا، پھر صحابۂ کرامؓ نے بھی آپؐ کے مبارک نہج پہ چل کر آپؐ کے مشن کو آگے بڑھایا، چناں چہ اس عادلانہ، مخلصانہ اور ہم دردانہ نظام کو دیکھ کر بڑی تعداد میں لوگ اسلامی پرچم تلے جمع ہوگئے، ان تعلیمات پر عمل کی وجہ سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا، اس عہد زریں سے بہتر اور عمدہ عہد انسانی نگاہوں نے کبھی نہیں دیکھا، اس کی تعلیمات اور اس کے دستور وقوانین میں ساری انسانیت کا احترام، ان کے حقوق وواجبات کی تفصیلات اور مکمل نظامِ حیات موجود ہے، ہر چند کہ حسد کی بنیاد پر دوسری قوموں نے اسے پنپنے اور پروان چڑھنے نہیں دیا اور اس کے نظام کو نافذ ہونے سے روکے رکھا، تاہم اس کی کشش نے دنیا کے ایک چوتھائی انسانوں کو اپنا ہم نوا بنالیا، اور اس وقت آبادی کے تناسب اور تعداد کے اعتبار

سے دنیا کا سب سے بڑا دوسرا مذہب ہے، ایک وقت آئے گا اور یقینی طور پر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو ہر کچے پکے مکان میں داخل فرمائیں گے، خواہ وہ عزت وسرفرازی کے ساتھ اسے قبول کریں یا ذلت وخواری کے ساتھ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کی پیشین گوئی ہے۔[مسند احمد]

اب ہم سے دو مطالبے ہیں، ایک تو یہ کہ پورے فخر واعتزاز کے ساتھ ہم اللہ کی اس مقدس شریعت پر عمل پیرا ہوں، اسلامی اخلاق کا نمونہ پیش کریں، کردار وگفتار میں خلافتِ ارضی کا رنگ وڈھنگ پیدا کریں۔ دوسرا یہ کہ اسلام نے جو انسانی حقوق دیے ہیں، انسان کی جو قدر وقیمت بیان کی ہے اور جس حقیقی مساوات کی تعلیم دی ہے اسے دوسروں تک پہنچائیں، اسلام کے عادلانہ اور خیر خواہانہ نظام سے انسانیت کو روشناس کرائیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے "خیرِ امت" کا لقب اسی لیے ملا ہے کہ دوسروں کو بھی اس "نظام خیر" سے آگاہ کریں، انہیں اس کی دعوت دیں، اس کا تعارف کرائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ...﴾

[آل عمران: ۱۱۰]

"تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو..."

[سورۂ آل عمران:۱۱۰]

❊ ❊ ❊

۱۴۲۹/۴/۱۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توبہ واستغفار کی اہمیت

زندہ دل انسان

ایمان لانے سے پہلے اور گناہوں سے توبہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے سے پہلے ہر انسان ایک مرے ہوئے لاشے کی طرح ہوتا ہے، گویا کہ بے معنی اور بے مقصد زندگی گزار رہا ہوتا ہے، اندھیروں میں بھٹک رہا ہوتا ہے، اپنی آنکھوں سے ہدایت کی نشانیوں کو دیکھ نہیں پاتا، اپنے کان سے حق کی آواز سن نہیں پاتا، دل اتنا سخت ہو چکا ہوتا ہے کہ گویا کہ وہ دل نہیں، بلکہ پتھر کا سل ہے، قرآنِ کریم کے بلیغ اسلوب میں:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ ءَاذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَآ﴾ [الأعراف: ۱۷۹]

”ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں“۔[سورۂ اعراف:۱۷۹]

لیکن جو سچا مومن ہوتا ہے، گناہوں سے صدق دل سے تائب ہوجاتا ہے، توبہ اور استغفار کے ”ماء طہور“ سے اپنے دل کو پاک صاف کرلیتا ہے اور جذبۂ محبت کے ساتھ

اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، تو حقیقت میں یہی وہ انسان ہے جو ''زندہ دل'' انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''انسان کی پیدائش دو مرتبہ ہوتی ہے، ایک بار جب اس کی ماں اسے جنتی ہے، اس پیدائش میں سارے انسان شریک ہیں، یہاں تک کہ چوپائے بھی اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، مومن اور کافر بھی اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب وہ انسان کفر و شرک اور دیگر معاصی سے توبہ کرکے حقیقی ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس ''حیاتِ نو'' اور ''حلاوتِ حیات'' کا احساس صرف ایمان والے کے لیے مقدر ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے:

﴿أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾﴾ [الأنعام: ۱۲۲]

''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو، اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں''۔ [سورۂ انعام: ۱۲۲]

''پہلے مردہ تھا'' سے مراد یہ ہے کہ وہ مردہ دل تھا، مردہ ارادۂ و عزیمت تھا، اس کا کام صرف کھانا پینا، فسق و فجور میں مبتلا ہونا اور حدود اللہ کو پامال کرنا تھا، چناں چہ اللہ تعالیٰ

نے اسے زندگی بخشی ایمان کے ذریعے، قرآن کے ذریعے، طاعات وعبادات کے ذریعے؛ لہٰذا وہ اس نئی پیدائش کے بعد شرک وبدعات اور معاصی ومنکرات کو چھوڑ کر اللہ کی طرف لوٹ آیا ـــــ یہ نئی زندگی بھی اللہ ہی کی توفیق سے ملتی ہے، جب کسی بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں، جب تھوڑی بھی طلب ہو بندے کے دل میں، اپنے گناہوں پر ندامت ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عذاب دینا نہیں چاہتے، وہ تو نوازنا چاہتے ہیں:

﴿مَّا يَفْعَلُ ٱللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَءَامَنتُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿١٤٧﴾﴾ [النساء: ١٤٧]

”اللہ تعالیٰ تمہیں سزادے کر کیا کرے گا؟ اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور ایمان لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حالات کا پوری طرح علم رکھتا ہے“۔

[سورۂ نساء:۱۴۷]

ہم تو مائل بکرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہ روِ منزل ہی نہیں

بڑے گناہوں سے اجتناب، چھوٹے گناہوں کا کفارہ

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ سورۂ نساء کی پانچ آیتیں ایسی ہیں کہ اگر ساری دنیا اور دنیا کی ساری نعمتیں بھی مجھے مل جائیں تو ان سے اتنی خوشی نہیں ہوگی جتنی ان آیتوں سے مجھے خوشی ملتی ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

﴿إِن تَجۡتَنِبُواْ كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُم مُّدۡخَلٗا كَرِيمٗا ٣١﴾[النساء: ٣١]

”اگر تم ان بڑے گناہوں سے پرہیز کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو تمہاری چھوٹی برائیوں کا ہم خود کفارہ کردیں گے، اور تم کو ایک باعزت جگہ داخل کریں گے“۔

[سورۂ نساء:۳۱]

لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس حرام کاموں کے ارتکاب کے سارے وسائل و ذرائع مہیا ہوں، حرام مال حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، چوری کرنے پر قدرت ہو، نفسانی خواہشات کی تکمیل حرام طریقے پر کرنے کی استطاعت و سہولت ہو، ان سب کے باوجود اللہ کے خوف سے ان کبیرہ گناہوں کو چھوڑ دے، تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کے چھوٹے گناہوں کو بھی معاف فرمادیتے ہیں۔

کِفل کی توبہ اور اعلانِ مغفرت

اللہ کے خوف سے گناہوں کا ترک کرنا، اللہ کو اتنا محبوب ہے کہ نہ صرف اس کی وجہ سے چھوٹے گناہ معاف فرماتے ہیں، بلکہ خوش ہوکر اس کی مغفرت و بخشش کا اعلان فرمادیتے ہیں۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس کا نام ”کفل“ تھا، کوئی گناہ نہیں چھوڑتا تھا، ہر طرح کے گناہوں میں ملوث تھا، چناں چہ ایک روز اس کے پاس ایک عورت آئی، کفل نے اس کے ساتھ بدکاری کے لیے ساٹھ دینار دیے، پھر جب وہ اس کے آگے اس طرح بیٹھا جس طرح مرد اپنی بیوی کے آگے بیٹھتا ہے تو وہ کانپنے لگی اور رونے لگی، تو اس شخص نے اس

سے پوچھا: کیوں روتی ہو، کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی زبردستی کی ہے؟ تو اس نے کہا، نہیں، لیکن آج میں وہ کام کر رہی ہوں جو کبھی نہیں کیا، اور اس کام پر مجھے سخت ضرورت نے مجبور کیا ہے —— یہ سن کر کفل نے کہا کہ تم جاؤ اور یہ سب دینار بھی لے لو، پھر اس نے کہا: اللہ کی قسم! آج کے بعد کبھی بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ پھر اسی رات اس شخص کا انتقال ہو گیا، چناں چہ صبح کے وقت اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا:

«إِنَّ اللهَ قَدْ غَفَرَ لِلْكِفْلِ» ”یعنی اللہ تعالیٰ نے کفل کی بخشش فرمادی“۔ [ترمذی واحمد]

انسان کے گناہ خواہ کتنے ہی بڑے ہوں اور بڑی تعداد میں ہوں، اگر وہ ندامت کے ساتھ ان کو چھوڑ کر اللہ کی بارگاہ میں اپنی توبہ پیش کرے تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، بلکہ سچی توبہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیا جاتا ہے۔

انسان سے گناہ کا ارتکاب باعث تعجب نہیں...

کسی بھی شخص سے گناہ کا صدور اور معصیت کا ارتکاب کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے، کیوں کہ ہر انسان کے ساتھ نفسِ امارہ لگا ہوا ہے جو گناہوں پر ابھارتا ہے، اسی طرح انسان کا دشمن شیطان بھی اس کے رگوں میں خون کی لہروں کی طرح دوڑتا ہے، لہٰذا ان دونوں کی شدید تاثیر کی بنیاد پر گناہ کا سرزد ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، البتہ اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اگر گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کے صاف پانی سے اس کی ناپاکی کو دھو ڈالے، توبہ واستغفار میں ذرا بھی تاخیر نہ کرے۔

اسی وجہ سے رسول اکرم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوا لَذَهَبَ اللهُ بِكُمْ، وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُونَ، فَيَسْتَغْفِرُونَ اللهَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ». [رواه مسلم]

"قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم لوگ گناہ نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھالیں گے اور پھر ایسی قوم لائیں گے جو گناہ کرے گی اور اللہ سے بخشش طلب کرے گی تو اللہ انہیں معاف فرمائیں گے"۔[مسلم شریف]

اس حدیث پاک سے یہ معلوم ہوا کہ مومن گناہ تو ضرور کرے گا، لیکن فوراً معافی بھی مانگ لے گا، گناہ پر اصرار نہیں کرے گا—— مومن اپنے گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے اس کے سر پر ایک پہاڑ کا بوجھ ہے جب تک توبہ واستغفار سے اسے اپنے نامۂ اعمال سے مٹا نہ ڈالے اس وقت تک اسے چین نہیں آتا، صدق دل سے توبہ کرلینا گناہوں کو بالکل اس طرح مٹا دیتا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔

«التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ». [رواه ابن ماجه]

"گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس کا کوئی گناہ ہی نہیں ہے"۔ یعنی کوئی گناہ باقی ہی نہیں رہ جاتا۔[ابن ماجہ]

گناہوں کا پہاڑ بھی ہو تو صدق دل سے توبہ کرلینا اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، کیوں کہ رب غفور کا اعلان ہے:

﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا ثُمَّ ٱهْتَدَىٰ ﴿٨٢﴾﴾

[طه: ٨٢]

"اور یہ حقیقت ہے کہ میں انہیں بخش دینے والا ہوں جو توبہ کریں، ایمان

لائیں، نیک عمل کریں اور سیدھے راستے پر قائم رہیں"۔[سورۂ طہٰ:۸۲]

توبہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں، کیوں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کچھ پتہ نہیں کہ کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے گی، اگر خدانخواستہ توبہ کے بغیر ہی موت آگئی تو پھر وہاں کی حسرت کوئی کام نہ دے گی، انسان تمنا کرے گا کہ دوبارہ دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تاکہ توبہ کرکے عمل صالح کا پابند ہوجائے؛ لیکن اس کی تمنا خاک میں مل جائے گی۔

ایک شخص کی توبہ کا دلچسپ قصہ

علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے لکھا ہے کہ ایک نوجوان شخص ایک کشتی میں سوار ہوا، اس کشتی میں پہلے سے ہی ایک شخص سوار تھا جس کے ساتھ ایک خوب رو باندی بھی تھی، جب کھانے کا وقت آیا تو اس شخص نے کشتی بان سے کہا کہ اس نوجوان کو بلاؤ تاکہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے، جب اس کو بلایا گیا تو اس نے انکار کردیا، لیکن اس نے اتنا اصرار کیا کہ مجبوراً اس نوجوان کو آنا پڑا، جب کھانے سے فارغ ہوگئے تو وہ نوجوان اٹھ کر جانے لگا، لیکن اس "خوش حال" شخص نے اسے منع کیا اور کہا کہ بیٹھو، اس کے بعد اپنی تھیلی منگائی جس میں شراب تھی، چناں چہ خود بھی پیا اور اپنی باندی کو بھی پلایا، پھر اس نوجوان کو بھی پیش کیا، تو اس نے پینے سے صاف انکار کردیا اور کہا کہ میری معذرت قبول کرو، اس نے کہا کہ معذرت قبول ہے، لیکن کہیں جاؤ مت، یہیں بیٹھو، چناں چہ وہ بیٹھا رہا، اتنے میں اپنی باندی سے کہا کہ اب جو تمہارے پاس ہے وہ پیش کرو، چناں چہ اس نے اپنے تھیلے سے سارنگی نکالی اور اسے درست کرکے گیت گانا شروع کردیا، تھوڑی دیر بعد اس شخص نے اس نوجوان سے کہا: کیا تم بھی اس طرح گا سکتے ہو؟ تو اس نے کہا: میں اس سے حسین انداز

میں اس سے بہترین کلام پیش کر سکتا ہوں، پھر اس نے اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد یہ آیت پڑھی:

﴿قُلۡ مَتَٰعُ ٱلدُّنۡيَا قَلِيلٞ وَٱلۡأٓخِرَةُ خَيۡرٞ لِّمَنِ ٱتَّقَىٰ وَلَا تُظۡلَمُونَ فَتِيلًا ۝٧٧ أَيۡنَمَا تَكُونُواْ يُدۡرِككُّمُ ٱلۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنتُمۡ فِي بُرُوجٖ مُّشَيَّدَةٖۗ﴾

[النساء: ۷۷ – ۷۸]

"آپ کہہ دیجیے کہ دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے، اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اس کے لیے آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، تم جہاں بھی ہوگے (ایک نہ ایک دن) موت تمہیں جا پکڑے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ رہ رہے ہو"۔ [سورۂ نساء: ۷۷-۷۸]

یہ انقلاب انگیز آیتیں سن کر اس شخص کے دل کی دنیا بدلنے لگی اور اس نے شراب کا پیالہ پانی میں پھینک دیا اور کہا، میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جو پہلے سنا، کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے؟ تو اس نوجوانِ صالح نے کہا: ہاں، پھر اس نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَقُلِ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّكُمۡۖ فَمَن شَآءَ فَلۡيُؤۡمِن وَمَن شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡۚ إِنَّآ أَعۡتَدۡنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمۡ سُرَادِقُهَاۚ وَإِن يَسۡتَغِيثُواْ يُغَاثُواْ بِمَآءٖ كَٱلۡمُهۡلِ يَشۡوِي ٱلۡوُجُوهَۚ بِئۡسَ ٱلشَّرَابُ وَسَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا ۝٢٩﴾ [الكهف: ۲۹]

"اور آپ کہہ دیجیے کہ: یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔ ہم نے بے شک ایسے ظالمو کے لیے آگ

تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو گھیرے میں لے لیں گی اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد کا جواب ایسے پانی سے دیا جائے گا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا، جو چہروں کو بھون کر رکھ دے گا، کیسا بدترین پانی اور کیسی بری آرام گاہ"۔[سورۂ کہف:۲۹]

چوں کہ وہ شخص عربی سمجھتا تھا اس لیے یہ معجزانہ کلام اس طرح اس کے دل کو لگا کہ اس نے شراب کی تھیلی پانی میں پھینک ڈالی اور آلاتِ موسیقی کو بھی توڑ کر پھینک دیا، پھر اس نوجوانِ صالح کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ: بیٹا! مجھ جیسے گنہ گار کے لیے بھی کوئی نجات کا راستہ ہے؟ کوئی امید کی کرن ہے؟ تو اس نے کہا کہ یقیناً ہے اور اس نے اس آیت کی تلاوت کی:

﴿قُلْ يَـٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾﴾

[الزمر: ۵۳]

"آپ کہہ دیجیے کہ: اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر رکھی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو— یقین جانو اللہ تعالیٰ سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے— یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے"۔

[سورۂ زمر:۵۳] (کتاب التوابین لابن قدامہؒ)

بلاشبہ ہر وہ شخص جس نے اپنی جان پر ظلم وزیادتی کر رکھی ہے، گناہوں سے دل کو ناپاک کر رکھا ہے، معاصی میں لت پت ہو چکا ہے، اگر اس کے دل میں ندامت پیدا ہو، تو وضو کرے اور دو رکعتیں ادا کر کے اللہ کی بارگاہ میں ندامت کے آنسو بہائے تو ربِّ کریم دریائے مغفرت سے اس کے تمام گناہ معاف فرما دیں گے۔

گناہوں سے کیسے بچیں؟

پہلے عرض کیا گیا کہ انسان سے گناہ کا صدور کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے، البتہ اس پر جمے رہنا، اصرار کرنا اور توبہ نہ کرنا یہ اس کی شان کے خلاف ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گناہ کا احساس بھی ختم ہوجائے اور توبہ کی توفیق نہ مل سکے، اس لیے حتی الامکان گناہ کے اسباب سے ہی دور رہیں اور نیکی، پرہیزگاری اور دیانت داری کے ماحول سے خود کو وابستہ رکھیں۔

جہاں تک ممکن ہو معصیت کے ماحول سے اپنے آپ کو دور رکھیں، ایسے دوست واحباب سے کنارہ کش ہوجائیں جن کی ہم نشینی اللہ سے دور کردیتی ہو۔

ننگی اور عریاں تصویروں اور فلموں سے اپنے آپ کو بچائیں، نفس پر قابو رکھنے کی کوشش کریں، مجاہدۂ نفس کی مشق کریں تو یہ عادت ختم ہوسکتی ہے، گندی اور ننگی تصویریں دیکھنے کا اگر نشہ لگ چکا ہو اور یہ عادت ختم نہ ہو رہی ہو تو اللہ تعالیٰ کا دھیان اور استحضار پیدا کریں، کثرت سے لمبی لمبی دعائیں مانگیں اور اہلِ دل کی مجالس میں حاضری دیا کریں، اہل علم اور اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں، تدبّر کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کریں اور صلحاء کے مواعظ بھی سنا کریں —— اس طرح امید ہے کہ یا تو گناہوں کا ارتکاب ہی نہیں ہوگا یا اگر ہوا بھی تو ان شاء اللہ فوراً توبہ کی توفیق مل جائے گی۔

غائبانہ خشیتِ الٰہی اور اس کا صلہ

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اپنے مولائے کریم کو دیکھا نہیں، بلکہ غیب پر ایمان لائے،

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے امانت داری کے ساتھ اللہ کا پیغام ہم تک پہنچایا، ہم نے صدق دل سے قبول کیا، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر پر ہم ایمان لائے، اللہ تعالیٰ کی قادر مطلق ہستی کے سامنے سجدہ ریز ہوئے، خالص اسی کی عبادت کی، صرف اسی سے امید وخوف کا رشتہ قائم کیا، بغیر دیکھے ہوئے اس کے خوف سے گناہوں سے باز رہے اور اگر گناہ کا ارتکاب بھی ہوا تو اس کے خوف سے فوراً توبہ کرلی، تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ "حیاتِ طیبہ" عطا فرمائیں گے اور آخرت میں اس طرح اکرام فرمائیں گے کہ: ﴿ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ﴾ یعنی جنت میں سلامتی کے ساتھ داخلے کا پروانہ دے دیں گے۔ فرمانِ الٰہی کو پڑھیے اور اس کے ہر ہر لفظ پہ غور کیجیے، کتنا حسین کلام ہے اور کتنی عظیم بشارت ہے:

﴿ مَّنْ خَشِيَ ٱلرَّحْمَٰنَ بِٱلْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾ ٱدْخُلُوهَا بِسَلَٰمٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ ٱلْخُلُودِ ﴿٣٤﴾ لَهُم مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿٣٥﴾ ﴾

[ق: ۳۳ – ۳۵]

"جو خدائے رحمن سے اسے دیکھے بغیر ڈرتا ہو، اور اللہ کی طرف رجوع ہونے والا دل لے کر آئے (تو ان سے کہا جائے گا) تم سب اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہوگا۔ ان (جنتیوں) کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہاں وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس کچھ اور زیادہ بھی ہے"۔ [سورۂ ق: ۳۳-۳۵]

ایسے کرم نواز، قدر دان اور مہربان رب سے اگر اپنا قلبی تعلق قائم نہ کریں تو کس سے کریں؟ کیا اس کے سوا کوئی ماویٰ اور ملجا ہے؟ یا اس کے علاوہ کسی اور کے پاس جانا ہے؟ سب کو بالآخر اسی کی بارگاہ میں پہنچنا ہے، لہٰذا ہر وقت حاضری کی تیاری رکھیں، توبہ واستغفار

میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں۔

﴿وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٣١﴾﴾ [النور: ٣١]

”اور اے مومنو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو“۔

[سورۂ نور:۳۱]

***

۱۴۲۷/۸/۱۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علم حاصل کیجیے!

پہلی وحی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے اوپر سب سے پہلی بار نازل ہونے والی وحی کے الفاظ یہ تھے:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿١﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿٢﴾ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿٣﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٥﴾﴾

[العلق: ۱ — ۵]

”پڑھیے اپنے پروردگار کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا، اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی، انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا“۔[سورۂ علق:۱-۵]

ان مبارک آیات کے ذریعے نہ صرف علم وقلم کی قدر وقیمت کو بیان کیا گیا؛ بلکہ جہالت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ ہر عظیم انسان کی شخصیت کی تعمیر میں

پہلی اینٹ تحصیل علم اور قراءت وکتابت ہے۔

اہلِ علم کے مقام ومرتبے کو اللہ تعالیٰ نے اتنا بلند فرمایا کہ جب اپنی اُلوہیت ووحدانیت کے اقرار اور اپنی عدالت وانصاف کے اثبات پر اپنی شہادت وگواہی اور فرشتوں کی گواہی کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی ساتھ ان کی شہادت وگواہی کا بھی ذکر فرمایا کہ اہلِ علم بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

﴿ شَهِدَ ٱللَّهُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَأُوْلُواْ ٱلْعِلْمِ قَآئِمَۢا بِٱلْقِسْطِ ۚ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿١٨﴾ ﴾ [آل عمران: ١٨]

”اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی گواہی دی ہے، اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے انصاف کے ساتھ (کائنات کا) انتظام سنبھالا ہوا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں جس کا اقتدار بھی کامل، حکمت بھی کامل“۔[سورۂ آل عمران:۱۸]

اس کے علاوہ بھی متعدّد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل علم کی قدر ومنزلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

علم اور اہل علم کی فضیلت

حقیقت یہ ہے کہ جہالت ایک تاریکی ہے اور راستے کی تاریکی علم کے چراغ سے ہی دور ہوگی، علم کی روشنی کے بغیر انسان بھٹکتا پھرے گا، نہ اسے معرفتِ خداوندی حاصل ہوگی، نہ ہی راہِ نجات اور راہِ جنت کا پتہ چلے گا، علم کے ذریعے ہی اللہ کی معرفت بھی حاصل ہوگی اور جنت کا راستہ بھی معلوم ہوگا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ». [رواه مسلم]

"جو شخص اس راستے پر چلتا ہے جس میں وہ علم کا متلاشی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں"۔ [مسلم شریف]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، حَتَّى الْحِيتَانِ فِي الْمَاءِ، وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا، إِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ». [رواه أحمد وأبوداؤد والترمذي]

"بیشک فرشتے اپنے پروں کو طالب علم کی خوشی کے لیے بچھا دیتے ہیں، اور طالب علم کے لیے آسمان وزمین کی تمام مخلوقات بخشش طلب کرتی ہیں، یہاں تک کہ پانی کے اندر کی مچھلیاں بھی، اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر، بلاشبہ علماء، انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، اور انبیاء نے کسی کو دینار ودرہم کا وارث نہیں بنایا، بلکہ انھوں نے علم کا وارث بنایا ہے۔ اس لیے جس نے اسے (علم کو) حاصل کرلیا، اس نے دراصل (علوم نبوت کا) پورا پورا حصہ حاصل کرلیا"۔ [أحمد ابوداؤد والترمذی]

تحصیلِ علم کے لیے مجاہدہ اور قربانی

مذکورہ بالا حدیث پاک میں علم اور اہل علم کی فضیلتیں بیان کرکے اس کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے اور اس راہ میں آنے والی ہر مشقت برداشت کرنے اور صبر کے ساتھ زیور علم سے آراستہ ہونے کا شوق دلایا گیا ہے، اسی لیے سلف صالحین اس عظیم مقصد کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے تھے اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا پر مشقت سفر کرتے تھے، جب انھیں معلوم ہوتا کہ کوئی ذی علم شخصیت کسی دوسرے ملک میں بحرِ علم سے خدا کی پیاسی مخلوق کو سیراب کرنے میں سرگرمِ عمل ہے تو فوراً رختِ سفر باندھتے اور گھر سے نکل پڑتے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ کوئی صحابی مصر میں ہیں جن کے پاس بعض احادیث ایسی ہیں جو ان کے پاس نہیں ہیں تو مدینہ پاک سے مصر کا سفر صرف ان صحابی سے ملنے اور ان سے وہ احادیث معلوم کرنے کے لیے کیا؛ بلکہ علم ومعرفت کے متلاشی اور شوقین حضرات نے خود سے مقام ومرتبے میں کم تر لوگوں کے پاس بھی جاکر ان سے وہ علم حاصل کیا جو علم اللہ نے اپنے فضل وکرم سے انہیں عطا فرمایا تھا۔ چناں چہ سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طلب علم کا قصہ بیان فرمایا ہے جو دراصل کلیم اللہ تھے، اللہ تعالیٰ سے جنھیں ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا تھا، ان کے اوپر اپنی کتاب مقدس توراۃ نازل فرمائی جس میں دنیا وآخرت کی فلاح وبہبود کی تفصیلات تھیں، اس کے باوجود جب انھیں حضرت خِضر کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کے پاس کچھ ”مخصوص“ علم ہے تو ان کی تابعداری کے لیے تیار ہوگئے اور کہا:

﴿... هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰٓ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾﴾

[الكهف: ٦٦]

"کیا میں آپ کے ساتھ اس غرض سے رہ سکتا ہوں کہ آپ کو بھلائی کا جو علم عطا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ مجھے بھی سکھادیں۔[سورہ کہف:۶۶]

حضرت خضر کو معلوم تھا کہ جو علم ان کے پاس ہے وہ ایسی نوعیت کا ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام صبر نہیں کر سکیں گے، اس لیے انہوں نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر اپنے صبر کا دامن چھوڑ بیٹھیں گے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کے پیچھے نہ پڑیں، لیکن حضرت موسی تو علم کے رسیا اور دل دادہ تھے، اس لیے ان سے نہایت ادب کے ساتھ ایسا جملہ کہا جو در اصل طلبِ علم کے سلسلے میں استاذ اور شاگرد کے درمیان باہمی ربط و تعلق اور ادب و احترام کے بنیادی اصول کا درجہ رکھتا ہے:

﴿قَالَ سَتَجِدُنِىٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ صَابِرًا وَلَآ أَعْصِى لَكَ أَمْرًا ﴿٦٩﴾﴾

[الكهف: ٦٩]

"موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور کسی بات میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا"۔[سورۂ کہف:۶۹]

اس سے معلوم ہوا کہ تحصیل علم کے لیے ایک تو صبر کی ضرورت ہے، دوسرے استاذ کی فرماں برداری کی بھی، جب موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ سے مقام و مرتبے میں کم تر استاذ کی نافرمانی نہ کرنے کا عہد و پیمان دے رہے ہیں تو جو استاذ اپنے طالب علم سے مقام و مرتبے میں برتر ہو اس کی نافرمانی کر کے علم کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

علم میں برکت کے لیے دعاء

علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو یہ حکم فرمایا کہ آپ زیادتی علم کے لیے دعا کیا کیجیے:

﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿١١٤﴾﴾ [طه: ١١٤]

"اور یہ دعا کرتے رہا کرو کہ: اے میرے پروردگار! مجھے علم میں اور ترقی عطا فرما"۔[سورۂ طٰہٰ:۱۱۴]

چناں چہ رسول اکرم ﷺ نفع بخش علم میں اضافے کی دعا کیا کرتے تھے، آپؐ کی دعا کے یہ الفاظ ہوتے تھے:

«اللَّهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتنِي، وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي، وَزِدْنِي عِلْمًا». [الترمذي]

"اے اللہ! مجھے اس علم سے نفع پہنچا جو تو نے مجھے سکھلایا، اور مجھے وہ علم عطا فرما جو مجھے فائدہ پہنچائے اور میرے علم میں اضافہ فرما"۔[ترمذی شریف]

علم میں زیادتی اور برکت کی دعا اور اس کے لیے جد وجہد اور قربانی اس لیے بھی ضروری ہے کہ علم ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں، چاہے جس قدر علم حاصل کرلیا جائے، ہر عالم سے بڑھ کر کوئی دوسرا عالم ضرور ہوگا:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾﴾[يوسف: ٧٦]

"اور ہر ذی علم پر فوقیت رکھنے والا دوسرا ذی علم موجود ہے"۔[سورۂ یوسف:۷۶]

حضرت امام بصریؒ فرماتے تھے:

"ہر عالم سے برتر کوئی دوسرا ضرور ہوگا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ کی ذات علام الغیوب تک پہنچ جائے"۔

علم نافع اور عملِ صالح کے بغیر رضائے الٰہی، قربِ الٰہی اور جنت خداوندی کا حصول محال ہے، آخرت کی کامیابی کا دارومدار علم نافع پر ہے جس علم کو لے کر انبیائے کرام علیہم السلام تشریف لائے اور جو علم اللہ نے اپنی کتابوں میں اُتارا، وہی علم دراصل رہنما اور ساری انسانیت کے لیے رہبر ہے جو انھیں جہالت کی تاریکی اور شکوک وشبہات کے پر خطر غاروں سے نکال کر ایمان ویقین کی روشنی عطا کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو "نور" کے لفظ سے بھی ذکر فرمایا ہے جو نور تاریکیوں اور ظلمتوں کو دور کرتا ہے:

﴿فَـَٔامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلنُّورِ ٱلَّذِيٓ أَنزَلۡنَاۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٞ ۝٨﴾ [التغابن: ۸]

"لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے"۔[سورۂ تغابن:۸]

علم سے مراد کون سا علم ہے؟

شریعت میں جس علم کی ترغیب دی گئی ہے اور جس کے بے شمار فضائل بیان کیے گئے ہیں، اس علم سے مراد وہ علم ہے جس سے حلال و حرام کی تمیز ہو، جس کے ذریعے فرائض وواجبات اور سنن و مستحبات کا علم ہو، یعنی جس سے حقوق اللہ اور حقوق العباد معلوم ہوں۔ اسی طرح جس علم کے توسط سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو وہ علم مراد ہے، اس مفہوم کے اعتبار سے علم کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، لہٰذا ہر وہ

علم جو انسانی عقل کی پرواز کو بڑھائے، اس کی فکر ونظر کو وسیع کرے، خواہ وہ نباتات وحیوانات کا علم ہو، یا جمادات وارضیات کا علم ہو جس کے ذریعے خالق کی عظمت وکبریائی تک رسائی ہو وہ بھی بلاشبہ اس علم میں داخل ہوگا۔

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جب علم اور اہل علم کی شان کو بیان فرمایا تو ان کے اوصاف کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر فرمائی کہ وہ مخلوقات کی عظمتِ شان کو پہچان کر خالق کی عظمت پر استدلال کرتے ہیں، اللہ کی پیدا کی ہوئی مختلف انواع کی چیزوں پر عبرت کی نظر ڈالتے ہیں، ان میں غور وفکر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں انھیں اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس معرفت کے نتیجے میں ان کے دل میں خشیت پیدا ہوتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ أَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَا بِهِۦ ثَمَرَٰتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَٰنُهَا ۚ وَمِنَ ٱلْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَٰنُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ ٱلنَّاسِ وَٱلدَّوَآبِّ وَٱلْأَنْعَٰمِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَٰنُهُۥ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَٰٓؤُا۟ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾﴾ [فاطر: ۲۷ – ۲۸]

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے رنگ برنگ کے پھل اگائے؟ اور پہاڑوں میں بھی ایسے ٹکڑے ہیں جو رنگ برنگ کے سفید اور سرخ ہیں، اور کالے اور سیاہ بھی ــــ اور انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی ایسے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں ــــ اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ یقیناً اللہ صاحب اقتدار بھی ہے،

بہت بخشنے والا بھی“۔ [سورۂ فاطر:۲۷-۲۸]

تاہم ان اشیاء کو دیکھ کر خدائے بزرگ وبرتر کی عظمت پر استدلال صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے، لیکن جو لوگ اس معرفت وعظمت کے ادراک سے محروم ہیں، وہ کائنات کے عجائب وغرائب کو دیکھنے کے باوجود خالق کی عظمت وکبریائی تک نہیں پہنچ پاتے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْ ءَايَٰتِهِۦ خَلْقُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَٰفُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَٰنِكُمْ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّلْعَٰلِمِينَ ﴿٢٢﴾ ﴾

[الروم: ۲۲]

”اور اس کی نشانیوں کا ایک حصہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں دانش مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں“۔[سورۂ روم:۲۲]

اس آیتِ کریمہ میں جن اہل علم اور دانش مندوں کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو زمین وآسمان کی تخلیق اور رنگ وزبان کے اختلافات کے مشاہدے اور ان پر ریسرچ کے توسط سے عظمت خالق پر استدلال کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں جس علم کا حصول مطلوب ہے اور جس کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، بنیادی طور پر اس سے علم شریعت مراد ہے، لیکن اگر اخلاص اور نیت کی درستگی ہو تو اس میں ہر وہ علم شامل ہے جس کے ذریعے خالق کائنات کی توحید وعظمت کا پتہ ملتا ہو، اسی طرح وہ علم بھی اس میں داخل ہوگا جس کے توسط سے اللہ کی زمین

کی سرسبزی و شادابی ہورہی ہو، اور جس کے ذریعے اہل اسلام سربلندی و سرفرازی اور عزت وافتخار کی زندگی گزار سکیں اور جس سے ان کی اقتصادی اور سیاسی بالادستی قائم ہواور وہ احساس کمتری سے نکل کر خودداری واستغناء کے ساتھ حوصلہ مندانہ زندگی بسر کرسکیں۔

علم اور اہل علم کے سلسلے میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے زرّیں اقوال

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں:

”تم علم حاصل کرو، کیوں کہ علم سے اللہ تعالیٰ کی خشیت حاصل ہوتی ہے، علم کی طلب عبادت ہے، اس کا مذاکرہ تسبیح ہے، اس کی جستجو میں لگنا جہاد ہے، کسی ناخواندہ کو تعلیم دینا صدقہ ہے، اس سے دوسروں کو نفع پہنچانا باعث اجر وثواب ہے؛ کیوں کہ علم دراصل حلال وحرام کے لیے سنگِ میل، اہل جنت کے لیے مشعلِ راہ، خوشی اور غمی میں راہ نما، دشمنوں کے خلاف ہتھیار اور دوستوں کے لیے باعث رونق وزینت ہے، اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ قوموں کو رفعت وسربلندی عطا فرماتا ہے، پھر انھیں خیر وبھلائی کے قائد اور امام بنادیتا ہے جن کے نقوشِ قدم کی لوگ پیروی کرتے ہیں، ان کے کردار وگفتار کی نقل کرتے ہیں، ان کی آراء کو حرف آخر مانا جاتا ہے، فرشتے ان کی دوستی کی آرزو کرتے ہیں، اپنے شفقت کے پَراُن پر پھیرتے ہیں، ہر خشک وتر چیز ان کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہے، یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور دیگر جانور اور خشکی کے درندے اور چوپائے بھی، اس لیے کہ علم مردہ دلوں کو حیات اور ظلمتوں میں نگاہوں کو روشنی اور جلا بخشتا ہے، علم کے ذریعے بندہ برگزیدہ ہستیوں کے مقام اور دنیا وآخرت کے اونچے مرتبے کو پالیتا ہے، اس میں غور وفکر کرنا روزے کے برابر ہے،

اس کا مذاکرہ قیام اللیل کے مساوی ہے، اسی کی روشنی میں صلہ رحمی کی جاتی ہے، اسی سے حلال و حرام کی پہچان ہوتی ہے، علم امام و قائد ہے اور عمل اس کے تابع ہے، نیک بختوں کو ہی اس کا الہام کیا جاتا ہے اور بدبخت اس سے محروم رہ جاتے ہیں"۔

[رواہ ابن عبد البر فی کتابہ: جامع بیان العلم وفضلہ]

ضرورت کے لیے مختلف زبانوں میں مہارت

اپنی مادری زبان میں مہارت اور اس پر فخر اعتزاز ایک فطری بات ہے، بالخصوص عربی زبان سے دلچسپی، اس میں بھرپور مہارت اور اس کی اشاعت ہمارا جزو دین و ایمان ہے، کیوں کہ یہ قرآن مقدس اور احادیث شریفہ کی زبان ہے، خاتم النّبیین محمد بن عبد اللہ ﷺ کی زبان ہے، لیکن اسی کے ساتھ دیگر مفید اور نفع بخش زبانوں کو سیکھنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ یہ وہ عظیم عمل ہے جسے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں ہی جاری فرمایا تھا، چناں چہ آپؐ نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو سُریانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا تھا، حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں یہود کی کچھ تحریر سیکھ لوں، آپؐ نے فرمایا: اللہ کی قسم، میں یہود کی تحریر پر اعتماد واطمینان نہیں کرتا"، چناں چہ ابھی آدھا مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میں نے آپؐ کے لیے اسے سیکھ لیا۔ کہتے ہیں کہ پھر جب میں نے سیکھ لیا اور آپؐ کو یہودیوں کے پاس کچھ لکھ کر بھیجنا ہوا تو میں نے لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا، اور جب یہودیوں نے کوئی تحریر آپؐ کے پاس بھیجی تو آپ کو وہ پڑھ کر میں نے سنادی"۔[ترمذی شریف]

لہٰذا ضرورت کے تحت دوسری زبانیں سیکھنے کی سنت خود رسول اللہ ﷺ نے ہی جاری فرمائی ہے، یہودیوں کی زبان اس زمانے میں سریانی تھی، حضرت زید نے سریانی زبان لکھنا پڑھنا صرف ۱۴روز میں سیکھ لیا، بعد میں یہودیوں کی زبان عبرانی بن گئی۔

ویسے بھی دنیا کی تمام قوموں کی زبان ایک ہوجائے یہ ایک ناممکن سا عمل ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کو اپنی آیات اور نشانیوں میں شمار فرمایا ہے۔

بقائے علم بقائے علماء سے

جب تک صحیح علم کی درخشاں ہدایات لوگوں کو ملتی رہیں گی، لوگ راہِ راست پر رہیں گے، لیکن جب یہ روشنی گل ہوجائے گی تو لوگ ضلالت وگم راہی کی تاریکیوں میں بھٹکنے لگیں گے اور شرک وبدعات میں مبتلا ہوجائیں گے۔ علم کی بقاء در اصل اس کے حاملین کی بقاء سے ہے، جب تک اہل علم رہیں گے اور اپنے علمی سرچشمے سے اخلاص کے ساتھ لوگوں کو سیراب کرتے رہیں گے، لوگ حق پر قائم رہیں گے، لیکن جب اہل علم ہی دنیا سے اٹھ جائیں گے تو فطری بات ہے کہ علم بھی اٹھ جائے گا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، فَإِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمٌ اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا».

[صحيح البخاري]

”اللہ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے بندوں سے چھین لے، بلکہ وہ علماء کو اٹھالے گا جس سے علم بھی اٹھ جائے گا، یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سربراہ بنالیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے، وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، پھر وہ خود بھی گم راہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گم راہ کریں گے۔[بخاری شریف]

❊ ❊ ❊

۲۳/شوال ۱۴۳۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیکی میں تعاون اور برائی میں عدمِ تعاون

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ۝٢﴾ [المائدۃ: ۲]

"اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے"۔ [سورۂ مائدہ:۲]

یہ ارشادِ الٰہی دراصل "جوامع الکلم" میں سے ہے، جس کے اندر بے شمار معانی اور مفاہیم پوشیدہ ہیں، بینادی طور پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو کام کرنے کا حکم فرمایا ہے اور دو کاموں سے بچنے کا: نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے کا حکم دیا ہے اور گناہ اور زیادتی میں تعاون کرنے سے منع فرمایا ہے۔

نیکی اور تقویٰ میں تعاون

(التَّعاوُنُ عَلَی البِرّ والتَّقوی)

نیکی اور تقویٰ کے سلسلے میں تعاون کا حکم حقیقت میں اپنے اندر تمام بھلائیوں کو

سموئے ہوئے ہے، ہر خیر کا کام اس میں شامل ہے: چناں چہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی میں شامل ہے، کیوں کہ اسی سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے، معاشرے کو تباہ وبرباد کرنے والے اسباب کا ازالہ ہوتا ہے، پھر معاشرہ عفت وپاک دامنی، حیا وپاکیزگی اور صداقت وامانت داری کا نمونہ بنتا ہے۔

نفع بخش علم سے دوسروں کے دل ودماغ کو روشن کرنا اور تعلیم کے وسیع میدان میں مخلصانہ کردار ادا کرنا "تعاون علی البر والتقوی" میں شامل ہے، کیوں کہ علم کی روشنی سے جہالت کی تاریکی دور ہوتی ہے، اس کے ذریعے حق وباطل کی معرفت ہوتی ہے اور ان کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے، نیز علم ہی کے توسط سے خیر کی دعوت دی جاتی ہے اور شر سے بچا جاتا ہے؛ بلکہ دوسروں کو بھی بچایا جاتا ہے — "نیکی میں تعاون" یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے حقوق کی ادائیگی ہو، رشتے داروں اور ضرورت مندوں پر مال خرچ کیا جائے، تنگ دست مقروض کو مہلت دی جائے یا معاف کیا جائے، اگر کوئی حاجت مند قرض طلب کرے اور دینے کی استطاعت ہو تو اسے قرض دیا جائے کیوں کہ ان تمام صورتوں میں اپنے بھائی کی مدد ہوتی ہے، اس کو دوسرے کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرنے سے بچایا جاتا ہے، جو ہمدردی اور انسانیت کے ساتھ ساتھ ایک عظیم عبادت بھی ہے جس پر ان شاء اللہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔

معاشرے کے خستہ حال، بے یار ومددگار، ضرورت مند بیواؤں اور یتیموں اور مسکینوں کی کفالت کرنا "نیکی میں تعاون" ہے، اسی طرح اگر کوئی صاحب جاہ ومنصب ہے یا اس کی ذمے داروں اور حکمرانوں تک رسائی ہے تو ضرورت مندوں کے لیے سفارش کرنا

اور ان کی فریاد کو ان تک پہنچانا بھی اسی نیکی میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ مَّن يَشْفَعْ شَفَٰعَةً حَسَنَةً يَكُن لَّهُۥ نَصِيبٌ مِّنْهَا ﴾

[النساء: ۸۵]

"جو شخص کسی نیکی یا بھلے کام کی سفارش کرتا ہے اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے"۔ [سورۂ نساء:۸۵]

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اشْفَعُوا تُؤْجَرُوا» "سفارش کرو، تم کو اجر ملے گا"۔ [بخاری شریف]

خیراتی ادارے قائم کرنا، مسجدوں کی تعمیر کرانا، دینی مدارس قائم کرنا یا ان کو فروغ دینے میں حصہ لینا اور پینے یا وضو کرنے کے لیے پانی کا مستقل انتظام کرنا بھی نیکی میں تعاون ہے۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کے لیے حلقات یا مکاتب کا قیام اور ان میں تدریسی فرائض انجام دینے والے اساتذۂ کرام کی باعزت کفالت بھی اسی میں شامل ہے، جہاں قوم کے نونہالوں کو دین کے بنیادی "مصدر" اور سرچشمے سے وابستہ کیا جائے اور کلامِ الٰہی سے انہیں مربوط کیا جائے جو سراپا عدل وانصاف ہے، امن وسلامتی کا ضامن ہے اور عقیدۂ وعمل اور سلوک واحسان کا محرک ہے۔

صنعتی شہروں کا قیام ...

صنعتی شہروں کی آباد کاری، یا انڈسٹریوں کا قیام بھی اگر حسنِ نیت کے ساتھ ہو تو نیکی

میں تعاون کا ایک بڑا باب ہے، بعض لوگ اس طرح کے کاموں کو دنیاداری کہہ کر دین سے بالکل الگ تھلگ کر دیتے ہیں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ہر عمل کا دارومدار نیتوں پر ہے، اگر ان صنعت گاہوں اور فیکٹریوں کا قیام اس لیے ہو کہ ہماری قوم کو باعزت روزگار فراہم کیا جائے، اسی طرح زندگی کے ہر شعبے کی ضروریات کی تکمیل خود ہماری اپنی مصنوعات سے ہو اور دوسروں کی مصنوعات سے بے نیازی حاصل ہو تو بلاشبہ یہ کارِ خیر ہے، بالخصوص اس دور میں جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، جب کہ اقتصادی اور معاشی اور صنعتی ترقی کے باعث قومیں اپنی بالادستی قائم کر رہی ہیں اور ان میدانوں میں پس ماندہ قوموں کو اپنے پاؤں تلے روندرہی ہیں، اور اپنے من مانی مطالبات سے ان کی کمر توڑرہی ہیں —— اس لیے صنعت کے تمام شعبوں میں خود کفیل ہونا اور درآمدات سے زیادہ برآمدات پہ اپنی توجہ مرکوز کرنا نہ صرف قومی تقاضا ہے، بلکہ مذہبی اور دینی فریضہ بھی ہے، تاکہ دوسروں کی پیداوار پر انحصار کے بجائے اپنی پیداوار کو استعمال میں لائیں، دوسروں کے رحم وکرم پہ زندگی گزارنے کے بجائے خدائے پاک کی ذات پر، پھر اپنے دست وبازو پر بھروسہ کریں اور خود مختاری پیدا کریں۔ اسلام، تواضع اور خاک ساری کی تعلیم ضرور دیتا ہے، لیکن عزت نفس اور خودداری کے ساتھ، اسلام ہمیں باعزت اور سرفرازی کی زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، جس کے لیے محنت ومشقت، قربانی اور جاں فشانی مطلوب ہے نہ کہ عیش پرستی اور آرام طلبی۔

صلح وصفائی کی کوشش

نیکی میں تعاون کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ جن دو شخصوں، دو گروپوں، دو خاندانوں یا

قوموں کے درمیان باہمی نزاع یا اختلاف ہو ان کے درمیان صلح وصفائی کی سعی کریں، ان کے درمیان صلح ومصالحت کے لیے تمام تر وسائل کو بروئے کار لائیں، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور نفرت کی آگ کو محبت کے ٹھنڈے پانی سے بجھانے کی مخلصانہ کوشش کریں، کیوں کہ اسلام آپس میں جوڑ پیدا کرتا ہے نہ کہ توڑ، وہ جھگڑے لڑائی اور قطع تعلقات کو سخت ناپسند کرتا ہے، اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ؟ قَالُوا: بَلَى، قَالَ: «صَلَاحُ ذَاتِ البَيْنِ، فَإِنَّ فَسَادَ ذَاتِ البَيْنِ هِيَ الحَالِقَةُ، وقَالَ: لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ، وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ». [رواه الترمذي]

''کیا میں تمہیں ایسی چیز کی خبر نہ دوں جو مرتبے میں روزہ، نماز اور صدقے سے بھی افضل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: وہ آپس میں صلح صفائی کرادینا ہے، اس لیے کہ آپس کی پھوٹ مونڈنے والی ہے — آپؐ نے یہ بھی فرمایا: میں یہ نہیں کہتا کہ سر کے بال مونڈنے والی ہے؛ بلکہ دین کو ہی مونڈنے والی ہے''۔

[ترمذی شریف]

صلح کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «وَالصُّلْحُ خَيْرٌ» یعنی صلح، سراپا خیر ہی خیر ہے، اس مبارک کام کے لیے وہی لوگ اٹھتے ہیں جن کے دلوں میں ہم دردی ہو اور خیر خواہی ہو، جن کے خمیر میں پیار ومحبت، غم خواری، ہم دردی اور وحدت والفت کا عنصر بھرپور شامل ہو، لہٰذا جب ایسے لوگ صلح وصفائی کے لیے مخلصانہ جدوجہد کرتے ہیں تو اللہ پاک ان کی کوششوں کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔

﴿إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُصْلِحِينَ ﴿١٧٠﴾﴾ [الأعراف: ١٧٠]
"ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے"۔[سورۂ اعراف:۱۷۰]

ہر شخص اپنے دائرۂ حیات میں نیکی میں تعاون کا مکلَّف ہے

نیکی اور تقوی میں تعاون کا میدان نہایت وسیع ہے، ہر ایک کا احاطہ اور ان پر عمل دشوار ہے؛ لیکن جو شخص جس معاشرے میں رہتا ہے یا جو اس کا دائرۂ کار ہے وہاں اپنی استطاعت کے مطابق اس حکم پر عمل کرے؛ لہٰذا کوئی شخص اگر معلّم یا استاذ ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے طلبہ کی ذہن سازی کرے، ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت پیدا کرے، دین کی عظمت، امانت داری اور دیانت داری اور فکرِ آخرت پیدا کرنے کی کوشش کرے، ان کی تربیت میں اس بات کو مد نظر رکھے کہ ہمیشہ، ہر پہلو میں اعتدال رہے، نہ افراط ہو نہ تفریط، انہیں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دے، صلہ رحمی سکھائے، پڑوسیوں کے حقوق بتائے، الغرض حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی تاکید کرے۔

اگر کوئی صاحب ثروت ہے، اللہ نے اسے مال سے نوازا ہے تو اپنے مال سے ضرورت مندوں کا تعاون کرے، بیواؤں، یتیموں، غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کا تفقّد کرے، بالخصوص اپنے اعزہ اقارب میں اگر کوئی محتاج ہو تو اس کو اَوْلَوِیَّت دے، اپنے مال سے ان کا تعاون کرکے اللہ کی رضا حاصل کرے اور جنت کا مستحق بنے۔ اگر کوئی بہادر اور دلیر ہے تو اپنی بہادری سے دوسروں کو نفع پہنچائے۔ اگر کسی کو اللہ نے قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے، گفتگو کا سلیقہ عنایت کیا ہے، حکمت و دانائی کے ساتھ مرتب گفتگو کرتا ہے تو اس صلاحیت کو مذکورہ مقصد کے لیے استعمال کرے — اسی طرح تصنیف و تالیف کی صلاحیت

والے، دعوت و تبلیغ کی فکر والے، جس کو اللہ نے جو قدرت وصلاحیت عنایت فرمائی ہے اس کو اپنی وسعت کے موافق "تعاون علی البر والتقوی" کے لیے استعمال کرے۔

گناہ اور ظلم وزیادتی میں عدم تعاون

نیکی اور خیر و بھلائی اور تقویٰ و پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے اور ایک دوسرے کا دست و بازو بننے کا حکم دیا گیا، اور ساتھ ہی ساتھ گناہ، ظلم وزیادتی اور برائی کے کاموں میں تعاون کرنے سے منع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

"اثم" کے معنی ہیں ہر طرح کے گناہ، اور "عدوان" کے معنی ہیں زیادتی، سرکشی، اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کی حرمتوں کو پامال کرنا وغیرہ۔

برائی کے کاموں میں تعاون کرنے سے جب منع فرمایا تو خود اس طرح کے کام انجام دینے سے ممانعت بدرجۂ اولیٰ ہوگی، لہٰذا برائی کے کام کرنے سے بھی بچنا چاہیے اور اس پر کسی دوسرے کی مدد کرنے سے بھی۔ اسی وجہ سے سود لینے والے، دینے والے، اس معاملے پر گواہ بننے والے اور لکھنے والے سب پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے کیوں کہ وہ سب گناہ کے کام میں ایک دوسرے کا دست و بازو بنتے ہیں، اسی طرح رشوت لینے والے، دینے والے اور ان دونوں کے درمیان وسیط بننے والے یعنی دلالی کرنے والے پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، کیوں کہ رشوت خوری میں یہ سارے ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں؛ بلکہ بعض دفعہ اس گناہ میں "دلال" کا حصہ زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ رشوت خوری کے راستے ہموار کرنے اور طرفین کو ترغیب دے کر اس حرام کام پر

آمادہ کرنے میں اس کا نمایاں رول ہوتا ہے —— چند روزہ عارضی لذت کے لیے اس حرام مال کو حاصل کرنے والے اور اس پر تعاون کرنے والے کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ایک دن اسے احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑا کیا جائے گا، جو نہایت خوف ناک اور وحشت ناک دن ہوگا۔

﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾﴾ [الحاقة: ١٨]

”اس دن تمہاری پیشی اس طرح ہوگی کہ کوئی چھپی ہوئی چیز چھپی نہ رہے گی“۔ [سورۂ حاقہ:۱۸]

اس پیشی میں فیصلہ کرنے والا وہ قادر مطلق ہوگا جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوگی، ہمیشہ یہ دھیان رہے کہ یہ دنیا فانی ہے، یہ مال و متاع بھی فانی ہے، آج یا کل، یہاں سے رخت سفر باندھنا ہی ہے، جس مال کے لیے اپنی آخرت برباد کی تھی وہ سب یہیں پڑا رہ جائے گا، بالکل خالی ہاتھ یہاں سے رخصتی ہوگی:

﴿ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ﴿١٦﴾﴾ [المؤمنون: ١٥ – ١٦]

”پھر اس کے بعد یقیناً تمہیں موت آنے والی ہے، پھر قیامت کے دن تمہیں یقیناً دوبارہ زندہ کیا جائے گا“۔[سورۂ مؤمنون:۱۵-۱۶]

اس طرح کے گناہوں میں جو شخص مبتلا ہو اسے بلا تاخیر سچی پکی توبہ کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ حق وصداقت پر قائم رکھے اور ثابت قدمی نصیب کرے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا ثُمَّ ٱهۡتَدَىٰ ﴿٨٢﴾ ﴾

[طه: ۸۲]

”اور بلاشبہ جو شخص توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھے راستے پر قائم رہے اس کے لیے بہت بخشنے والا ہوں“۔[سورۂ طہٰ:۸۲]

اہلِ باطل کا دفاع، برائی میں تعاون ہے

گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں پر تعاون میں یہ بھی شامل ہے کہ اہلِ باطل اور فسق وفجور میں مبتلا لوگوں کا دفاع کیا جائے، اسی طرح ظلم وزیادتی کرنے والوں کا دفاع کیا جائے، نیز ناحق کسی کے خلاف دعویٰ کرنے والے کی طرف سے وکالت کی جائے، لہٰذا ظالم کے ظلم پر جواز پیش کرنا، کسی حق دار کو اس کے حق سے محروم کرنے کے لیے فریق مخالف کے کیس کی پیروی کرنا، گناہ پر تعاون کے زمرے میں آئے گا۔ ایک دوسری آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو سخت لہجے میں مخاطب کر کے جھنجھوڑا ہے:

﴿ هَٰٓأَنتُمۡ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيلٗا ﴿١٠٩﴾ ﴾ [النساء: ۱۰۹]

”یہ تم ہی تو ہو جنہوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں لوگوں سے جھگڑ کر ان کی حمایت کی، لیکن قیامت کے دن اللہ سے جھگڑ کر کون ان کی حمایت کرے گا، یا کون ان کا وکیل بنے گا؟“۔[سورۂ نسا:۱۰۹]

ظالموں کی حمایت تو دور کی بات ہے، محض ان کی طرف جھکاؤ بھی دنیا اور آخرت کی

تباہی اور بربادی کے لیے کافی ہے:

﴿ وَلَا تَرْكَنُوٓاْ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿١١٣﴾ ﴾ [هود: ١١٣]

"اور تم ان ظالموں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں اللہ کو چھوڑ کر کسی قسم کا دوست نہ ملے گا، پھر تم کو کہیں سے مدد نہیں پہنچے گی"۔

[سورۂ ہود:۱۱۳]

ناحق کسی شخص کا دفاع کرنا، اس کی حمایت کرنا حقیقت میں "تعاون علی الاثم والعدوان" کی ایک نمایاں شکل ہے جس کی وجہ سے بندہ اپنے رب کے غضب کا مستحق بنتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

«وَمَنْ خَاصَمَ فِي بَاطِلٍ وَهُوَ يَعْلَمُهُ لَمْ يَزَلْ فِي سَخَطِ اللهِ حَتَّى يَنْزِعَ عَنْهُ». [رواه أبوداؤد]

"جس نے جان بوجھ کر کسی باطل کی حمایت میں جھگڑا کیا وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں رہے گا یہاں تک کہ اس سے باز آجائے"۔[ابوداؤد شریف]

جھوٹی گواہی ـــــ گناہ پر اعانت

گناہ اور زیادتی پر مدد میں یہ بھی شامل ہے کہ جھوٹی گواہی دی جائے، جسے شریعت میں "شہادۃ الزور" کہا گیا ہے، ایسی گواہی جس کے ذریعے کسی ظالم کی مدد کی جائے یا کسی حق دار کا حق مارا جائے، یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کو شرک کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، حالاں کہ شرک سے بڑا کوئی گناہ اور ظلم نہیں ہو سکتا۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«عَدَلَتْ شَهَادَةُ الزُّورِ بِالشِّرْكِ بِاللهِ»، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ...﴾ [رواه الترمذي]

"جھوٹی گواہی، اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے، (آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی) پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی "پس تم بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچ کر رہو"۔ [ترمذی شریف]

لہٰذا ہر طرح کی جھوٹی باتوں سے اور بالخصوص جھوٹی گواہی سے جس سے کسی ظالم کی حمایت ہو یا کسی مظلوم کی حق تلفی ہو، پرہیز کرنا ضروری ہے۔

ناجائز امور میں باہمی تعاون پر سخت وعید

جس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نیکی میں تعاون اور برائی میں عدم تعاون کا حکم فرمایا ہے، اسی آیت کے اختتام پر اس حکم کی مزید تاکید اور اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ۝٢﴾ [المائدة: ۲]

"اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے"۔ [سورۂ مائدہ:۲]

گویا کہ یوں فرمایا: اے لوگو! نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا دست و بازو بنو، اور برائی، گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں میں کسی کی مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، کیوں کہ اگر تم نے اس کے حکم کی مخالفت کی اور برے کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہے، گناہ اور ظلم وزیادتی پر ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، تو یاد رکھو اللہ

تعالیٰ کی گرفت بڑی سخت ہے، اس کا عذاب نہایت دردناک ہے، اگر اس نے تمہیں مہلت دے دی ہے، تو اس کی وجہ سے اِتراؤ مت، اس کو "استدراج" سمجھو، یعنی ڈھیل دے رہا ہے، لیکن اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے، کبھی کبھی دنیا میں بھی اس کے نمونے دکھا کر نشانِ عبرت بنا دیتا ہے، ہاں اگر کوئی دنیوی عذاب سے بچ گیا اور توبہ کے بغیر مر گیا تو پھر آخرت کا عذاب یقینی اور دائمی ہے۔

خلاصۂ گفتگو

اسلام دشمن سارے عناصر متحد ہو چکے ہیں، حق وصداقت، عفت وعصمت اور اعلیٰ اخلاق وکردار کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکے ہیں، حیاء وپاک دامنی اور خدائی نظامِ زندگی کے خلاف ایک دوسرے کا تعاون کرنے کے لیے گویا کہ قسمیں کھا چکے ہیں، ایسے حالات میں مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہے کہ بلند اخلاق، مثالی کردار، اعلیٰ اقدار اور اسلامی تعلیمات کا نہ صرف نمونہ پیش کریں، بلکہ ایک دوسرے کا تعاون کریں، اور ہر طرح کے ظلم وزیادتی، بے حیائی وبے شرمی، اباحیت پسندی، فحاشی اور عریانیت کے خلاف، انسانی معاشرے کو تباہی کی طرف لے جانے والے تمام امور کے خلاف اپنی براءت اور عدم تعاون کا برملا اظہار کریں، تاکہ دنیا میں بھی چین، سکون اور سعادت کی زندگی گزار سکیں اور آخرت کی بھی دائمی راحت ونجات کے مستحق بن سکیں۔

***

۱۶/ربیع الأول ۱۴۳۵ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

مشکل حالات اور اسلامی تعلیمات

یہ دنیا دائمی نہیں، یہاں کی ہر چیز فانی ہے، یہ "دار الجزاء" بھی نہیں، یعنی تمام اعمال کا بدلہ بھی یہاں نہیں ملتا؛ بلکہ یہ "دار الامتحان" ہے، یہاں اللہ پاک نے ہر ایک کو امتحان اور آزمائش کے لیے بھیجا ہے، اگر کسی کے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے تو یہ بھی اس کے لیے امتحان ہے، اگر کسی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں تو یہ بھی اس کے لیے امتحان ہے،، پہلی صورت میں اگر شکر کرتا ہے تو امتحان میں کامیاب، دوسری صورت میں اگر صبر کرتا ہے تو امتحان میں کامیاب، لہٰذا دونوں صورتیں اس کے لیے باعث خیر و نجاح ہو سکتی ہیں، اسی لیے رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ». [صحيح مسلم]

"مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا ہر امر خیر کا ہے، اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو میسر نہیں: اگر اسے خوش حالی ملے تو شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے، اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو رضائے الٰہی کے لیے صبر کرتا ہے، تو یہ بھی اس

کے لیے باعث خیر ہی ہوتا ہے"۔ [مسلم شریف]

آزمائش صرف مصیبت کی صورت میں نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ انعامات سے نواز کر بھی امتحان لیتے ہیں کہ بندہ اس حال میں شکر گزار رہتا ہے یا ناشکری کرتا ہے، اسی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے پوری کائنات کو مسخر کر دیا، پوری دنیا پر حکمرانی عطا فرمادی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے انھیں دیکھ کر کہا:

﴿هَٰذَا مِن فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ﴿٤٠﴾﴾ [النمل: ٤٠]

"یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری؟ اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے، اور اگر کوئی ناشکری کرے تو میرا پروردگار بے نیاز ہے، کریم ہے"۔[سورۂ نمل:۴۰]

کبھی آزمائش، مصائب وآلام کی شکل میں آتی ہے: اپنا قریب ترین اور محبوب ترین شخص دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے، یا صحت وتندرستی کھو بیٹھتا ہے، کبھی مال ودولت جاہ ومنصب اور زمین وجائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے لہٰذا اس حال میں اس سے صبر کا مطالبہ کیا ہے تاکہ اس پر اجر عظیم کا مستحق ہوسکے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَا أَخْبَارَكُمْ ﴿٣١﴾﴾ [محمد: ٣١]

"اور ہم ضرور تمھیں آزمائش میں ڈالیں گے، تاکہ ہم یہ دیکھیں کہ تم میں سے کون ہیں جو مجاہد ہیں اور صبر کرنے والے ہیں، اور تاکہ ہم تمھاری حالت کی جانچ کرلیں"۔[سورۂ محمد:۳۱]

دونوں حالتوں میں صبر کی ضرورت ہے، خوش حالی میں بھی اور بدحالی میں بھی، خوش حالی میں صبر یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو ناجائز طور پر استعمال نہ کرے، ان نعمتوں کو اپنی ذات کی طرف منسوب نہ کرے، بلکہ عطا کرنے والے خالق ومالک کی طرف منسوب کرے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا: "یہ میرے پروردگار کا فضل ہے"، اسی طرح تکبر، سرکشی اور دوسروں کی اہانت وتحقیر سے بچے۔ مصائب وآلام میں صبر یہ ہے کہ زبان سے کوئی نازیبا جملہ نہ نکالے، اعضاوجوارح کو بھی قابو میں رکھے اور خدائے پاک کا شکوہ ہرگز نہ کرے، بلکہ تقدیر کے فیصلے پر راضی رہے۔

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی سخت آزمائشیں اور ان کا صبر

اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے کسی نہ کسی درجے میں امتحانات اور آزمائشوں سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے، لیکن یہ آزمائشیں ہمت وعزیمت کے بقدر ہوتی ہیں، اسی لیے جو جتنا زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اسی کے بقدر اس کی آزمائش بھی ہوتی ہے، چناں چہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی آزمائشیں نہایت کرب ناک اور الم ناک ہوتی تھیں، پھر جو جتنا اپنے تدیّن میں پختہ ہوگا اسی کے مطابق اس کا امتحان بھی ہوگا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا امتحان بھی کس قدر سخت تھا، بیماری ایسی لاحق ہوئی تھی کہ جسم کھوکھلا ہوگیا تھا، بیماری نے پورے جسم کو چھلنی کرکے رکھ دیا تھا، اٹھارہ سال تک تڑپتے رہے، کھانا، پینا اور سونا سب کچھ بری طرح متأثر ہوگیا تھا، ان کی زوجۂ محترمہ نے ان سے کہا کہ آپ اپنے رب سے اپنا شکوہ کیوں نہیں کرتے، تو انہوں نے صبر کا دامن چھوڑنے سے صاف انکار کردیا، بالآخر ایک فریاد کی جسے قرآن کریم نے ذکر کیا ہے:

﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُۥٓ أَنِّي مَسَّنِيَ ٱلضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ﴿٨٣﴾﴾ [الأنبياء: ٨٣]

”اور ایوب کو دیکھو! جب انھوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ: مجھے یہ بیماری لگ گئی ہے، اور تو سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے“۔[سورۂ انبیاء:۸۳]

چناں چہ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کی دعا سن لی اور ان کی بیماری زائل فرمادی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی آزمائش میں بے مثال صبر کے ذریعہ کامیاب ہوگئے۔

حضرت یعقوب بن اسحاق علیہما السلام کے اوپر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اپنا محبوب اور حسین ترین فرزند آنکھوں سے اوجھل ہوگیا، خبر دی گئی کہ بھیڑیا کھا گیا؛ لیکن یہ خبر سن کر بہ جائے جزع فزع کے یہ فرمایا:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَٱللَّهُ ٱلْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾﴾

[يوسف: ١٨]

”اب تو صبر ہی بہتر ہے اور جو باتیں تم بنا رہے ہو ان پر اللہ ہی کی مدد درکار ہے“۔[سورۂ یوسف:۱۸]

پھر وہ وقت بھی آیا کہ حضرت یوسف کے دوسرے بھائی بھی ان کی آنکھوں سے دور ہوگئے، اس احساس محرومی کے بعد رنج وغم ہونا فطری بات ہے؛ لیکن اس سخت گھڑی میں انہوں نے کسی شخص سے اپنے رنج والم کی شکایت کرنے کے بجائے اپنے مولیٰ سے فریاد کی:

﴿إِنَّمَآ أَشْكُوا۟ بَثِّي وَحُزْنِيٓ إِلَى ٱللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾﴾ [يوسف: ٨٦]

”میں اپنے رنج وغم کی فریاد (تم سے نہیں) صرف اللہ سے کرتا ہوں، اور مجھے

اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہیں جو تم نہیں جانتے"۔[سورۂ یوسف:۸۶]

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اوپر کئی طرح کی سنگین مصیبتیں اور آزمائشیں آئیں، ان کے لیے آگ سلگائی اور بھڑکائی گئی، دہکتی ہوئی آگ میں انہیں ڈال دیا گیا، لیکن انہوں نے صرف یہ کہا: «حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» پھر اللہ پاک نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ان کے لیے ٹھنڈی بن جائے۔ انھیں اللہ کی طرف سے یہ بھی حکم ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کی قربانی پیش کریں، چناں چہ وہ اس کے لیے بھی بہ خوشی تیار ہوگئے، ان کے تابعدار فرزند حضرت اسماعیلؑ بھی تیار ہوگئے، اس بے مثال قربانی پہ اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی سند عطا فرمائی:

﴿قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ﴾ [الصافات: ١٠٥]

"تم نے خواب کو سچ کردکھایا"۔[سورۂ صافات:۱۰۵]

حضرت یوسف علیہ السلام کا امتحان بھی کتنا سخت تھا، تقویٰ وپرہیزگاری اور عفت وپاک دامنی کے پیکر اس معصوم نبی کی عزت وآبرو پہ حملہ کیا گیا، بدکرداری کی تہمت لگائی گئی، بلکہ کئی سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا؛ لیکن انہوں نے صبر کیا اور اپنے اصولوں پر قائم رہے، صدق وامانت کے ساتھ اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کو برقرار رکھا اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا۔ الغرض امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوگئے، پھر اللہ نے دنیا کی بھی سیادت عطا فرمائی اور آخرت کی بھی سعادت سے سرفراز فرمایا، ان کی تعریف میں یہ جملہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٢٤﴾﴾ [يوسف: ٢٤]

"بیشک وہ ہمارے منتخب بندوں میں تھے"۔[سورۂ یوسف:۲۴]

حضرت یونس علیہ السلام کا امتحان تین تاریکیوں میں رکھ کر ہوا، رات کی تاریکی، سمندر کی تاریکی اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی؛ لیکن وہ گھبرائے نہیں، بلکہ اپنی تقصیر وکمزوری کا اعتراف کرتے ہوے اللہ کی تسبیح بیان کی، پھر اللہ نے انھیں اس مصیبت سے نجات عنایت فرمائی:

﴿فَنَادَىٰ فِي ٱلظُّلُمَٰتِ أَن لَّآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنتَ سُبۡحَٰنَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٨٧﴾ فَٱسۡتَجَبۡنَا لَهُۥ وَنَجَّيۡنَٰهُ مِنَ ٱلۡغَمِّۚ وَكَذَٰلِكَ نُـۨجِي ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٨٨﴾﴾ [الأنبياء: ٨٧ - ٨٨]

”پھر انھوں نے اندھیریوں میں سے آواز لگائی کہ: (یا اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے، بے شک میں قصوروار ہوں — اس پر ہم نے ان کی دعا قبول کی، اور انہیں غم سے نجات دی، اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں“۔ [سورۂ انبیاء:۸۷-۸۸]

سید الاولین والآخرین رسول اکرم ﷺ بھی مصائب وآلام کے طوفانوں سے گزرے، یکے بعد دیگرے مختلف قسم کی مصیبتوں کا سامنا کیا، لیکن ایک لمحے کے لیے بھی مایوس نہیں ہوے۔ آپ کے صاحبزادگان آپ کی نگاہوں کے سامنے اللہ کو پیارے ہوے، آپ کی صاحبزادیاں بھی آپ کی زندگی میں ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں، سوائے حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے۔ آپؐ کو اپنا محبوب وطن چھوڑنے پہ مجبور کیا گیا، ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ کے اہل خانہ (حضرت عائشہؓ) پر تہمت لگائی گئی، عزت وآبرو کو تار تار کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی، پھر ان کی براءت کا اعلان رب ذوالجلال کی طرف سے ہوا—— ان تمام آزمائشوں کے ہر مرحلے میں آپ ثابت قدم رہے، آپؐ کو اللہ کے وعدوں کا پورا

یقین رہا، ایمان ویقین اور کامل توکل کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہوے آگے قدم بڑھاتے رہے، چناں چہ اس صبر کے نتیجے میں فتح ونصرت کا سلسلہ شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے مختصر سی مدت میں خداوندی اصولوں کے مطابق اسلامی سلطنت قائم ہوگئی۔

صبر —— فضائل اور اجر وثواب

مصائب کی آرزو کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے؛ لیکن اگر کوئی مصیبت آجائے تو اس پر صبر کی تلقین کی ہے، صبر کا اسلام میں نہایت اونچا مقام ہے، ایک روایت میں رسولِ اکرم ﷺ نے صبر کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

«وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً هُوَ خَيْرٌ وَأَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ».

[صحيح البخاري]

اور کسی کو صبر سے زیادہ بہتر اور بے پایاں خیر نہیں عطا کی گئی"۔ [بخاری شریف]

اسی وجہ سے کہا گیا کہ مصیبت کی تمنا نہ کرے، لیکن اگر مصیبت آجائے تو یہ سمجھے کہ اسی میں خیر ہوگی۔ بخاری شریف کی روایت ہے:

«مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ» "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر وبھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مصیبت کو رب ذوالجلال کی طرف سے سمجھ کر اگر بندہ صبر کرے اور اس کی مرضی پہ راضی رہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ عِظَمَ الجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ البَلَاءِ، وَإِنَّ اللهَ إِذَا

أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ». [رواه الترمذي]

اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت فرماتے ہیں تو اسے آزمائشوں میں ڈالتے ہیں، لہٰذا جو اللہ کی مرضی پہ راضی رہتا ہے تو اللہ بھی اسے اپنی رضا نصیب فرماتے ہیں، اور جو ناراض ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہوتے ہیں"۔[ترمذی شریف]

مصائب کی وجہ سے رنج وملال کا ہونا فطری بات ہے، لیکن صبر کا تقاضا یہ ہے کہ چیخ وپکار، زیادہ آہ وزاری اور چہرے اور سر کو زدوکوب کرنے سے احتراز کرے اور خیال کرے کہ مصیبتوں پر صبر کرنے کی وجہ سے جو اجر وثواب ملے گا وہ بہت ساری عبادتوں کے اجر سے بھی دوچند ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«يَوَدُّ أَهْلُ العَافِيَةِ يَوْمَ القِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ البَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالمَقَارِيضِ».

[رواه الترمذي]

جب قیامت کے روز ایسے لوگوں کو ثواب دیا جائے گا جنھیں آزمائشوں میں ڈالا گیا تھا تو اہل عافیت یہ خواہش کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کی کھالیں قینچیوں سے کتر دی گئی ہوتیں"۔[ترمذی شریف]

مصائب وآلام اگر آجائیں تو اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان سمجھ کر بندہ اپنے جذبات پر قابو رکھے اور صبر کرلے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے بے حساب اجر سے نوازتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّـٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾﴾ [الزمر: ١٠]

جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں، ان کا ثواب انھیں بے حساب دیا جائے گا"۔

[سورۂ زمر:١٠]

بیماریاں گناہوں کا کفارہ

بیماریوں اور مصیبتوں کو لعن طعن کرنے اور برا بھلا کہنے سے بھی شریعت نے منع کیا ہے، کیوں کہ یہ بیماریاں اگرچہ الم ناک ہوتی ہیں، لیکن ان کی وجہ سے انسان کی تطہیر بھی ہوتی ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں اور صبر کی وجہ سے بے پایاں اجر وثواب ملتا ہے۔ ایک صحابیہؓ نے اپنی بیماری کی نوعیت بتلاتے ہوئے اسے برا بھلا بھی کہا تو آپؐ نے فرمایا:

«لَا تَسُبِّي الْحُمَّى فَإِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَايَا بَنِي آدَمَ كَمَا يُذْهِبُ الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ». [صحيح مسلم]

بخار کو برا نہ کہو، کیوں کہ یہ آدم کی اولاد کے گناہوں کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے زنگ کو دور کرتی ہے"۔ [مسلم شریف]

ویسے بھی آفات وبلیات کو برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ، شکوہ گلہ کرنے اور برہم ہونے کی وجہ سے نہ تو ان کا ازالہ ہوگا نہ کوئی اجر وثواب ملے گا، بلکہ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو ہم ناپسند کر رہے ہوں اس میں ہمارے لیے خیر وبھلائی چھپی ہوئی ہو۔

﴿فَعَسَىٰٓ أَن تَكۡرَهُواْ شَيۡـٔٗا وَيَجۡعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيۡرٗا كَثِيرٗا ١٩﴾ [النساء: ١٩]

"تو عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔ [سورۂ نساء:۱۹]

بعض دفعہ آزمائشوں اور امتحانات کے پس پردہ بے شمار انعامات چھپے رہتے ہیں، اس لیے بے صبری کا مظاہرہ کرکے اجر وثواب سے محروم نہ ہوں، اور ناامیدی کا شکار ہوکر

اللہ کی ذاتِ اقدس سے اعتماد اور بھروسے کو نہ کھوئیں، بلکہ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگیں۔

صبر کی قسمیں

صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) طاعات پر صبر (۲) گناہوں سے صبر (۳) مصائب پر صبر۔

ان تمام صورتوں میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلی قسم طاعات پر صبر کی ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کے لیے اور ان پر ہمیشگی کرنے کے لیے صبر کی ضرورت ہوتی ہے، مثال کے طور پر نماز ہے، رات دن میں پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض فرمائی ہیں، ان کی ادائیگی انسان سے صبر کا مطالبہ کرتی ہے، اگر صبر نہ ہو تو ان پر مداومت نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَأۡمُرۡ أَهۡلَكَ بِٱلصَّلَوٰةِ وَٱصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَاۖ ... ﴾ [طه: ۱۳۲]

”اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اس پر ثابت قدم رہو“۔

[سورۂ طٰہٰ: ۱۳۲]

اسی طرح روزہ، زکات اور حج اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت الی اللہ، اذکار و اَوراد کی پابندی اور قربِ الٰہی میں ترقی کے لیے نوافل کی کثرت، الغرض تمام طاعات میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے، اگر صبر نہ ہو تو ان کی ادائیگی مشکل ہوگی۔

دوسری قسم گناہوں سے صبر ہے، یعنی گناہوں سے بچنے اور توبہ کرنے کے لیے بھی صبر کی ضرورت ہے، نفسِ امارہ کی خلاف ورزی کرنا نہایت صبر آزما کام ہے، اس صبر کے لیے

ایمانی قوت درکار ہوتی ہے، کیوں کہ نفس، شیطان اور برا ماحول یہ تینوں انسان کو گناہوں پر آمادہ کرتے ہیں، رضائے الٰہی کے لیے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور ان کے خلاف عمل کرنا نہایت صبر طلب کام ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

«حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ، وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ». [مسلم]

”جنت، ناپسندیدہ امور سے ڈھکی ہوئی ہے اور جہنم، شہوتوں سے ڈھکی ہوئی ہے“۔ [مسلم شریف]

یعنی جنت کا اگر شوق ہے تو اس شوق کی تکمیل کے لیے خاردار اور ناپسندیدہ راہوں سے گزرنا ہوگا، نفس وشیطان کے خلاف قدم بڑھانا ہوگا، ناجائز شہوتوں کو پامال کرنا ہوگا، ورنہ یہ شہوتیں جہنم میں ڈھکیل دیں گی۔ اسی لیے اہل ایمان یہ دعا کرتے ہیں:

﴿رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾﴾

[الأعراف: ١٢٦]

”اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کے پیمانے انڈیل دے، اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے تابع دار ہوں“۔ [سورۂ اعراف:۱۲۶]

صبر کی تیسری قسم ہے آفتوں اور مصیبتوں پر صبر کرنا، انسان پر مختلف قسم کے حالات آتے ہیں، کبھی جان ومال کا زیاں، کبھی اہل وعیال کی طرف سے پریشانیاں، کبھی اہل ستم کی طرف سے ظلم وزیادتیاں، کبھی خوف وہراس کا سامنا، کبھی فقر وفاقہ اور بھوک پیاس کی شدت وغیرہ، یہ اور اس طرح کی تمام مصیبتوں پر صبر مطلوب ہے، اس صبر کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں، درجات بلند ہوتے ہیں؛ بلکہ اس کی قسمت میں اگر کوئی مقام ومرتبہ لکھا ہوتا ہے اور وہ اپنے نیک عمل کے ذریعہ اس کو حاصل نہیں کرپاتا تو اسے

آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے، پھر وہ ان پر صبر کر کے اس مقام و مرتبے کو حاصل کر لیتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« «إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ عز وجل مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ، ابْتَلَاهُ اللهُ فِي جَسَدِهِ أَوْ فِي مَالِهِ أَوْ فِي وَلَدِهِ، حَتَّى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِي سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ تَعَالَى». [أبوداؤد]

”بلاشبہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مرتبہ مقدر ہو چکا ہو جسے وہ اپنے اعمال کے ذریعہ حاصل نہ کر سکا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے جسم یا مال یا اولاد کی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں تاکہ اسے اس مقام و مرتبے تک پہنچا دیں جو اللہ کی طرف سے اس کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکا ہوتا ہے“۔[ابوداؤد شریف]

اہل صبر کے لیے اللہ کی خصوصی عنایت ورحمت اور ہدایت

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو اپنی ”مَعِیّت“ عطا فرماتے ہیں، جو عبودیت کا نہایت اعلیٰ مرتبہ ہے۔ دشمن کے خوف، بھوک پیاس کی شدت، مال وجان اور اشیائے خوردنی میں نقص کے ذریعے بھی اللہ تعالیٰ آزماتے ہیں، اس پر بندہ جب صبر کرتا ہے اور وقتِ آزمائش « إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ» پڑھتا ہے یعنی ہم سب اللہ کی ملکیت ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، تو پھر مالک الملک کی طرف سے اسے بشارت ملتی ہے:

﴿ أُولَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ١٥٧ ﴾ [البقرة: ١٥٧]

”یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں،

اور رحمتیں ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں"۔[سورۂ بقرۃ:۱۵۷]

دعائے کرب وبلا

جو شخص مصائب، کرب وبلا اور گردشِ ایام میں مبتلا ہو جائے تو صبر کے ساتھ ان دعاؤں کا بھی اہتمام کرے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور آپؐ نے ان حالات میں انھیں پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«مَا مِنْ عَبْدٍ تُصِيبُهُ مُصِيبَةٌ فَيَقُولُ: إِنَّا لله وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. اللَّهُمَّ! أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِيْ وَأَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا إِلَّا أَجَرَهُ اللهُ فِي مُصِيبَتِهِ وَأَخْلَفَ لَهُ خَيْرًا مِنْهَا». [رواه مسلم]

"جب کسی بندے کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتا ہے: «إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. اللَّهُمَّ! أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِيْ وَأَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا» ترجمہ: "بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اے اللہ! مجھے میری مصیبت کا اجر عطا فرما اور مجھے اس کا اس سے بہتر بدل عنایت فرما۔ تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مصیبت پر اجر دیتے ہیں اور اس سے بہتر بدل بھی عنایت فرماتے ہیں"۔

دوسری روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کرب و مصیبت کے وقت اس دعا کا اہتمام فرماتے تھے:

«لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمُ». [صحيح البخاري]

لہٰذا مصائب وآزمائش کے موقع پہ مذکورہ بالا اذکار کو پڑھنے کے بعد اپنی فریاد بارگاہِ ایزدی میں پیش کرے اور صبر وتحمل اور ایمان ویقین کے ساتھ حالات کا سامنا کرے اور یہ یقین رکھے کہ ہر تاریکی کے بعد روشنی آتی ہے، تنگی کے بعد کشادگی آتی ہے اور ہر مشکل کے بعد آسانی آتی ہے۔

﴿فَإِنَّ مَعَ ٱلْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ إِنَّ مَعَ ٱلْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦﴾ [الشرح: ٥ – ٦]

”یقینا مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بلاشبہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے“۔[سورة الشرح:۵-۶]

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

***

۱۴۱۹/۴/۲۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خلیفۂ خامس حضرت عمر بن عبد العزیزؒ — سیرت و کردار

اس دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: ایک وہ کہ جب مال و دولت، جاہ و منصب اور ہر طرح کے اسباب عیش و عشرت سے ان کا دامن بھرا تو وہ اسی کے ہو کے رہ گئے، اسی کو انہوں نے اپنی جنت سمجھ لی، کبر و غرور میں مبتلا ہو گئے، اس پر فریب دنیا نے انہیں آخرت سے غافل کر دیا —— دوسری قسم ان خوش بختوں کی ہے کہ جب دنیا اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ ان کے قدموں میں آگری، جاہ و منصب کی چوٹیوں پر پہنچ گئے تو انہوں نے اس کو اپنے خالق و مالک کا احسان و انعام بھی سمجھا اور اسے اپنے لیے بڑا امتحان بھی تصور کیا، چناں چہ ان کی فکرِ آخرت میں اضافہ ہوا، دنیا کی رغبت ختم ہو گئی اور اس کو انہوں نے آخرت کی ہمیشہ ہمیش کی کامیابی کے لیے بطور زینہ کے استعمال کیا۔

پہلی قسم کے لوگوں سے تو دنیا بھری ہوئی ہے، لیکن دوسری قسم کے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں، آج اسی قسم کی ایک عظیم، نادر اور اپنی مثال آپ شخصیت کے مطالعے کا نچوڑ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

پہلی صدی ہجری اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہے، اس وقت کا خلیفہ سلیمان بن عبد الملک اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے، تختِ شاہی پہ چھوٹے بچے کی طرح

بلبلا رہا ہے، موت اسے اپنے آغوش میں لینے والی ہے، اپنے رب کی طرف متوجہ ہوکر کہتا ہے:

«يَا مَنْ لَا يَزُولُ مُلْكُهُ ارْحَمْ مَنْ قَدْ زَالَ مُلْكُهُ» اے وہ ذات جس کی حکمرانی ہمیشہ برقرار رہنے والی ہے، اس شخص پہ مہربانی فرما جس کی حکمرانی ختم ہوگئی"۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کا اعلان

سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو نامزد کرکے خفیہ طور پر ایک کاغذ پر لکھ کر ایک عالم دین رجاء بن حیوہ کے سپرد کردیا تھا، جب اس کی تدفین سے لوگ فارغ ہوگئے تو رجاء بن حیوہ نے لوگوں کو جمع کرکے منبر پر جاکر وہ پرچی نکالی اور یہ اعلان کیا کہ سلیمان کے بعد اب خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز ہوں گے۔

ناز ونعمت میں پلے ہوے اس نوجوان کا حال یہ تھا کہ ایک روز میں کئی بار کپڑے بدلتا تھا، خوشبو اتنی قیمتی استعمال کرتا تھا کہ جب کسی گلی سے گزر جاتا تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ عمر کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا، مدینہ منورہ کے ایک "قصر" یعنی محل میں سکونت پذیر رہ چکا تھا، اس کے والد کا ایک قصر شام میں تھا، دوسرا مصر میں، تیسرا عراق میں اور چوتھا یمن میں تھا — جب انہوں نے اپنی خلافت کی خبر سنی تو یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، مسجد کی پہلی صف میں تھے، علمائے کرام نے انھیں اٹھا کر منبر پر بٹھایا تو وہ احساس ذمہ داری کی وجہ سے کانپ رہے تھے، بولنے کی کوشش کررہے تھے، لیکن

رونے کی وجہ سے بول نہیں پار ہے تھے، بڑی مشکل سے یہ کہا:

«بيعتكم بأعناقكم، لا أريد خلافتكم» "تمہاری بیعت تمہاری ہی گردن میں ڈالتا ہوں، مجھے خلافت کی کوئی حاجت نہیں" یہ سن کر سارا مجمع رو پڑا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہم آپ کے علاوہ کسی کو اپنا خلیفہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے بعد پھر انہوں نے ہمت کی اور مختصر خطاب کیا جس میں موت کا، آخرت کا، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کا اور اپنے پیش روؤں کا ذکر کیا جس سے نہ صرف سامعین روئے، بلکہ رجاء کہتے ہیں کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے ساتھ مسجد کی دیواریں بھی گریہ وزاری کر رہی ہیں۔

جب حضرت عمر بن عبد العزیز منبر سے اترے تو پچھلے خلفاء کی طرح ان کے لیے بھی شاہانہ سواری لائی گئی تو انھوں نے کہا کہ اس کی قطعاً ضرورت نہیں، کیوں کہ میں تو مسلمانوں میں سے (انہیں کی طرح) ایک فرد ہوں، البتہ میری ذمہ داریاں اب ان سے زیادہ ہیں۔ پھر اپنا خچر منگایا اور اس پر سوار ہو کر اپنے گھر گئے۔

حضرت عمر اور ان کی خدا ترس بیوی فاطمہ

اپنا قصر چھوڑ دیا، اس کے سارے اثاثے فقراء پر تقسیم کر دیے، ایک معمولی مکان میں فروکش ہوئے، اپنی اہلیہ محترمہ کو بلایا جو وجاہت کے اوجِ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں، خلیفہ عبد الملک کی بیٹی، خلفاء کی بہن اور خلیفۂ وقت کی بیوی تھیں، انہیں بلا کر کہا:

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمے داری میرے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے، اب

تمہیں دو میں سے ایک امر کو اختیار کرنا ہوگا، اگر تم اللہ کی رضا اور آخرت کی سرخ روئی چاہتی ہو تو اپنے سارے زیورات بیت المال میں جمع کرادو، اور اگر تم دنیا کو ترجیح دیتی ہو تو میں خوش اسلوبی کے ساتھ تمہیں فارغ کردوں گا، تم اپنے گھر والوں سے جاملوگی۔ اس مؤمنہ، صالحہ خاتون نے جواب دیا: میں نے آپ ہی کے ساتھ مرنے اور جینے کا فیصلہ کرلیا ہے، مجھے ان زیورات کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تمام زیورات (جو بادشاہوں سے ملے تھے اور جن کے حلال ہونے میں شبہ تھا کہ شاید وہ مسلمانوں کا حق مار کر انہیں دیے گئے ہوں گے) بیت المال میں جمع کرادیے۔

صالح فرزند کی اپنے والد گرامی کو نصیحت

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک فرزند تھا جس کا نام عبدالملک بن عمر تھا، یہ کم عمری میں ہی تقویٰ شعاری اور خداترسی کے اعلیٰ مقام کو پہنچ گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلافت کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد پہلے روز ہی دوپہر میں تھک کر قیلولہ کے لیے لیٹ گئے، اتنے میں یہ صاحب زادے آئے اور عرض کیا: والد گرامی! آپ سو رہے ہیں؟ حالاں کہ آپ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ذمے داری اپنے سر لے رکھی ہے، ان میں فقیر، مسکین، بھوکے اور بیوائیں بھی ہیں، جو قیامت کے روز آپ کا دامن پکڑ کر اپنے حق کا سوال کریں گے، یہ سن کر حضرت عمرؒ اٹھ کھڑے ہوے اور رونے لگے اور اس بیٹے کی پیشانی کا بوسہ لے کر اللہ کا شکر ادا کیا — اللہ کی شان دیکھیے کہ یہ خدارسیدہ لڑکا کم عمری میں ہی آخرت کو سدھار گیا۔

ظالم وزراء کی معزولی

حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد متعدّد بڑے بڑے فیصلے لیے، منجملہ ان کے یہ تھا کہ ان کے پیش رو سلیمان کے زمانے کے جو فاسق وفاجر، ستم گر اور ظالم وخیانت کار امراء اور وزراء تھے انہیں معزول کیا اور ان کی جگہ علماء وصلحاء کو متعیّن کیا، ان ظالموں کو بلا کر ان کے مظالم بتائے اور بتاکر نہایت سخت لہجے میں پھٹکار لگاکر انھیں برطرف کیا۔

اس وقت عالم اسلام کے جو ذی علم اور تقویٰ شعار وپاک باز ہستیاں تھیں، انھیں خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ آپ حضرات میری راہ نمائی فرمائیں، حق بات کی تلقین فرمائیں اور اگر کوئی چوک ہو تو آپ تنبیہ فرمائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو اللہ کی بارگاہ میں مجھے ظالم کی حیثیت سے پیش کیا جائے؛ چناں چہ ان حضرات نے نہایت خوشی کے ساتھ ان کی درخواست قبول کی اور شریعت کی روشنی میں ان کو دل کھول کر نصیحت کی، ان میں حضرت حسن بصریؒ، سالم بن عبداللہ بن عمرؒ اور ان جیسے کبار علمائے کرام شامل ہیں۔

مغصوبہ جائدادوں کی بازیابی

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت رحم دل، خداترس اور ہم درد انسان تھے، خوفِ خدا سے رات رات بھر روتے رہتے تھے؛ لیکن جب حق وباطل کے درمیان تصادم ہوتا تو احقاقِ حق کے لیے پہاڑ کی چٹان سے بھی زیادہ سخت اور شیر سے بھی زیادہ دلیر نظر آتے، چناں چہ اپنی وسیع وعریض حکومت وخلافت کے استحکام کے لیے نئی سیاست کے خطوط متعیّن کیے، ایک کاغذ پر انھیں لکھ لیا اور مسجد میں تشریف لاکر پہلے ایک شخص کو جس

کا نام "مزاحم" تھا اور نہایت بارعب شخصیت کا مالک تھا، رنگ بالکل سیاہ تھا، اسے قریب بلا کر کہا: مجھے اللہ کے لیے تجھ سے محبت ہے، تم میرے وزیر بن کر رہو، میں نے تجھے ریگستان میں تنہائی میں چاشت کی نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے، مجھے پتہ ہے کہ تجھے قرآن سے دلی لگاؤ ہے، ان کے ہاتھ میں تلوار دے کر اپنے قریب کھڑا کیا اور منبر پر چڑھ کر ان تمام "دستاویزات" کو پھاڑ دیا جن کے ذریعے بنی امیہ کے ظالم امراء نے زمینیں غصب کی تھیں، بڑے بڑے محلات پہ قبضہ کر رکھا تھا؛ انہی میں عباس بن الولید بن عبدالملک بھی تھا جس نے اتنی زمینوں پر قبضہ کیا تھا جن میں ایک شہر آباد ہو سکتا تھا، اس کی رجسٹری کا کاغذ لے کر اس کے سامنے قینچی سے کاٹ کر پھینک دیا اور کہا کہ اس غصب کی ہوئی زمین پر اب تیرا کوئی حق نہیں، اس نے سخت لہجے میں اپنی زمین کی واپسی کا مطالبہ کیا تو فرمایا: اگر خاموش نہیں ہوئے تو ابھی مزاحم کو تمہارا سر قلم کرنے کا حکم دوں گا؛ چناں چہ خاموش ہو گیا۔ اس طرح ظالمانہ طور پر غصب کی ہوئی تمام اراضی کے کاغذات کو ایک ایک کر کے سب کے سامنے پھاڑ دیا۔

ان کے ایک وزیر تھے جن کا نام "مہاجر" تھا، ان سے فرمایا کہ اگر تمہیں نظر آئے کہ میں نے کسی پر ظلم کیا، کسی کی عزت وآبرو کے درپے ہوا یا کسی کو گالی دی تو خدارا میرا گریبان پکڑ کر کہنا: «اتق الله يا عمر» یعنی عمر! اللہ کا خوف کرو۔ چناں چہ وقتاً فوقتاً وہ حضرت عمر کو ان کے حکم کے مطابق کہہ کر جھنجھوڑتے: «اتق الله يا عمر»۔

ہزار درہم کی انگوٹھی کا واقعہ

بچے مختلف مزاج کے ہوتے ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک فرزند کو ایک

روز خوب صورت اور قیمتی انگوٹھی پہننے کا شوق ہوا، ویسے بھی خلیفۃ المسلمین کے صاحبزادے تھے، چناں چہ انھوں نے ایک انگوٹھی ایک ہزار درہم کی خریدی، اس کا نگینہ حسین تھا، جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے اس بیٹے کو ایک تحریر بھیجی، جس میں لکھا تھا:

"مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے ایک ہزار درہم کی انگوٹھی خریدی ہے، جب تمہیں میرا یہ خط ملے تو فوراً انگوٹھی بیچ کر ایک ہزار لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور اپنے لیے ایک دوسری انگوٹھی دو درہم کی بنواؤ جس کے نگینے میں یہ کلمات لکھواؤ: «رَحِمَ اللّٰهُ امْرَءًا عَرَفَ قَدْرَ نَفْسِهِ»۔ "اللہ اس شخص پر رحم کرے جو اپنی اوقات پہچانے"۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی ذاتی زندگی

خلافت سنبھالنے کے بعد ان کی ذاتی زندگی میں ایسی حیرت انگیز اور نمایاں تبدیلی آئی تھی جس کا احاطہ کرنے سے زبان وقلم قاصر ہیں، عشاء کی نماز مسجد میں ادا فرمانے کے بعد گھر واپس آتے اور اپنے مصلے پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے آنسو بہاتے رہتے، یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ حضرت فاطمہ سے کسی نے ان کی خانگی زندگی کے احوال دریافت کیے تو کہا:

عمر سے زیادہ نمازیں ادا کرنے والے اور روزے رکھنے والے تو یقیناً مل جائیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے عمر سے زیادہ خدا ترس انسان نہیں دیکھا، جب گھر میں داخل ہوتے تو مصلے پہ پڑ جاتے، روتے رہتے، دعائیں کرتے رہتے، اسی حال میں تھوڑی آنکھ لگ جاتی، پھر بیدار ہوتے، دوبارہ آہ وزاری اور دعا میں

مشغول ہوجاتے اور اسی طرح پوری رات گزار دیتے“۔[حلیۃ الاولیاء]

ایک رات حضرت عمر بے تحاشا رو رہے تھے، ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کی اہلیہ فاطمہ بھی رونے لگیں، پھر گھر کے سارے لوگ رونے لگے، جب ذرا آنسو تھما تو اہلیہ محترمہ نے دریافت کیا: امیر المؤمنین! کیوں اس قدر رو رہے تھے؟ جواب دیا: ”میں نے قیامت کا تصور کیا کہ لوگ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو رہے ہیں، پھر ایک فریق کو جنت میں داخل کیا جارہا ہے اور دوسرے فریق کو دوزخ کی دہکتی آگ میں“ یہ کہہ کر دوبارہ اتنے روئے کہ چیخیں نکل گئیں اور بے ہوش ہوگئے“۔

ایک مرتبہ خاندانِ بنی امیہ کے سربرآوردہ لوگ ان کے دروازے پر جمع ہوگئے، اتنے میں حضرت عمر کے صاحبزادے عبد الملک بن عمر آگئے جو اپنے والد سے ملاقات کو جارہے تھے، چناں چہ ان لوگوں نے ان سے کہا کہ یا تو تم ہمارے لیے اندر آنے کی اجازت لے لو یا ہمارا پیغام پہنچادو۔ انہوں نے کہا کہ بتائیے آپ کا پیغام کیا ہے، میں پہنچادوں گا۔ انہوں نے کہا کہ خلیفہ کو بتلادیں کہ آپ سے پہلے کے خلفا ہمیں اپنی عطایا سے نوازتے تھے اور مرتبے و مقام کو پہچانتے تھے، جب کہ آپ نے ہمیں محروم کردیا ہے۔ یہ سن کر صاحبزادے اندر گئے اور والد گرامی کو ان کا پیغام پہنچادیا، تو حضرت عمرؒ نے فرمایا: ان سے جاکر یہ کہہ دو کہ والد صاحب نے یہ کہا ہے:

﴿قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝١٥﴾ [الأنعام: ١٥]

”اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک زبردست دن کے عذاب کا خوف ہے“۔[سورۂ انعام:۱۵]

امام مکحول شامیؒ کہتے ہیں کہ میں قسم کھاسکتا ہوں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بڑا زاہد اور ان سے زیادہ خداترس انسان نہیں دیکھا ہے"۔

[تاریخ اسلامی للذہبی]

حضرت عمرؒ کی زاہدانہ زندگی

شروع میں عرض کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؒ خلافت سے پہلے قیمتی لباس و پوشاک، خورد و نوش اور خوش بوؤں کے دل دادہ تھے، لیکن خلافت کے بعد بقول رجاء بن حیوہ کے ان کے لباس کی قیمت لگائی گئی تھی تو پتہ چلا کہ صرف ۱۲ درہم کا لباس خلیفہ کے بدن پر تھا۔

سعد بن سوید کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمعے کی نماز پڑھائی، میں نے دیکھا کہ ان کے بدن پر جو کپڑا ہے اس کے آگے اور پیچھے دونوں طرف پیوند لگے ہوے ہیں۔

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ چھ ماہ تک مسلسل میں حضرت عمرؒ کی صحبت میں رہا، اس پورے عرصے میں ان کے بدن پر جو چادر تھی وہ تبدیل نہیں ہوئی،، ہر جمعہ کو اسے دھو لیتے تھے، پھر اسی کو پہن لیتے تھے، تھوڑا سا زعفران لگا ہوا تھا جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ وہی چادر ہے، بدلی نہیں گئی ہے۔

مسلمۃ بن عبدالملک ایک روز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوے، ان دنوں خلیفہ بیمار چل رہے تھے، چناں چہ انہوں نے اپنی بہن فاطمہ بنت عبد الملک سے جو خلیفہ کی اہلیہ تھیں کہا کہ اب تو امیر المؤمنین کی صحت میں سدھار آیا ہے، لہٰذا تم ان کی قمیص تبدیل کردو تاکہ لوگوں کی حاضری کے لیے ان سے اجازت طلب کروں، یہ سن کر وہ خاموش رہیں، انہوں نے پھر ایک بار کہا کہ ان کی قمیص بہت میلی ہوگئی ہے اسے

تبدیل کر دو، تب انہوں نے کہا: اللہ کی قسم اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہے۔

[الطبقات الکبریٰ لابن سعد]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تقویٰ

خلیفہ کے گھر میں دو چراغ تھے، ایک اپنا ذاتی چراغ تھا دوسرا بیت المال کا، جب اپنی ضرورت کی چیزیں لکھتے یا گھر والوں کے ساتھ بیٹھتے تو اپنا ذاتی چراغ استعمال فرماتے، اور جب رات میں کسی سرکاری کام کو انجام دیتے تو اس وقت بیت المال والا چراغ استعمال فرماتے، یہاں تک کہ اگر کوئی مہمان آجاتا اور حکومت کے کام میں مشغول ہوتے تو اس کے آتے ہی سرکاری چراغ کو گل کر دیتے اور اپنا چراغ جلا لیتے۔ تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ حکومت کے کوئلے سے گرم کیا ہوا پانی ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا اور اس سے وضو نہیں کیا۔

رجاء بن حیوۃ کہتے ہیں کہ:

ایک رات میں امیر المؤمنین کے پاس تھا، انہوں نے اپنا ذاتی چراغ جلا رکھا تھا، جب وہ بجھنے لگا تو میں نے عرض کیا: اس غلام کو جگا دیتے ہیں تاکہ وہ اس کو درست کرے، تو انہوں نے فرمایا: نہیں، اسے سونے دو، کیوں کہ یہ اس کی پہلی نیند ہے، یعنی ابھی سویا ہے، جگانا مناسب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیں، میں اس کو درست کرتا ہوں، تو فرمایا: یہ مروت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنے مہمان سے کوئی کام لے۔ اس کے بعد خود ہی گئے، چراغ میں تیل ڈالا اور اسے صحیح کر کے واپس آئے اور کہا: میں جب کھڑا ہو کر گیا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور واپس آیا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں، یعنی اس کام کی وجہ سے

میری شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ان کی اہلیہ کہتی ہیں کہ:

ایک رات میں ان کے قریب گئی تو دیکھا کہ رو رہے ہیں اور اس طرح بے چینی کی حالت میں ہیں جیسے پرندہ اضطرابی کیفیت میں پھڑپھڑاتا ہے، میں نے عرض کیا کہ امیرالمؤمنین! کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے، ان میں کمزور، بیوا، مسکین، فقیر اور بھوکے ضرورت مند ہوں گے، ان سب کے بارے میں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں گے، میں کیا جواب دوں گا؟

تقویٰ، پرہیزگاری، عبادت گزاری اور زہد وقناعت کی وجہ سے ان کی ایسی حالت ہوگئی تھی کہ ایک عالم کہتے ہیں:

میں نے حضرت عمرؒ کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ مدینہ منورہ کے گورنر تھے، اس وقت نہایت لحیم شحیم تھے اور چہرے پر بلا کی رعنائی تھی؛ لیکن خلافت کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد ایک روز انھیں طواف کرتے ہوئے دیکھا تو احرام کی چادر ایک پہلو کی طرف سے اٹھی ہوئی تھی، خدا کی قسم، اگر میں چاہتا تو ان کی کلائی اور جسم کی ہڈیاں شمار کر لیتا۔

ایک ممتاز عالم دین جن کا نام زیاد تھا، خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوے، دیکھا تو چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، رونے کی وجہ سے چہرے پر نشانات پڑ گئے تھے، کپڑوں میں پیوند لگے ہوے تھے، دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں، عرض کیا: امیرالمؤمنین! کہاں ہیں وہ محلات جن میں آپ رہا کرتے تھے، کہاں ہیں وہ گراں قدر لباس جنھیں آپ پہنا کرتے تھے اور کہاں ہیں وہ نعمت کدے جن کے آپ خوگر تھے؟ حضرت عمر نے یہ سن کر ایک آہ بھری اور کہا:

زیاد! وہ دن گئے، اور اگر تم میرے اندر کوئی تبدیلی دیکھ رہے ہو تو حیرت نہ کرو، کیوں کہ اس سے زیادہ تبدیلی اس وقت ہوچکی ہوگی جب مجھے قبر میں دفن کرنے کے تین روز بعد جاکر مجھے دیکھوگے، جب میرے کفن سے کپڑے پھٹ گئے ہوں گے، میرے رخسار پر کیڑے پڑ گئے ہوں گے، میری آنکھیں کھاچکے ہوں گے اور میری ناک میں مٹی بھری ہوگی۔

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم داعی بناکر مبعوث کیے گئے تھے نہ کہ مال جمع کرنے کے لیے

مصر کے گورنر حیان بن شریح نے جب دیکھا کہ بڑی تعداد میں جزیہ دینے والے ذمی لوگ اسلام میں داخل ہورہے ہیں تو انھیں اندیشہ ہوا کہ بیت المال کے بجٹ میں خسارہ نہ ہوجائے تو انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ شکایت کی تھی کہ ذمی لوگ (غیر مسلم جو اسلامی حکومت کو ٹیکس دے کر اس کے عوض میں امن وامان حاصل کرتے ہیں) وہ اب تیزی سے اسلام میں داخل ہونے لگے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی طرف سے جزیہ کا آنا بند ہونے لگا ہے، جب یہ خط حضرت عمرؒ کو ملا تو اس کا جواب لکھا:

«إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَاعِيًا، وَلَمْ يَبْعَثْهُ جَابِيًا» . یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کا مبارک عمل دے کر بھیجا تھا (تاکہ لوگوں کو خیر کی دعوت دے کر جنت کا راستہ دکھائیں اور جہنم سے بچائیں) انہیں مال جمع کرنے والا بناکر نہیں بھیجا تھا"۔ [سیر اعلام النبلاء للذہبی]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت اور عدل وانصاف

جو شخص اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا عدل کرے گا، حضرت عمرؒ نے خلافت سنبھالتے ہی انصاف اور اصلاح کا کام اپنے گھر سے شروع فرمایا، اپنے ساز وسامان کا اور اپنی اہلیہ محترمہ اور بچوں کی چیزوں کا جائزہ لیا، ضرورت سے زائد جتنی چیزیں تھیں انھیں بیت المال میں جمع کرادیا، پھر اپنے خاندان کے امراء اور وزراء کی طرف متوجہ ہوے، پچھلے عہد میں جتنی زمینیں اور جائدادیں انہوں نے غصب کی تھیں، یا ناجائز طریقے سے ان تک پہنچی تھیں ان سب کو لے کر بیت المال کے حوالے کیا۔

اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کی ایسی روشن تاریخ رقم کی جس کی نظیر آج تک ان کے بعد کہیں نہیں ملتی، ہر صاحب حق کو اس کا حق دلایا، اگر کسی کو سزا دینی ہوتی تھی تو تین روز تک اسے قید میں رکھتے تھے، پھر سزا دیتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جلدی میں غصے کی بنا پر اسے سزا دے کر بعد میں نادم ہونا پڑے۔

انہیں خبر ملی کہ ان کے امراء میں کوئی شخص ہے جو حجاج بن یوسف (ظالم وقت) کے زمانے میں اس کی ماتحتی میں کام کر چکا ہے، تو فوراً اسے معزول کر دیا۔

ان کے عدل وانصاف اور رحم دلی وہم دردی کی گھنیری چھاؤں سے نہ صرف مسلمان مستفید ہوے، بلکہ غیر مسلم ذمی بھی پوری طرح فیض یاب ہوے۔ اپنے ایک ذمے دار (عدی بن اَرطاۃ) کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ:

”ذمّیوں کے ساتھ نرمی اور ہم دردی کا معاملہ کرو، ان میں اگر کوئی عمر دراز ہو

اور نادار ہو تو بیت المال سے اس کی کفالت کرو"۔

ایک گورنر نے امیر المؤمنین کو خط لکھا کہ شہر بوسیدہ ہو رہا ہے، اس کی مرمت اور اصلاح کی ضرورت ہے، لہٰذا اگر امیر المؤمنین کی نظر عنایت ہو تو اس کی مرمت کی جائے، جب انہیں خط ملا تو جواب میں لکھا کہ:

"مجھے تمہارا خط مل گیا اور اس کا مضمون بھی میں نے سمجھ لیا ہے، جب میرا خط ملے تو اپنے شہر کا عدل وانصاف کے ذریعے تحفظ کرو اور ظلم سے اسے پاک صاف کر دو، یہی اس کی مرمّت ہے، والسلام"۔[حلیۃ الاولیاء لابی نعیم]

فرمایا کہ جس قاضی (جج) کے اندر پانچ خصلتیں نہ ہوں اسے قاضی بننے کا حق نہیں: پاک دامن ہو، بردبار ہو، اپنے سے پیش رَو کے حالات ومسائل سے آگاہ ہو، اہلِ رائے سے مشورہ کرے اور لوگوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرے"۔[حلیۃ]

حکومتی خزانے سے اپنی رعایا پر اس قدر فراخ دلی اور انصاف کے ساتھ خرچ کیا کہ ہر خاندان اور ہر فرد خوش حال نظر آتا تھا، ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں افریقہ تک گیا اور اپنی زکات کسی کو دینا چاہتا تھا، لیکن زکات کا مستحق نظر نہیں آیا۔

ابن سعد نے الطبقات الکبری میں لکھا ہے کہ موسیٰ بن اَعْیُن کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہدِ خلافت میں کِرمان میں بکریاں چرایا کرتے تھے، چناں چہ بکریاں، بھیڑیے اور درندے ایک ساتھ ایک جگہ چرا کرتے تھے، ایک رات ہم نے دیکھا کہ ایک بھیڑیا ایک بکری پر جھپٹ پڑا، تو ہم نے کہا کہ لگتا ہے وہ صالح حاکم روپوش ہو گیا، بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اسی رات حضرت عمرؒ کا انتقال ہوا تھا۔

ان سے پہلے کے خلفاء کے درباری شعراء جو خلفاء کی تعریفیں کرتے، ان کی مدح

ومنقبت کے اشعار سناکر دادِ تحسین حاصل کرتے، پھر انعامات کی بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے، ان سب کو حاضری سے منع کر دیا اور فرمایا کہ کتاب اللہ میں مجھے شعراء کے لیے کسی عطیے کا ذکر نہیں ملا۔

مرض الموت اور حسنِ خاتمہ

صرف دو سال پانچ ماہ میں عادلانہ اور منصفانہ حکمرانی کی ایسی مثال قائم کی کہ پوری سلطنت میں امن وامان اور خوش حالی کا حسین منظر دکھائی دیتا تھا، جس کی وجہ سے لوگ دل کی گہرائیوں سے ان سے محبت کرتے تھے، تاہم کچھ بدقسمت ظالم ایسے تھے جن سے مغصوبہ زمینیں لے کر انہوں نے بیت المال میں جمع کروادی تھیں وہ ان کی اذیت کے درپے ہو گئے تھے۔

جب وہ شدید بیمار ہو گئے تو ایک روز مجاہد بن جبر سے پوچھا کہ لوگ اس بیماری سے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ نہیں، پھر اپنے ایک غلام کو بلا کر کہا: مجھے زہر پلانے پر تم کیسے آمادہ ہو گئے؟ اس نے کہا: مجھے ایک ہزار دینار دیے گئے اور آزادی کا وعدہ کیا گیا۔ یہ سن کر اس سے وہ دینار لے کر بیت المال میں جمع کرادیے اور فرمایا: ایسی جگہ بھاگ جاؤ جہاں تمہیں کوئی نہ دیکھے۔

اپنے تمام بچوں کو بلا کر ان کی طرف نم دیدہ آنکھوں سے دیکھا اور فرمایا: تمہارے سامنے دو راستے ہیں: یا تو تمہیں مالا مال کر دوں اور تمہارا باپ جہنم میں جائے، یا تنگ حال رہو اور تمہارا باپ جنت میں جائے، میں سمجھتا ہوں تم اس دوسری صورت کو پسند کرو گے، پھر فرمایا: جاؤ، اللہ تم سب کی حفاظت فرمائے۔

کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ فرمایا کہ اللہ کا تقویٰ چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر وہ نیک ہوں گے تو اللہ ان کی رکھوالی کرے گا اور نگہ بان ہوگا، اور اگر نیک نہیں ہوں گے تو اپنے مال کے ذریعہ ان کی معصیت میں مددگار بننا نہیں چاہتا۔

مقاتل بن سلیمان کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بارہ اولادیں چھوڑیں اور ترکہ میں صرف ۱۸ دینار چھوڑے، ان میں سے پانچ کفن میں لگ گئے اور چار قبر کھودنے میں، ۹ میں سے ورثہ کو تقسیم کیا گیا، جب کہ ہشام بن عبدالملک کی گیارہ اولادیں تھیں، ترکہ میں اتنا چھوڑا تھا کہ ہر ایک کو ایک ایک ملین دینار ملے۔

پھر فرمایا کہ میں نے ایک ہی دن میں یہ منظر دیکھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک لڑکا اللہ کے راستے میں سو گھوڑے جہاد کے لیے پیش کر رہا ہے، جب کہ ہشام بن عبدالملک کا ایک لڑکا ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ رہا ہے۔

بچوں کو الوداع کہنے کے بعد اہلیہ محترمہ کو بلا کر تقوی اللہ اور زہد و قناعت کی وصیت کی اور کہا کہ تم جاؤ، اب میں ایسی مخلوق دیکھ رہا ہوں جو نہ انسان ہیں نہ جنات، چناں چہ وہ نکل کر اپنے بھائی مسلمۃ بن عبدالملک کے ساتھ دروازے کے باہر بیٹھ گئیں، انھوں نے حضرت عمر کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا: ”میں خوش آمدید کہتا ہوں ان مبارک ہستیوں کو جو نہ انسان ہیں نہ جنات اور یہ آیت پڑھی:

﴿ تِلْكَ ٱلدَّارُ ٱلْءَاخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَٱلْعَٰقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٨٣﴾ ﴾ [القصص: ٨٣]

”وہ آخرت والا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں نہ

تو بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد، اور آخری انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہو گا"۔[سورہ قصص:۸۳]

یہ سن کر وہ اندر گئے تو دیکھا کہ خلیفۂ وقت نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی ہے۔ اس طرح اس دنیا کا وہ عظیم انسان، انصاف پسند، زہد و قناعت کا پیکر خلیفۂ خامس اپنے درخشاں و تابندہ نقوش چھوڑ کر اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور امت کو دوبارہ ان جیسا حکمراں نصیب فرمائیں۔

❋ ❋ ❋

۳/جمادی الاولی ۱۴۳۴ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

تقدیر پر ایمان

ایمان کے چھ ارکان ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ تقدیر بھلی ہو یا بری یہ سب اللہ کی طرف سے ہے، جیسا کہ حدیث جبریلؑ میں ہے؛ حضرت جبریلؑ نے حضور ﷺ سے ایمان کے بارے میں دریافت فرمایا تو آپ نے فرمایا:

«أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَمَلائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ...». [ترمذي شريف]

"ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور بھلی بری تقدیر پر ایمان لاؤ..."۔[ترمذی شریف]

قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾﴾ [القمر: ٤٩]

"بیشک ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے"۔[سورۂ قمر:۴۹]

اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئ کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، بلکہ اس کے وجود سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کو دخل ہے، لہٰذا جو چیز بھی وجود میں آتی ہے، جو واقعہ رونما ہوتا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے اس کے فیصلے اور ارادے کا نتیجہ ہے۔

«فَمَا شَاءَ كَانَ ، وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ، لَا رَادَّ لِقَضَائِهِ، وَلَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ»

''اللہ نے جو چاہا وہ ہوا، جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا، اس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کی حکمرانی پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا''۔

تقدیر پر ایمان کے چار مراتب

تقدیر پر ایمان لانے سے متعلق یہ وضاحت ضرور سمجھ لیں کہ اس کے چار درجات ہیں، ان تمام درجات پر ایمان لانا ضروری ہے:

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ جتنی موجودات ہیں وہ اپنے وجود سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھیں، لہٰذا زمین وآسمان میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔

﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٞ ﴿٢٣١﴾﴾ [البقرة: ٢٣١]

''اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے''۔[سورۂ بقرۃ:۲۳۱]

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز لوحِ محفوظ میں لکھ رکھی ہے، چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا فِي ٱلسَّمَآءِ وَٱلۡأَرۡضِۚ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَٰبٍۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٞ ﴿٧٠﴾﴾ [الحج: ٧٠]

''کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں اللہ کے علم میں ہیں، یہ

سب باتیں ایک کتاب میں محفوظ ہیں، بیشک یہ سارے کام اللہ کے لیے بہت آسان ہیں"۔[سورۂ حج:۷۰]

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ تمام واقعات وحوادث جو اس کائنات میں رونما ہوتے ہیں وہ سب اللہ کی مشیت، اس کے ارادے اور قدرتِ تامّہ سے وجود میں آتے ہیں:

﴿وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٢٩﴾﴾

[التكوير: ٢٩]

"یعنی تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے"۔[سورۂ تکویر:۲۹]

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿١٤﴾﴾[الحج: ١٤]

"یقیناً اللہ ہر وہ کام کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے"۔[سورۂ حج:۱۴]

تقدیر پر ایمان کا چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ تمام مخلوقات کو وجود بخشنے والا صرف اللہ ہی ہے، خالقِ کون ومکان صرف اللہ ہے، باقی سارے مخلوق ہیں۔

﴿ٱللَّهُ خَٰلِقُ كُلِّ شَىْءٍ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ وَكِيلٌ ﴿٦٢﴾﴾

[الزمر: ٦٢]

"اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا رکھوالا ہے"۔[سورۂ زمر:۶۲]

اسی ایک اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا، اسی نے اسباب ومُسبّبات کو پیدا کرکے اسباب کے ساتھ نتائج کو مربوط کر دیا، اس خَلق اور تدبیر میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔

﴿أَمْ جَعَلُوا۟ لِلَّهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوا۟ كَخَلْقِهِۦ فَتَشَٰبَهَ ٱلْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ ٱللَّهُ

خَٰلِقُ كُلِّ شَيۡءٖ وَهُوَ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّٰرُ ﴿١٦﴾ [الرعد: ١٦]

"کیا ان لوگوں نے اللہ کے ایسے شریک مانے ہوئے ہیں جنھوں نے کوئی چیز اسی طرح پیدا کی ہو جیسے اللہ پیدا کرتا ہے، اور اس وجہ سے ان کو دونوں کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہو رہی ہو، تم کہہ دو: صرف اللہ ہر چیز کا خالق ہے، اور وہ تنہا ہی ایسا ہے کہ اس کا اقتدار سب پر حاوی ہے"۔ [سورۂ رعد:۱۶]

تقدیرِ مُبرَم اور مُعَلَّق

تقدیر کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے تقدیرِ مُبرَم، دوسری قسم ہے تقدیرِ مُعَلَّق۔

تقدیرِ مُبرَم وہ تقدیر ہے جو ازلی ہے، جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اس تقدیر کو کوئی چیز ٹال نہیں سکتی، اسی کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ قٓ میں فرمایا ہے:

﴿ مَا يُبَدَّلُ ٱلۡقَوۡلُ لَدَيَّ وَمَآ أَنَا۠ بِظَلَّٰمٖ لِّلۡعَبِيدِ ﴿٢٩﴾ ﴾ [ق: ٢٩]

"میرے سامنے وہ بات بدلی نہیں جا سکتی اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں"۔ [سورۂ قٓ:۲۹]

دوسری قسم ہے تقدیرِ مُعَلَّق، یہ وہ تقدیر ہے جس میں ردّوبدل کی گنجائش ہوتی ہے، دعاؤں کی وجہ سے صدقات وخیرات اور صلۂ رحمی کی وجہ سے اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے، چناں چہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَرُدُّ القَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيدُ فِي العُمْرِ إِلَّا البِرُّ».

[رواه الترمذي]

"صرف دعا ہی تقدیر کو ٹال سکتی ہے، اور نیکی کے علاوہ کوئی چیز عمر میں اضافہ

نہیں کرسکتی"۔[ترمذی شریف]

اسی وجہ سے بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ وہ اس طرح دعا کرتے تھے:

«اللهُمَّ إِنْ كُنْتَ كَتَبْتَنِيْ شَقِيًّا فَامْحُنِيْ، واكْتُبْنِيْ سَعِيْدًا»

"اے اللہ! اگر آپ نے مجھے شقی اور محروم لکھ دیا ہے تو اسے مٹا کر مجھے سعادت مند لکھ دیجیے"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا ہے:

﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُۥٓ أُمُّ ٱلْكِتَٰبِ ﴿٣٩﴾﴾ [الرعد: ٣٨ – ٣٩]

"ہر زمانے کے لیے الگ کتاب دی گئی ہے —— اللہ جس حکم کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ اور تمام کتابوں کی جو اصل ہے وہ اسی کے پاس ہے"۔[سورۂ رعد:۳۸-۳۹]

تقدیرِ مُجمَل اور تقدیرِ مُفَصَّل

اجمال اور تفصیل کے اعتبار سے تقدیر کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے تقدیر مُجمَل، دوسری قسم ہے تقدیر مفصّل۔ اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر تمام چیزوں کو ایک جگہ جمع فرمادیا ہے، قیامت تک رونما ہونے والی ہر چیز کو ایک جگہ لکھ دیا ہے جسے "لوح محفوظ" کہتے ہیں۔ چناں چہ امام ترمذیؒ نے حضرت عبادۃ بن الصامتؓ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو یہ فرماتے ہوے سنا:

«إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللهُ القَلَمَ، فَقَالَ: اكْتُبْ، فَقَالَ: مَا

أَكْتُبُ؟ قَالَ: اكْتُبِ القَدَرَ مَا كَانَ، وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الأَبَدِ».

[رواه الترمذي]

''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کر کے فرمایا: لکھو، قلم نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھو جو ہو چکا اور جو ہوگا قیامت تک''۔[ترمذی شریف]

دوسری قسم ہے تقدیر مُفَصَّل، اس میں ساری تفصیلات لکھی جاتی ہیں، مثال کے طور پر: ''تقدیر عمری ''یعنی پوری عمر کی تفصیلات۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کی روزی، عمر، عمل اور سعادت یا شقاوت لکھ دی جاتی ہے جیسا کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے۔

اسی طرح ایک ''تقدیر حولی ''یعنی سالانہ تقدیر بھی ہے، جو لیلۃ القدر میں لکھی جاتی ہے، اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے:

﴿ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴿٤﴾ ﴾ [الدخان: ٤]

''اسی رات میں ہر حکیمانہ معاملہ ہمارے حکم سے طے کیا جاتا ہے''۔

[سورۂ دخان:۴]

اسی طرح ایک ''تقدیر یومی'' ہے، جس میں روزانہ کی تقدیر لکھی جاتی ہے، روزانہ کے حوادث موت وحیات اور عزت وذلت کی تفصیلات اس میں درج ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾﴾ [الرحمن: ٢٩]

''ہر روز وہ ایک شان میں ہے''۔[سورۂ رحمٰن:۲۹]

خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر کی جتنی صورتیں ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے جیسا

کہ اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے، اگر کسی نے تقدیر کی ان قسموں میں سے کسی کا بھی انکار کر دیا تو اس نے ایمان کے ایک رکن کا انکار کر دیا۔

تقدیر الٰہی اور انسان کے اختیارات

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کے سارے اختیارات اس سے لے لیے گئے ہیں اور وہ مجبور محض ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو قدرت وارادہ اور اختیارات دیے ہیں، اسے نفع ونقصان کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت دی ہے، وہ خیر وبھلائی کو پہچان کر اپنے ارادے اور اختیار سے اس پر عمل کر سکتا ہے، اسی طرح شر اور برائی کو بھی پہچان کر اپنے ارادے اور اختیار سے اس سے باز رہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے اور برے دونوں راستے انسان کو دکھا دیے ہیں، پھر انسان کو اختیار دے دیا ہے، دونوں میں سے جس کو چاہے اختیار کرے اور دونوں کے نتائج کو سامنے رکھ کر اپنا انجام متعیّن کرے — چوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا ہے؛ بلکہ اسے اختیارات دیے ہیں، اسی لیے کارِ خیر پر اسے اجر وثواب عنایت کرتا ہے اور کار شر پر سزا اور عذاب دیتا ہے۔ البتہ اگر کوئی عاجز ہو، یا کسی عمل پر اسے مجبور کیا گیا ہو یا بھول گیا ہو تو اس سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان صورتوں میں قدرت وارادے کا فقدان ہے۔

تقدیر کے مسئلے میں غلط فہمی

مسئلۂ تقدیر میں بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب سب

کچھ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے، ہر چیز کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے تو پھر ہمیں کسی طرح کی کوشش اور محنت وعمل کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہم سعادت مند لکھ دیے گئے ہیں تو سعادت مند ہی رہیں گے، اگر بدبخت لکھ دیے گئے ہیں تو بدبخت ہی رہیں گے، لہٰذا امر بالمعروف کی ضرورت ہے نہ نہی عن المنکر کی ضرورت ہے، نہ کسی مجاہدے کی کوئی حاجت ہے۔

لیکن اس نظریے کا غلط ہونا قرآنِ کریم کی بعض آیات سے بھی ثابت ہے، اگر عقل کی کسوٹی پہ رکھا جائے تب بھی یہ باطل معلوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ دنیوی امور میں انسانوں کا معاملہ دیکھا جائے تو وہ بھی اس کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾ ﴾ [النساء: ١٦٥]

"یہ سب رسول وہ تھے جو (ثواب کی) خوش خبری سنانے اور (دوزخ سے) ڈرانے والے بناکر بھیجے گئے تھے، تاکہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ کا اقتدار بھی کامل اور حکمت بھی کامل"۔[سورۂ نساء:۱۶۵]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ تقدیر کو حجت کے طور پر پیش کرنا اگر صحیح ہوتا تو یہ حُجیّت رسولوں کے تشریف لانے کی وجہ سے ختم نہیں ہوتی، حالاں کہ آیت سے پتہ چلا کہ رسولوں کی تشریف آوری کے بعد نہ کوئی عذر باقی رہے گا نہ کوئی حجّت۔

دوسری آیت میں ہے:

﴿ سَيَقُولُ ٱلَّذِينَ أَشْرَكُوا۟ لَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَآ أَشْرَكْنَا وَلَآ ءَابَآؤُنَا

وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا۟ بَأْسَنَا ۗ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

”جن لوگوں نے شرک اپنایا ہوا ہے، وہ یہ کہیں گے: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اسی طرح (رسولوں کو) جھٹلایا تھا، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا“۔ [سورۂ انعام:۱۴۸]

اس آیت کریمہ سے بھی معلوم ہوا کہ تقدیر کو حجت بنا کر پیش کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو مشرکین کا اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے شرک پر تقدیر کے ذریعہ احتجاج کی وجہ سے ان کی حجت اور معذرت قبول کی جاتی اور انہیں عذاب نہیں دیا جاتا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کا مزہ چکھایا اور اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔

معصیت کو تقدیر سے جوڑنا نامعقول

جرم کا ارتکاب کرنا، گناہ پر گناہ کرتے جانا اور یہ کہنا کہ ہماری تقدیر میں یہی لکھا ہے، یہ قرآنی آیات کے خلاف تو ہے ہی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اسی طرح یہ عقل و خرد کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ تقدیر کو حجت بنانا اسی وقت صحیح ہوتا جب یہ معلوم ہو کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے، لیکن جب کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے تو نامعلوم چیز کو بنیاد بنانا کیسے صحیح ہوگا۔ اگر کوئی شخص کسی کا مال چرالے، یا کسی پر زیادتی کرے یا کسی کو قتل کرے اور یہ کہے کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا، کیا لوگ اس کا عذر قبول کرلیں گے؟ یقیناً یہ حجت باطل ہوگی، اسی طرح حقوق اللہ میں کوتاہی کرکے اگر تقدیر کو حجت میں پیش کریں

گے تو یہ حجت باطل ہوگی۔

فرائض وواجبات ترک کرکے اور گناہوں کا ارتکاب کرکے نوشتۂ تقدیر کو اس کا ذمہ دار قرار دینا امر واقعہ کے بھی خلاف ہے، چناں چہ اگر کسی ملازمت کے لیے اعلان آئے یا کسی مشہور و معروف تعلیم گاہ میں داخلہ لینا ہو، جہاں بے شمار درخواستیں ڈالی گئی ہوں تو خواہش مند حضرات اپنی تمام تر کوششیں کرڈالتے ہیں، کوئی بھی تقدیر کے حوالے کرکے گھر نہیں بیٹھتا کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوگا، لہٰذا محنت و جاں فشانی کی کیا ضرورت؟ لیکن اعلیٰ ترین مقصد یعنی رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کے لیے اگر اس کے اسباب و عوامل بیان کیے جاتے ہیں تو تقدیر کا بہانہ بناکر بعض لوگ جان چھڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں جو در حقیقت نفس اور شیطان کا بڑا دھوکہ ہے۔

البتہ جو کام غیر اختیاری ہیں ان کے سلسلے میں تقدیر کو حجت بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے، مثال کے طور پر بیماریوں میں مبتلا ہونا، یا موت کا آجانا یا ناگہانی کسی ہلاکت خیز چیز کا اوپر سے جسم پر گرجانا اور تباہ ہوجانا وغیرہ۔ اسی وجہ سے کسی مجنون یا معذور سے ترکِ واجبات پر کوئی مؤاخذہ اور باز پرس نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔

تقدیر پر ایمان کے فوائد

قضا وقدر کے فیصلے پر ایمان کامل کے بہت سارے منافع ہیں، سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، کیوں کہ تقدیر پر ایمان لانا، ایمان کے چھ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان لانے والا بے چینی

اور بے قراری کی کیفیات میں مبتلا نہیں ہوتا، بحیثیت انسان کے جب اس پر مشکل حالات آتے ہیں تو متأثر ضرور ہوتا ہے لیکن تقدیر پر ایمان اسے سہارا دیتا ہے، اطمینانِ قلب کا ذریعہ بنتا ہے؛ کیوں کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ:

«مَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ، وَمَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ»

”جو مصیبت اس پر آئی ہے، وہ اس سے بچ نہیں سکتا تھا، جو مصیبت نہیں آئی ہے اس میں ہر گز مبتلا نہیں ہو سکتا“۔

اس ایمان کی وجہ سے اگر کوئی چیز ہاتھ سے نکل جاتی ہے، یا ہزار کوشش کے باوجود کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا تو حسرت وناامیدی کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرتا۔ قرآن کریم نے اس کی طرف رہنمائی کی ہے:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي ٱلْأَرْضِ وَلَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَٰبٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَآ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا۟ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا۟ بِمَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿٢٣﴾﴾ [الحديد: ٢٢ – ٢٣]

”کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں نازل ہوئی ہو یا تمہاری جانوں کو لاحق ہوئی ہو، مگر وہ ایک کتاب میں اس وقت سے درج ہے جب ہم نے ان جانوں کو پیدا بھی نہیں کیا تھا، یقین جانو یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے — یہ اس لیے کہ جو چیز تم سے جاتی ہے، اس پر تم غم میں نہ پڑو، اور جو چیز اللہ تمہیں عطا فرمادے، اس پر تم اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اتراہٹ میں مبتلا ہو، شیخی بگھارنے والا ہو“۔[سورۂ حدید:۲۲-۲۳]

چوں کہ ہر مسلمان تقدیر پر ایمان رکھتا ہے، اسے معلوم ہوتا ہے، بلکہ یقین ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شئ ایک ہی قادر مطلق کے حکم پر حرکت کرتی ہے، نفع نقصان اور موت وحیات اور عزت وذلت کا مالک وہی ہے، اسی لیے حالات سے گھبرا کر یا مایوس ہو کر وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتا، اسی لیے پوری دنیا میں خودکشی کا تناسب مسلمانوں میں ہر قوم سے کم ہے، خودکشی عام طور پر وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ پر اور اس کی تقدیر کے فیصلے پر ایمان نہیں رکھتے — مسلمان تو مشکل ترین حالات میں بھی ایمان، تقویٰ اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، بلکہ صبر کر کے اجر عظیم کا مستحق بنتا ہے۔

﴿ مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۗ وَمَن يُؤۡمِنۢ بِٱللَّهِ يَهۡدِ قَلۡبَهُۥۚ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٞ ۝١١ ﴾ [التغابن: ١١]

"کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی، اور جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔[سورۂ تغابن:۱۱]

قضا وقدر کے فیصلے پر جو کامل ایمان رکھے گا اور اس سے راضی ہوگا، اس کا دل کینہ اور حسد سے پاک ہوگا، کیوں کہ اسے اطمینان ہوگا کہ اگر کوئی نعمت اسے نہیں ملی، کسی چیز سے محروم ہوگیا، یا کسی دوسرے کو اس پر برتری حاصل ہوگئی تو یہ اللہ کی مرضی سے ہوئی ہے، وہ حکمت والا ہے، وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کس کو کیا دینا ہے اور کس کو کیا نہیں دینا ہے۔ تقدیر پر راضی رہنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ دل سے حسد نکل جاتا ہے؛ بلکہ دل، سکون واطمینان کی وجہ سے سعادت وفرحت کا گہوارہ بن جاتا ہے، پھر بندہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

ایک وضاحت

تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی مصیبت نازل ہو یا خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کی وجہ سے رنج وغم اور تکلیف کا احساس ہی نہ ہو، بلکہ یہ تو فطری امر ہے کہ تکلیف کا احساس ہو اور رنج وغم اور حزن وملال ہو، لیکن تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ زبان سے نازیبا الفاظ نہ نکلیں، اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کریں، اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی جب وفات ہوئی تو آپ کی آنکھیں نم تھیں، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے حیرت کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا:

''ابن عوف! یہ رحمت ہے'' پھر فرمایا:

«إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ». [صحيح البخاري]

''آنکھیں اشک بار ہیں، دل، غم زدہ ہے اور ہم زبان سے وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہو، اور اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے غم گین ہیں''۔[بخاری شریف]

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ناجائز، حرام اور منکرات سامنے آئیں تو یہ کہہ کر خاموشی اختیار کرلینا کہ یہی فیصلۂ تقدیر ہے، غلط ہے، کیوں کہ ''نہی عن المنکر'' یعنی برائی سے روکنے کا حکم جگہ جگہ نصوص میں وارد ہے۔

اسی طرح یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ دعا کرنا، تقدیر پر راضی رہنے کے منافی اور خلاف نہیں، بلکہ دعا کرنے کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور رسول اکرم ﷺ سے دعا کرنا

اور دعا کی ترغیب دینا بھی ثابت ہے، منجملہ ان دعاؤں کے یہ دعا بھی وارد ہے کہ:

"اے اللہ مجھے تقدیر کے فیصلے پر راضی رہنے کی توفیق عطا فرما"۔[نسائی شریف]

اللهمَّ إنّا نسألكَ خشيتَك في الغيبِ والشهادةِ وكلمة الحقِ في الرضا والغضب، ونسألك الرضا بالقضاء، وبرد العيش بعد الممات، ولذة النظر إلى وجهك الكريم، والشوق إلى لقائك.

❋ ❋ ❋

۱۴۳۳/۵/۲۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تین قسم کے انسان

پہلی قسم کے لوگ

اللہ تعالیٰ کی معرفت، محبت اور اس سے استعانت کے سلسلے میں تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو ہر حال میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں، کسی حال میں اسے نہیں بھولتے، خوش حالی میں ہوں یا تنگ حالی میں، مصیبت میں ہوں یا راحت میں، فقر وفاقہ میں ہوں یا مال داری میں، مشکل میں ہوں یا آسانی میں وہ ہر حال میں اللہ کو پہچانتے اور اسے یاد کرتے ہیں، نماز، توبہ واستغفار، تکبیر وتہلیل، تسبیح وتحمید میں رطب اللسان رہتے ہیں، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں؛ بلکہ جوں جوں نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، ان کی شکر گزاری میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، جب صبح ہوتی ہے تو دل کی گہرائیوں سے یہ کہتے ہیں:

«مَا أَصْبَحَ بِي مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ، فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيكَ لَكَ، فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ».

”اے اللہ! اس صبح کو جن نعمتوں سے میں بہرہ یاب ہوا یا آپ کی مخلوقات میں

سے کوئی بھی ہوا ہو، وہ نعمتیں صرف اور صرف آپ ہی سے ہمیں ملی ہیں، لہٰذا تمام تعریفیں اور ہر طرح کی شکر گزاری صرف آپ ہی کو زیب دیتی ہیں"۔

اس مؤمن کو پروردگار کی نوازشوں کا، اس کے احسانات وانعامات کا بھرپور ادراک ہوتا ہے، وہ نعمتیں جو دائیں بائیں اوپر نیچے اور آگے پیچھے سے اس کا احاطہ کیے ہوے ہیں، ان کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ جس وقت ماں کی گود میں تھا، نہ منہ میں دانت تھے، نہ ہاتھوں میں قوت تھی، نہ پیروں میں چلنے کی صلاحیت تھی، نہ اپنی بات زبان سے کہنے کی قدرت تھی، ایسی حالت میں ماں کی چھاتی سے اس کے لیے ایسا خالص دودھ جو غذائیت سے پُر تھا کس نے نکالا؟ ماں باپ کے دلوں میں اس کی اتھاہ محبت کس نے ڈالی؟ اس کے رونے سے وہ بے چین ہو جاتے تھے، اس کی تکلیف سے وہ تڑپ جاتے تھے، اس کے جسم سے نکلنے والی غلاظتوں کی صفائی میں ذرا بھی تردد نہیں کرتے تھے، بے پناہ جذبۂ محبت وخدمت بلکہ ایثار وہم دردی ان کے دلوں میں کس نے ودیعت کی؟ أَ إِلٰهٌ مَعَ اللهِ؟ کیا کوئی اور ہے اللہ کے سوا جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہو؟

اسے کائنات کے ہر ذرے میں قادرِ مطلق کے تخلیقی شاہ کار کے جلوے نظر آتے ہیں: ہواؤں کے جھونکے میں، بادلوں کے چلنے اور چھانے میں، نہروں کے بہنے میں، سورج کی کرنوں میں، چاند کی خوب صورتی میں، نسیم صبح میں، بہار شام میں، دن کی روشنی میں اور رات کی تاریکی میں، چوپایوں کے مُسخّر ہونے میں اور پودوں کے اگنے اور پھولوں کی خوشبوؤں میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، بغیر ستون کے آسمانوں میں، سطح زمین میں، سمندر کی موجوں میں اور نئی نئی ایجادات میں۔ الغرض ہر چیز میں اللہ کی قدرت کے مناظر نظر آتے ہیں، ذیل کی آیات کو وہ پڑھتے ہیں اور شکر وامتنان کے

زمزمے میں سرمست ہوجاتے ہیں۔

﴿أَلَمْ تَرَوْا۟ أَنَّ ٱللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُۥ ظَـٰهِرَةً وَبَاطِنَةً ۗ﴾ [لقمان: ۲۰]

”کیا تم لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسے اللہ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری پوری نچھاور کی ہیں“۔[سورۂ لقمان:۲۰]

﴿سُبْحَـٰنَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلْأَزْوَٰجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾﴾ [یس: ۳٦]

”پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں، اس پیداوار کے بھی جو زمین اگاتی ہے اور خود انسانوں کے بھی اور ان چیزوں کے بھی جنھیں یہ لوگ جانتے تک نہیں“۔[سورۂ یس:۳۶]

﴿وَهُوَ ٱلَّذِىٓ أَرْسَلَ ٱلرِّيَـٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهِۦ ۚ وَأَنزَلْنَا مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً طَهُورًا ﴿٤٨﴾﴾ [الفرقان: ٤٨]

”اور وہی ہے جس نے اپنی رحمت سے پہلے ہوائیں بھیجیں جو (بارش کی) خوش خبری لے کر آتی ہیں، اور ہم نے ہی آسمان سے پاکیزہ پانی اتارا ہے“۔

[سورۂ فرقان:۴۸]

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى ٱلْبَحْرِ بِأَمْرِهِۦ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلْأَنْهَـٰرَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلشَّمْسَ وَٱلْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلَّيْلَ وَٱلنَّهَارَ ﴿٣٣﴾﴾ [إبراهيم: ٣٢ – ٣٣]

”اور کشتیوں کو تمہارے لیے مسخّر کر دیا، تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلیں، اور دریاؤں کو بھی تمہاری خدمت پر لگا دیا، اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو اس طرح کام پر لگا دیا کہ وہ مسلسل سفر میں ہیں، اور تمہاری خاطر رات اور دن کو بھی کام پر لگا دیا“۔ [سورۂ ابراہیم: ۳۲-۳۳]

اس طرح یہ بندۂ مومن ہر جگہ اور ہر آن اللہ کی رحمت کے آثار اور اس کی قدرت کے مناظر کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور نتیجتاً اس کا دل جذبۂ شکر و امتنان سے لبریز رہتا ہے۔

خوش حالی میں اللہ کو پکارنے کا ثمرہ

جو مسلمان خوش حالی کے زمانے میں اللہ سے غافل نہیں ہوتا، سامانِ عیش وعشرت کی بہتات کے باوجود اپنے پروردگار کی چوکھٹ سے سر نہیں اٹھاتا، دنیاوی اسباب آرام وراحت کی کثرت کے باوجود اپنے رب کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، پھر کوئی ناگہانی مصیبت اس پر آجاتی ہے، ناخوش گوار حالات سے وہ یا اس کی فیملی کا کوئی فرد دوچار ہو جاتا ہے تو اس پریشانی میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر ”یارب“ کہہ کر پکارتا ہے، تو اس کا رب اسے مایوس نہیں کرتا، کیوں کہ جس رب کو اس نے اپنے اچھے دنوں میں نہیں بھلایا تھا وہ رب بھی اس کے برے دنوں میں اسے نہیں بھولتا، اسی مفہوم کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مخاطب کرکے اس طرح بیان فرمایا:

«احْفَظْ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ تَعَرَّفْ إِلَى اللهِ فِي الرَّخَاءِ، يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ». [رواه أحمد]

اللہ کے حدود کی حفاظت کرو، تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے، خوش حالی میں اللہ کو

پہچانو تو بدحالی میں وہ تمہیں پہچانے گا"۔[احمد]

جان ومال کے اوپر آئی ہوئی مصیبت اگر کسی حکمت کی وجہ سے جسے اللہ ہی جانتا ہے، ختم نہ بھی ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ اس کے دل کو سکون واطمینان کا گہوارہ بنادیتے ہیں، وہ اللہ کی مرضی اور قضا وقدر کے فیصلے پر پوری طرح راضی اور مطمئن رہتا ہے، نہ حیرانی وپریشانی کا اظہار کرتا ہے، نہ ہی شکوے کرتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جو مصیبت آنے والی ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور جو نہیں آنے والی ہے اسے کوئی لا نہیں سکتا اور پروردگار اپنے بندوں پر مہربان ہے، بعض دفعہ زحمتوں کے پس پردہ رحمتیں چھپی رہتی ہیں، رات کی تاریکی کے بعد دن کا اجالا نظر آتا ہے۔

﴿فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾﴾ [النساء: ١٩]

"تو یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔[سورۂ نساء:۱۹]

صحابۂ کرامؓ کا معاملہ رب ذوالجلال کے ساتھ

حضرات صحابۂ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ وہ خوش حالی اور تنگ حالی، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ سے وابستہ رہے، نہایت مشکل ترین حالات سے بھی دوچار ہوئے اور بعد کی فتوحات بھی دیکھیں اور دنیا ان کے قدموں میں آئی، لیکن کسی حال میں اللہ سے دور نہیں ہوئے، بلکہ جب دنیا کی زیب وزینت ان کے سامنے آئی تو بقدر ضرورت پر اکتفا کیا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہے، اسی طرح جب مصیبتیں آئیں، بلکہ مصائب کے پہاڑ ان پر

ٹوٹے تو صبر کیا اور اللہ سے اجر کی امید رکھی، کیوں کہ ان کی نگاہوں کے سامنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک تھا:

«عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ». [رواه مسلم]

”مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، یقین جانو کہ اس کا ہر معاملہ اس کے لیے بھلائی کا ہے، اور یہ بات مومن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں: اسے خوش حالی ملے پھر وہ شکر کرے تو یہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے، اور اگر کوئی مصیبت آئے اور اس پر صبر کرے تو یہ بھی اس کے لیے باعث خیر ہی ہے“۔ [مسلم شریف]

دوسری قسم کے لوگ

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خوش حالی اور عیش وعشرت کے زمانے میں اللہ سے غافل ہوجاتے ہیں، آرام وراحت اور عزت ووجاہت اور مال ودولت کے نشے میں سرمست ہوکر، آخرت کو بھول کر، احکامِ الٰہی کو توڑکر، فرائض وواجبات کو چھوڑکر غفلت ولاپرواہی کی زندگی گزارتے ہیں؛ لیکن جوں ہی کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے، کوئی ناگہانی آفت آجاتی ہے یا گردش آیام میں گھر جاتے ہیں توان کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے، دل بیدار ہوجاتا ہے، آنکھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قسم کے لوگوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

﴿فَإِذَا مَسَّ ٱلْإِنسَـٰنَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَـٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ

إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلۡمِۭۚ بَلۡ هِىَ فِتۡنَةٞ وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُونَ ﴿٤٩﴾ [الزمر: ٤٩]

”پھر انسان (کا حال یہ ہے کہ جب اس) کو کوئی تکلیف چھو جاتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، اس کے بعد جب ہم اسے اپنی طرف سے کسی نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ: یہ تو مجھے اپنے ہنر کی وجہ سے ملی ہے، (نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے“۔ [سورۂ زمر:۴۹]

مصائب و مشکلات اور پریشان کن حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اور اس کو پکارنا یقیناً ایمان کی علامت ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا ماویٰ اور ملجا سمجھتے ہیں، اللہ کے سوا ہے کون جس سے فریاد کریں؟ وہی خوف زدہ کو امن دینے والا، امیدواروں کی امیدیں برلانے والا، بے کسوں کا وارث، بے بسوں کا معاون، شکستہ دلوں کا غم خوار، مصائب کو ٹالنے والا، بلاؤں اور آفتوں کو دور کرنے والا، پناہ طلب کرنے والوں کی جائے پناہ اور کمزوروں کا حامی اور ناصر ہے، لہٰذا مشکل حالات میں اس کے دروازہ کو کھٹکھٹانا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا اور اپنی کمی کوتاہی پر معافی مانگنا نہ صرف ایمان کی علامت ہے؛ بلکہ یہ عمل بھی اللہ تعالیٰ کو نہایت محبوب ہے، کیوں کہ بندے کی توبہ سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے اور ان کے گناہوں کو بالکل مٹا دیتا ہے۔

تاہم یہ احسان فراموشی ہے کہ جب اللہ اپنی نعمتوں کی بارش برسانے لگے تو بندہ اس سے منھ موڑ لے اور اس کے در کو چھوڑ دے اور اس سے ناطہ توڑ لے، کیوں کہ یہ احسان فراموشی اللہ کے غضب کو دعوت دیتی ہے، اس کے عذاب کے نزول کا سبب ہے۔ اس طرح کی صورت حال کا ذکر قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جس میں ایک

قوم کی ناشکری اور نافرمانی کی وجہ سے انہیں عذاب کا شکار ہونا پڑا:

﴿وَضَرَبَ ٱللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ ءَامِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ ٱللَّهِ فَأَذَٰقَهَا ٱللَّهُ لِبَاسَ ٱلْجُوعِ وَٱلْخَوْفِ بِمَا كَانُوا۟ يَصْنَعُونَ ﴿١١٢﴾﴾ [النحل: ١١٢]

”اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے جو بڑی پر امن اور مطمئن تھی، اس کا رزق اس کو ہر جگہ سے بڑی فراوانی کے ساتھ پہنچ رہا تھا، پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری شروع کر دی، تو اللہ نے ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف ان کا پہننا اور اوڑھنا بن گیا“۔ [سورۂ نحل:۱۱۲]

مشکل یہ ہے کہ کمزور اور مسکین انسان جب مال و دولت کی ریل پیل اور عیش و عشرت کی بہاریں دیکھتا ہے، پر شکوہ عمارت، قیمتی کار اور عظیم بینک بیلنس وغیرہ تو نفس اپنی طغیانی اور سرکشی دکھلانے لگتا ہے، تکبر و گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے، خود بینی و خود سرائی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر و توہین کرنے لگتا ہے، پھر آہستہ آہستہ فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات میں کوتاہی کرنے لگتا ہے، بلکہ اس کا غرور اور گھمنڈ اسے تباہی کے دہانے پہ لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

اسی لیے اگر تباہی و بربادی اور آخرت کی رسوائی سے بچنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی اور اپنے مال و دولت کی حقیقت کو نہ بھولیں، یاد رکھیں کہ یہ دنیاوی زیب و زینت، مال و دولت،، اسباب آرام و راحت اور عیش و عشرت صرف چند روزہ ”متاع“ ہیں، ان سب کو چھوڑ کر خالی ہاتھ قبر میں لیٹنا ہو گا، وہاں صرف وہی ”باقیات صالحات“یعنی ہمیشہ رہنے والے نیک اعمال ہی کام آئیں گے جو اپنی زندگی میں رضائے الٰہی کے لیے کیے ہوں گے۔

سرکشی اور آخرت فراموشی کی وجہ

انسان کی اس کمزور نفسیات کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ العلق میں ان آیات کے بعد ذکر فرمایا ہے جو پہلی وحی کی آیات ہیں، اس میں واضح طور پر بیان فرمایا کہ یہ انسان جب اپنے پاس مال و دولت کی بہتات دیکھتا ہے تو سرکشی میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ عام طور پر ہوتا ہے، اور یہی مشاہدہ بھی ہے، بے بسی، بے کسی اور فقر و فاقے کے زمانے میں بہت متواضع اور خاک سار اور ملن سار رہتا ہے، عبادت گزار اور پرہیز گار رہتا ہے؛ لیکن جوں ہی مال آتا ہے، وہ اپنی طرف اتنی شدت سے مائل کر لیتا ہے کہ پھر وہ اپنے پرانے دن بھول جاتا ہے، الا من رحمہ اللہ، ارشاد خداوندی ہے:

﴿ كَلَّآ إِنَّ ٱلْإِنسَٰنَ لَيَطْغَىٰٓ ﴿٦﴾ أَن رَّءَاهُ ٱسْتَغْنَىٰٓ ﴿٧﴾ ﴾

[العلق: ٦ — ٧]

”حقیقت یہ ہے کہ انسان سرکشی کرتا ہے، وہ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو (مال و دولت کی وجہ سے) خدا سے بے نیاز سمجھتا ہے“۔[سورۂ علق:۶-۷]

وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہے، عیش و عشرت کے اس عالم کو اور کیف و مستی کی اپنی حالت کو ابدی سمجھ لیتا ہے، افسانہ کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ ٱلرُّجْعَىٰٓ ﴿٨﴾ ﴾ [العلق: ٨]

”حالاں کہ واپس تجھے اپنے رب کے پاس ہی جانا ہے“۔[سورۂ علق:۸]

خواہ یہ بندہ اطاعت گزار ہو یا معصیت شعار ہو، ہر ایک کو بارگاہِ خداوندی میں

حاضر ہونا ہے۔

﴿ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾﴾ [البقرة: ٢٨١]

”پھر ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا“۔[سورۂ بقرہ:۲۸۱]

تیسری قسم کے لوگ

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دلوں میں کسی حال میں بھی حرکت نہیں ہوتی، وہ اتنے سنگ دل ہوتے ہیں کہ وہ خوشی اور غمی ہر حال میں غافل رہتے ہیں، نعمتوں کا انبار لگا ہو، خوش حالی کے بامِ عروج پہ ہوں یا خستہ حالی اور تنگ حالی کے دَل دَل میں پھنسے ہوں؛ کسی حال میں بھی دل نرم نہیں ہوتا، اور اللہ کو یاد نہیں کرتے؛ ایسے ہی لوگوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿٧٦﴾﴾

[المؤمنون: ٧٦]

”اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں تکلیف میں بھی مبتلا کیا، پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں“۔[سورۂ مؤمنون:۷۶]

اسی طرح کے لوگوں کے سلسلے میں یہ آیتیں بھی نازل ہوئی ہیں:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ فَلَمَّا

نَسُواْ مَا ذُكِّرُواْ بِهِۦ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَٰبَ كُلِّ شَىْءٍ حَتَّىٰٓ إِذَا فَرِحُواْ بِمَآ أُوتُوٓاْ أَخَذْنَٰهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ ٱلْقَوْمِ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ ۚ وَٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٤٥﴾ [الأنعام: ٤٢ – ٤٥]

”تم سے پہلے ہم نے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے، پھر (ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے) ہم نے انہیں سختیوں اور تکلیفوں میں گرفتار کیا، تاکہ وہ اظہار عاجزی کر سکیں —پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ان کے پاس ہماری طرف سے سختی آئی تھی، اس وقت وہ عاجزی کا رویہ اختیار کرتے؛ بلکہ ان کے دل تو اور سخت ہوگئے، اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، شیطان نے انہیں سمجھایا کہ وہی بڑے شان دار کام ہیں —پھر انہیں جو نصیحت کی گئی تھی، جب وہ اسے بھلا بیٹھے تو ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جو نعمتیں انہیں دی گئی تھیں، جب وہ ان پر اترانے لگے تو ہم نے اچانک ان کو آپکڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل مایوس ہو کر رہ گئے۔ اس طرح جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی، اور تمام تعریفیں اللہ کی ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے“۔[سورۂ انعام:۴۲-۴۵]

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ دنیاوی نعمتوں کی مینہ برساتا ہے، ان کے لیے مال و دولت کے دہانے کھول دیتا ہے، آرام وآسائش کے سارے اسباب مہیا کر دیتا ہے؛ کسی کو بڑے منصب پر فائز کر دیتا ہے، کسی کو کمپنیوں کا مالک بنا دیتا ہے، بعض کو سلطنت اور حکمرانی بھی عطا کرتا ہے، اور بعض لوگوں کو یہ تمام چیزیں بیک وقت دے کر آزماتا ہے؛ لیکن اکثر لوگ امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں، اللہ کی ناشکری کرتے ہیں، ان نعمتوں کو اپنی صلاحیت اور محنت کی طرف منسوب کرتے ہیں، دوسرے بندگانِ خدا پر بہ جائے احسان وہم دردی کے ظلم وستم کرنے لگتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ انہیں اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، ان پر ہلاکت

خیز بادل چھانے لگتے ہیں، بلکہ اللہ کا عذاب انہیں آپکڑتا ہے، پھر بھی ان کی سنگ دلی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ان کی انانیت ختم نہیں ہوتی، اللہ کے سامنے نہیں جھکتے، یہ وہ بدبخت اور بدترین لوگ ہیں جن سے جانور اور چوپائے بھی بدرجہا بہتر ہیں۔ اسی طرح کے بدنصیبوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِۦ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ ٱلصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ ٱلْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٠﴾﴾ [العنكبوت: ٤٠]

”ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ میں لیا، چناں چہ ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کچھ وہ تھے جن کو ایک چنگھاڑ نے آپکڑا، اور کچھ وہ تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسادیا، اور کچھ وہ تھے جنھیں پانی میں ہم نے غرق کردیا۔ اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن یہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے“۔ [سورۂ عنکبوت: ۴۰]

یہ تیسری قسم سب سے بدترین لوگوں کی قسم ہے، یہ لوگ نہ دوسروں سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ خود اپنی مصیبتوں کی وجہ سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کے دلوں پر گم راہی کی مہر لگ گئی ہوتی ہے، اس لیے وہ کسی حال میں ہدایت یاب نہیں ہوتے۔

ان تینوں میں سب سے اعلیٰ وارفع پہلی قسم ہے، یہ وہ خوش نصیب اور سعادت مند لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، ہر حال میں اس کے شکر گزار رہتے ہیں۔

❋ ❋ ❋

۲۶/شعبان ۱۴۳۴ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

ماہِ رمضان کی بشارت اور حسنِ استقبال

دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں بسنے والے تمام مسلمان ان دنوں (شعبان کے آخر میں) اپنے مبارک اور عظیم و کرم نواز مہمان کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں، وہ مہمانِ مکرم جس کی جدائی پہ ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہے، جو خیر و برکت اور روحانیت کی نویدِ مسرت لے کر آتا ہے، ایمان ویقین کو تازہ کرتا ہے، تقویٰ و پرہیزگاری، تعلق مع اللہ اور خشیتِ الٰہی کی تجدید کرتا ہے، ہر مؤمن کو سکینت و وقار، صبر و تحمل اور ہم دردی و غم خواری کا درس دیتا ہے اور آخرت کی فکر اور اس کی تیاری کے لیے سرگرم عمل بنا دیتا ہے — یہ وہ رمضان کا مبارک مہینہ ہے جس کے انتظار میں ہر شخص سراپا شوق بنا ہوا ہے۔

نبوی بشارت

رمضان المبارک کا مہینہ جب آتا تھا تو رسول اکرم ﷺ صحابۂ کرامؓ کو اس کی بشارت دیتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک بار جب رمضان کا مہینہ آیا تو آپؐ نے فرمایا:

«قَدْ جَاءَکُمْ رَمَضَانُ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، افْتَرَضَ اللهُ عَلَيْكُمْ

صِيَامَهُ، تُفْتَحُ فِيهِ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ، وَتُغْلَقُ فِيهِ أَبْوَابُ الْجَحِيمِ، وَتُغَلُّ فِيهِ الشَّيَاطِينُ، فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ». [مسند أحمد]

"رمضان کا مہینہ آگیا ہے، یہ بابرکت مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کیے ہیں، اس ماہ میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں، اور شیطانوں کو بھی قید کردیا جاتا ہے، اس میں ایک ایسی رات ہے جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، جو اس رات کی خیر سے محروم ہوگیا وہ واقعی محروم ہوگیا"۔ [مسند احمد]

ایک روایت میں ہے کہ رمضان کی آمد کے موقع پہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو اس کی خوش خبری دیتے ہوئے فرمایا:

«أَتَاكُمْ رَمَضَانُ، سَيِّدُ الشُّهُورِ، فَمَرْحَبًا بِهِ وَأَهْلا».

[لطائف المعارف لابن رجب]

"تمام مہینوں کا سردار رمضان کا مہینہ آگیا، اس کا آنا مبارک ہو، فراخ دلی کے ساتھ اس کا استقبال ہے"۔

یہ وہ مقدس مہینہ ہے جس کا ہر لمحہ بابرکت ہے، ہر آن رحمتوں کی بارش ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے دریائے مغفرت جوش میں ہے، نفل کا ثواب فرض کے برابر ہے، ایک فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے، ہر روز اعلانِ عام ہوتا ہے: اے خیر کے طالب! آگے بڑھو، اے شر کے متلاشی! باز آجاؤ، اور ہر روز اللہ تعالیٰ ایک بڑی تعداد کو جہنم سے آزاد فرماتے ہیں۔

یہ مہینہ، صبر کا مہینہ ہے، قرآن کا مہینہ ہے، جود واحسان کا مہینہ ہے، اطعامِ طعام

کا مہینہ ہے، ہم دردی اور غم خواری کا مہینہ ہے، حسنِ سلوک اور صلۂ رحمی کا مہینہ ہے، یہ مہینہ ایمان واحسان اور اخلاص وللّٰہیت کو جلا بخشتا ہے، روحانی ترقی کا زینہ ہے اور روزے دار مسلمانوں کے لیے سفارشی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ، يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ! إِنِّي مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ، فَيُشَفَّعَانِ».

[رواه البيهقي في شعب الإيمان]

”روزہ اور قرآن، بندے کے لیے سفارش کرتے ہیں، روزہ کہتا ہے: اے پروردگار! میں نے اسے دن میں کھانے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل سے روکے رکھا، لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرمائیں۔ اور قرآن کہتا ہے: میں نے رات میں اس کو سونے سے روکے رکھا، لہٰذا میری سفارش قبول فرمائیں، پھر ان دونوں کی سفارش قبول کی جاتی ہے“۔[البیہقی فی شعب الایمان]

ایسے مبارک مہمان کے استقبال کے لیے اگر ہم پلکیں نہ بچھائیں اور دل کی گہرائیوں سے اظہار مسرت نہ کریں اور شوق وذوق کے ساتھ اس کا انتظار نہ کریں تو کب کریں گے، جس مہمان مکرم کی بھینی بھینی خوش بو اس کی آمد سے پہلے ہی ہر صاحب دل محسوس کرنے لگتا ہے ؎

ابھی تو اس کا کوئی تذکرہ ہوا بھی نہیں
ابھی سے بزم میں خوش بو کا رقص جاری ہے

روزے دار کا خصوصی اکرام

روزے اور روزے دار کے سلسلے میں جو فضائل وارد ہوئے ہیں، جب ایک مسلمان انہیں سنتا ہے یا یاد کرتا ہے تو اس کا شوق مزید بڑھ جاتا ہے۔ روزے دار کو اس کے عمل کا بدلہ خود حق سبحانہ و تعالیٰ براہِ راست عنایت فرمائیں گے، اس لیے کہ اس عمل میں ریا کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، یہ خالص اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے کیوں کہ اگر وہ چاہتا تو تنہائی میں چھپ کر کھا پی سکتا تھا، اسی طرح روزے دار کو دو طرح کی فرحتیں ملتی ہیں: ایک افطار کے وقت دوسرے رب ذوالجلال کی ملاقات کے وقت۔

«كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ، الْحَسَنَةُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِمِائَة ضِعْفٍ، قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِلَّا الصَّوْمَ، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي، لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ، وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ...». [صحيح البخاري]

”ابن آدم کے ہر نیک عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سوائے روزے کے، کیوں کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ عنایت کروں گا۔ وہ اپنی خواہش اور کھانے کو میری وجہ سے چھوڑتا ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک افطار کے وقت، دوسری رب سے ملاقات کے وقت...“۔ [بخاری شریف]

رمضان میں پانچ انعامات کا اعلان

امت محمدیہؐ کے لیے رمضان کے مہینے میں پانچ طرح کے خصوصی انعامات کا

اعلان کیا گیا ہے جو صرف اسی امت کے ساتھ خاص ہیں، پچھلی امتوں میں سے کسی کو ان سے نوازا نہیں گیا تھا، جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

> ”میری امت کو رمضان میں پانچ خصلتیں دی گئی ہیں جو اس سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں: روزے دار کے منہ کی بو، مشک کی خوش بو سے بھی زیادہ عمدہ اور پاکیزہ ہوتی ہے، افطار کے وقت تک فرشتے ان کی بخشش کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، ہر روز اللہ پاک ان کے لیے اپنی جنت کو آراستہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: قریب ہے کہ میرے نیک بندے اپنی مشقتوں اور اذیتوں سے دست بردار ہو کر تیری طرف آجائیں، اس ماہ میں سرکش شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں، لہٰذا رمضان میں ان کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی جہاں تک دوسرے مہینوں میں ہو جاتی ہے۔ اور رمضان کی آخری رات میں ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اس رات سے مراد لیلۃ القدر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، لیکن قاعدہ یہ ہے کہ مزدور جب مزدوری کر لیتا ہے تو اس کو پوری پوری مزدوری دے دی جاتی ہے“۔[مسند احمد]

ایک مسلمان جب ان فضائل اور انعامات کا تصور کرتا ہے جو روزے داروں کے لیے اور ماہ رمضان کے لیے خاص ہیں تو شوق کے نغمے گانے لگتا ہے، خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور پیشگی طور پر اس کی تیاری میں لگ جاتا ہے اور اپنے اوقات کو مرتب کرنے لگتا ہے تاکہ رمضان میں زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کر کے اس کی رحمتوں اور برکتوں سے مالا مال ہو سکے۔

مہمان خصوصی کے لیے مراسم استقبال

جیسا مہمان ہوتا ہے اسی کے شایانِ شان استقبال بھی کیا جاتا ہے، ہر مہمان کے

استقبال کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے، لہٰذا ماہ رمضان المبارک جو رحمتوں، برکتوں کا اور قادر مطلق کی طرف سے جود وسخا اور فیاضیوں کا مہینہ ہے، ایسے مہمان گرامی کے استقبال کے لیے چند امور کا اہتمام ضروری ہے:

(۱) پہلی چیز ہے دعا، بعض اسلاف سے مروی ہے کہ وہ رمضان سے چھ ماہ قبل ہی یہ دعا شروع کر دیتے تھے کہ اللہ انہیں ماہِ مبارک نصیب کرے اور رمضان بعد چھ ماہ تک یہ دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ رمضان کی عبادتیں قبول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ [غافر: ٦٠]

”اور تمہارے پروردگار نے کہا: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا“۔[سورۂ مومن:۶۰]

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ» [الترمذي وأبوداؤد]

”دعاء ہی عبادت ہے“۔[ترمذی وابوداود]

استقبال رمضان کی مناسبت سے تین طرح سے دعائیں کرنی چاہییں:

۱- یہ دعا کرے کہ اللہ پاک اسے رمضان کا بابرکت مہینہ نصیب فرمائیں (اللهُمَّ بَلِّغْنَا رَمْضَانَ)۔

۲- یہ دعا کرے کہ اس ماہ مبارک کی قدر کرنے اور اس میں نیک اعمال کرنے اور اس کے تمام لحات کو اللہ کی یاد میں گزارنے کی توفیق عنایت ہو۔

۳- یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے تقویٰ شعار بندوں میں شامل فرمالیں اور جب

رمضان ختم ہو تو جہنم کی آگ سے خلاصی ہو چکی ہو۔

(۲) پیشگی طور پر اخلاص کے ساتھ یہ نیت کرے کہ رمضان میں اعمال صالحہ کی کثرت کرنی ہے، کیوں کہ اخلاص کے ساتھ نیک عمل کی نیت بھی اجر سے خالی نہیں، اسی وجہ سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنے فرزند عبداللہ سے یہ فرماتے تھے:

«اِنْوِ الْخَيْرَ، فَإِنَّكَ وَإِنْ لَّمْ تَعْمَلْ فَنِيَّةُ الْخَيْرِ لَكَ عَمَلٌ».

”یعنی خیر اور بھلائی کی نیت کرلو، کیوں کہ اگر عمل نہیں بھی کرسکے تو خیر کی نیت بھی تو عمل ہے“۔

البتہ اخلاص اور تصحیح نیت ضروری ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ١٦٢﴾ [الأنعام: ١٦٢]

”آپ کہہ دیجیے کہ بیشک میری نماز، میری عبادت، اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے“۔[سورۂ انعام:۱۶۲]

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى».

[صحيح البخاري]

”اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی نیت کی ہوگی“۔[بخاری شریف]

نیت دو طرح سے کی جاتی ہے: ایک اجمالی اور دوسرے تفصیلی، اجمالی کا مطلب یہ

ہے کہ صرف کثرتِ اعمال کی نیت کی جائے، تفصیلی کا مطلب یہ ہے کہ مختلف قسم کے اعمال کی نیت کی جائے، مثلاً کثرتِ تلاوت، کثرتِ نوافل، صدقات وخیرات، صلۂ رحمی اور جود وسخاوت وغیرہ۔

(۳) رمضان کا مبارک مہینہ اور اس کے حوالے سے قرآن وحدیث میں وارد فضائل کو دھیان میں رکھتے ہوئے، ذہنی، فکری اور نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو عمل صالح کے لیے آمادہ کرے اور یہ نہ بھولے کہ ہر نیک عمل کا نفع اسی کی ذات کو ملے گا، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَٰلِحًا فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۖ﴾

[الجاثية: ١٥]

"جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، وہ اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے، اور جو کوئی برائی کرتا ہے وہ اپنے ہی نقصان کے لیے کرتا ہے"۔ [سورۂ جاثیہ:۱۵]

﴿إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ﴾ [الإسراء: ٧]

"اگر تم اچھے کام کروگے تو اپنے ہی فائدے کے لیے کروگے، اور اگر برے کام کروگے تو وہ بھی تمھارے ہی لیے برا ہوگا"۔ [سورۂ اسراء:۷]

﴿فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ عَمِىَ فَعَلَيْهَا ۚ﴾ [الأنعام: ١٠٤]

"اب جو شخص آنکھیں کھول کر دیکھے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، اور جو شخص اندھا بن جائے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا"۔ [سورۂ انعام:۱۰۴]

ان آیات کی روشنی میں ہر شخص اپنے نفع نقصان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ عزم

کرے کہ رمضان کا کوئی لمحہ بے سود کاموں میں یا لایعنی امور میں ضائع نہ ہو؛ بلکہ نیکیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرلے جو توشۂ آخرت بنے۔

(۴) اس مہمان مکرم کے مراسمِ استقبال میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کی ضیافت سے پہلے تمام گناہوں کو چھوڑ کر صدق دل سے توبہ کرلیا جائے، رب کریم اپنے بندوں کے توبہ واستغفار سے بہت خوش ہوتا ہے، گناہوں میں لت پت بندوں کو بھی نہایت امید افزا اور شیریں انداز میں یوں آواز دیتا ہے:

﴿قُلْ يَـٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾﴾

[الزمر: ۵۳]

”کہہ دو کہ: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر رکھی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، یقین جانو اللہ سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے“۔ [سورۂ زمر: ۵۳]

اسی طرح دوسری آیت میں اللہ نے ہمیں توبہ کرنے کا صریح حکم دیا:

﴿وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾﴾ [النور: ۳۱]

”اور اے ایمان والو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو، تاکہ تم نجات پاؤ“۔

[سورۂ نور: ۳۱]

(۵) نماز باجماعت

ایک نیت یہ بھی کریں کہ فرض نمازیں باجماعت ادا کریں گے، بالخصوص رمضان کے مہینے میں یہ کوشش ہو کہ پانچوں نمازیں ہر روز جماعت کے ساتھ ادا کی جائیں، ان کے لیے اچھی طرح طہارت اور وضو کا اہتمام کیا جائے، وقت سے پہلے اس کی فکر ہو اور تیاری ہو، گویا کہ دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو، نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی جائے، حدیث پاک میں ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَتَعَاهَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ»

[رواه الترمذي]

”جب تم کسی کو مسجد کا پابند دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو“۔[ترمذی شریف]

(۶) کینہ، حسد، عداوت اور قطع رحمی سے باطن کی صفائی

دلوں کی صفائی کر کے باطنی انوار کے ساتھ رمضان کا استقبال کیا جائے تاکہ ”نور علی نور“ کے مصداق بنیں، اس کے لیے اپنے والدین، اعزہ واقارب کے ساتھ حسن سلوک کریں، اگر ممکن ہو تو انہیں ہدایا تحائف کے ذریعہ راضی کریں، اگر خدانخواستہ کوئی کینہ کپٹ ہو، یا کسی معاملے کو لے کر دلوں میں کدورت ہو تو صلح صفائی کر لیں، اگر قطع تعلق ہو یا عداوت ہو تو الفت، محبت سے پیش آکر تعلقات کو استوار کر لیں؛ کیوں کہ جو شخص اپنے پروردگار کا قرب حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگا ہو، اس کے لیے قطعاً زیب نہیں دیتا کہ

اس کے دل میں کینہ، حسد، عداوت اور بغض جیسی بیماریاں باقی رہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَقَاطَعُوا وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ». [رواه الترمذي]

"ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے بے رخی نہ اختیار کرو، آپس میں بغض وعداوت نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد بھی نہ کرو۔ اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ سلام کلام بند رکھے"۔[ترمذی شریف]

جو شخص رمضان کے مقدس مہینے میں اپنی بخشش کا طالب ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ بخششِ حق کے استحقاق کا خود کو اہل بنائے اور جو موانع ہیں ان سے دست بردار ہو جائے، کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور عام معافی کا اعلان ہو رہا ہو تا ہے، اس وقت بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس میں شامل نہیں ہوتے، بلکہ محروم ہو جاتے ہیں، ان میں سے وہ دو شخص ہیں جو دنیاوی امور کی وجہ سے آپس میں سلام کلام بند رکھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«تُفْتَحُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيسِ، فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا إِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَخِيهِ

شَحْنَاءُ، فَيُقَالُ: أَنْظِرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا، أَنْظِرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا، أَنْظِرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا». [رواه مسلم]

”پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو، سوائے اس شخص کے جس کی اپنے بھائی کے ساتھ عداوت ہو، لہٰذا کہا جاتا ہے: ان دونوں کو مہلت دے دو حتی کہ آپس میں صلح کرلیں، ان دونوں کو مہلت دے دو حتی کہ آپس میں صلح کرلیں، ان دونوں کو مہلت دے دو حتی کہ آپس میں صلح کرلیں“۔ [مسلم شریف]

(۷) رمضان کا مہینہ ”شہر القرآن“ ہے، اسی ماہِ مبارک میں قرآنِ پاک نازل ہوا۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ﴾ [البقرة: ١٨٥]

”رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت ہے، اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق وباطل کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کردیتی ہیں“۔ [سورۂ بقرہ:۱۸۵]

لہٰذا کثرتِ تلاوت کے لیے پہلے سے ہی اوقات کی ترتیب بنائیں، کیوں کہ رمضان کے مہینے میں قرآنِ کریم کی تلاوت، اس کے معانی میں تدبّر اہم ترین عبادات میں سے ہے، اسی لیے بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے:

«إذا جاء رمضان فهو تلاوة القرآن وإطعام الطعام»

یعنی جب رمضان آجائے تو (کثرت سے) قرآن کی تلاوت کرنی ہے اور

دوسروں کو کھانا کھلانا ہے۔

بالخصوص روزے دار کو افطار کرانے کا بڑا اجر ہے، حدیث پاک میں ہے کہ:

”جو شخص کسی روزے دار کو افطار کرائے تو اس کے اجر کے بقدر اس کو بھی اجر ملے گا اور روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی بھی نہیں ہوگی“۔ [ابن خزیمہ فی صحیحہ]

(۸) حسنِ استقبال میں یہ بھی شامل ہے کہ ماہِ رمضان شروع ہونے سے قبل ہی اس کے احکام معلوم کریں، روزہ صحیح ہونے کی شرطیں کیا ہیں؟ روزہ کن چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے؟ کن چیزوں سے اس کا ثواب کم ہو جاتا ہے؟ الغرض، فرائض وواجبات، سنن اور مستحبات معلوم کریں، اسی طرح محرمات، مکروہات اور مفسدات ومبطلات بھی معلوم کریں، تاکہ روزے اکمل طریقے سے رکھیں اور اس مبارک مہینے سے کما حقہ استفادہ کر سکیں اور تقویٰ شعار بن کر اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں میں شامل ہو سکیں۔

❊ ❊ ❊

۱۰/رمضان ۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رمضان کے روزے ——— منافع وآداب

اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے یہ ماہ مبارک نصیب کیا، کیوں کہ یہ بڑی سعادت مندی اور خوش بختی ہے کہ رمضان کا مہینہ میسر آجائے اور اس کے روزے رکھنے اور دیگر نیک اعمال کرنے کی توفیق مل جائے، ہمارے کتنے ایسے بھائی تھے جنہوں نے پچھلے سال رمضان کے روزے رکھے تھے؛ لیکن آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اب ان کے اعمال کا سلسلہ بند ہو چکا ہے، لہٰذا آج اگر ہمیں یہ مبارک مہینہ ملا ہے تو بلا شبہ ایک عظیم نعمت ہاتھ آئی ہے جس کی قدردانی کی ضرورت ہے۔

روزے کا اثر انسانی روح اور جسم پر

تزکیۂ نفس، اصلاحِ قلب، تہذیبِ اخلاق اور جسمانی صحت کے لیے روزے سے زیادہ نفع بخش کوئی عبادت نہیں ہے، اسی وجہ سے روزے کے فوائد اور اس کے اثرات میں سب سے اہم چیز جس کو قرآن نے بیان کیا ہے وہ حصولِ تقویٰ ہے، چناں چہ ارشاد ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ ﴾ [البقرة: ١٨٣]

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کردیے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو"۔

[سورۂ بقرہ:۱۸۳]

اور تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم فرمایا ان کو کیا جائے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ان سے بچا جائے، لہٰذا جو شخص تقویٰ اختیار کرلیتا ہے وہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے اور آخرت کی ناکامی اور تباہی سے بچالیتا ہے۔

روزے رکھنے کی وجہ سے جسم سے زہریلے مادے نکلتے ہیں، کولیسٹرول کی مقدار کم ہوتی ہے، اگر زیادہ وزن ہو تو جسم کی چربی پگھلتی ہے اور وزن کم ہوتا ہے، نظامِ ہضم درست ہوتا ہے، اگر بلڈ پریشر کی بیماری ہو تو اس میں بھی تخفیف ہوتی ہے، جسم میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے، ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سارے مثبت اثرات ہیں جو روزے کی وجہ سے انسانی جسم پر اور صحت پر مرتب ہوتے ہیں۔

روزہ اور صبر

روزے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک جامع لفظ "خیر" کے ذریعے اس کے بے شمار فوائد کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَأَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾﴾

[البقرة: ١٨٤]

"اور اگر تم کو سمجھ ہو تو روزے رکھنے میں تمہارے لیے "خیر" ہے یعنی زیادہ بہتری ہے"۔[سورۂ بقرہ:۱۸۴]

ان منافع میں سے ایک نفع صبر کا حصول ہے، کیوں کہ روزہ انسان کو صبر وتحمل کا عادی بناتا ہے، کھانا پینا اور نفسانی خواہشات کو چھوڑکر روزے دار اپنے ایمان کے ساتھ ساتھ صبر کا ثبوت پیش کررہا ہوتا ہے، کیوں کہ صبر کے بغیر صبح سے شام تک روزہ رکھنا ناممکن ہے؛ بلکہ روزہ ایسی عبادت ہے جس میں صبر کی تمام قسمیں جمع ہوجاتی ہیں:

(۱) طاعات پر صبر، اور یہ صیام ہے۔

(۲) معصیت سے صبر، اور یہ روزے کی حالت میں ممنوع چیزوں سے بچنا ہے۔

(۳) مصائب پر صبر، اور یہ بھوک پیاس کی شدت کو برداشت کرنا ہے، گویا کہ روزہ ایک مسلمان کو صبر کی عملی مشق کراتا ہے، تاکہ زندگی کے تمام شعبوں میں صبر وتحمل کا مظاہرہ کرے۔

روزہ اور نفس امّارہ کی ہزیمت

نفس کے اوپر قابو پانے اور اس کو صحیح رخ پر لانے کے لیے روزہ بہترین وسیلہ ہے، کیوں کہ روزے کی حالت میں روزہ دار اپنے نفس کو اس کی تمام خواہشات سے محروم کردیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شرارت انگیزی میں کمی آجاتی ہے؛ لیکن اگر نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوئی کوشش کرتا ہے تو اس کی صدائے ”ہل من مزید“ کبھی ختم نہیں ہوتی۔

بوصیری نے نفس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا:

والنَّفْسُ كَالطِفْلِ إنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلَى
حُبِّ الرَّضَاعِ وَإِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

یعنی نفس دراصل دودھ پیتے بچے کی طرح ہے جسے اگر چھوڑدو اور منع نہ کرو تو بڑے

ہوکر بھی اس کی عادت ختم نہیں ہوگی، البتہ اگر کوشش کر کے دودھ چھڑا دو تو چھوڑ دے گا۔

بالکل اسی طرح اگر نفس کو اس کی بری عادتوں سے نہ روکا جائے اور اس کی پیروی کی جائے، اس کے تقاضے پورے کیے جائیں تو کبھی بھی باز نہیں آئے گا، لیکن اگر مجاہدہ کر کے اس کے غلط تقاضوں کو دبایا جائے تو آہستہ آہستہ اس کی سرکشی اور سرتابی کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہوجاتا ہے۔ روزے دار حالت صیام میں اپنے نفس کی زمام کو اپنے قابو میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مقابلے میں اس کو مغلوب کر دیتا ہے۔

اسی طرح روزے کی وجہ سے شیطان کا حملہ بھی کم ہوجاتا ہے، شیطان دراصل انسان کے جسم میں اس طرح دوڑتا ہے جس طرح خون دوڑتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے نفس کے مطالبات پورے کرتا ہے تو حقیقت میں وہ شیطان کی مدد کر رہا ہوتا ہے، وہ انسان کو ورغلانے، بھٹکانے اور ظلم وزیادتی پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، لیکن روزہ اس دروازے کو سرے سے بند کر دیتا ہے، کیوں کہ روزہ رکھ کر انسان اپنے نفس کے مطالبات کو مسترد کر کے اس کے اندر ملکوتی صفات پیدا کر رہا ہوتا ہے اور شیطان کو ناکام بنا رہا ہوتا ہے، یہ فائدہ تو مطلقا روزے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، لیکن رمضان کے مبارک مہینے میں سرکش شیاطین ویسے ہی قید کر دیے جاتے ہیں۔

روزہ اور نعمتوں کی قدر دانی

روزے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ روزہ دار اپنے رب کی نعمتوں کی معرفت حاصل کرتا ہے، پھر ان کی قدر کرتا ہے، جب بھوک اور پیاس کی شدت محسوس کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اشیائے خورد ونوش کا مہیا ہونا کتنا بڑا انعام الٰہی ہے، وہ اپنے ان بھائیوں کو بھی یاد کرتا ہے

جو بے گھر ہیں، بے یار و مددگار ہیں، زمانے کے ستم رسیدہ یا بے روزگار ہیں یا فاقے کا شکار ہیں۔ اسی طرح اس کا ذہن تاریخ کا سفر کرتے ہوئے سلف صالحین اور مجاہدین کی قربانیوں اور ان کی فاقہ مستیوں کا تصور کرنے لگتا ہے جو انھیں دین حنیف کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں پیش آئیں، بالخصوص سید الاولین والآخرین سرورِ عالم ﷺ کے مجاہدات کو یاد کرتا ہے جنھوں نے امانتِ رسالت کی ادائیگی اور دعوتِ حق کی تبلیغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، بلکہ پورا پورا حق ادا کیا، حالاں کہ گھر کا حال یہ تھا کہ کئی کئی روز تک بھوک کی حالت میں گزر جاتے تھے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک روز حضرت فاطمہؓ حضورؐ کی خدمت میں ایک روٹی کا ٹکڑا لے کر حاضر ہوئیں اور آپؐ کو پیش کیا، آپؐ نے دریافت فرمایا: فاطمہ! یہ کیسی روٹی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے ایک چھوٹی سی روٹی پکائی تھی، لیکن میرا دل نہ مانا کہ آپ کی خدمت میں پیش کیے بغیر کھالوں، پھر آپؐ نے فرمایا: ”تین روز کے بعد یہ پہلا کھانا ہے جو تیرے والد کو میسر ہوا ہے“۔ [مسند احمد]

جب ایک مسلمان روزہ رکھتا ہے تو بھوک پیاس کو اللہ کی رضا کے لیے برداشت کرتا ہے، نیز اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلاف نے اس سے زیادہ کئی کئی روز تک بھوک برداشت کر کے راہِ خدا میں جہاد کیا، دین کی تبلیغ کی، علم دین حاصل کیا اور دوسروں تک پہنچایا، پھر دل کی گہرائیوں سے اللہ کی نعمتوں پر اظہارِ تشکّر کرتا ہے۔

روزہ اور صدقات و خیرات

روزے دار کو روزے کی حالت میں یقیناً اپنے ان بھائیوں کا خیال بھی آئے گا جو محتاج ہیں، ضرورت مند ہیں، عافیت کے ساتھ دو وقت کی روٹی انہیں میسر نہیں ہوتی، کیوں

کہ روزہ اسے ہم دردی اور غم خواری سکھاتا ہے، اسے یاد دلاتا ہے کہ فقیر و مسکین شخص اسی طرح ہمیشہ بھوک برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہے، چناں چہ احسان، ہم دردی اور سخاوت کے جذبات اس کے دل میں بیدار ہوتے ہیں، پھر اپنے ضرورت مند بھائیوں، بہنوں اور ہم سایوں کے تعاون کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، صدقات، خیرات اور ہدایا و تحائف کے ذریعہ ان کی نگہ داشت کرنے لگتا ہے۔

ویسے بھی رمضان کا مہینہ خیر و برکت کا مہینہ ہے، زمانے کی فضیلت کی وجہ سے اس میں کیے جانے والے اعمال کی فضیلت بھی بڑھ جاتی ہے، اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت بھی رمضان میں بڑھ جاتی تھی، بالخصوص جب حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآنِ کریم سنتے سناتے تھے اس وقت آپ کی سخاوت کی انتہا نہ رہتی، بے تحاشا، بے حد و حساب جو کچھ ہوتا تھا وہ دوسروں کو عنایت فرماتے تھے، بخشش و عطا کا دریا بہنے لگتا تھا، بلکہ جود و سخاوت کی آندھی چلنے لگتی تھی، اور کیوں نہ ہوتا، آپؐ سے زیادہ اللہ تعالی کے اس ارشاد پر کسے یقین ہوگا۔

﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلرَّٰزِقِينَ ۝٣٩﴾

[سبأ: ۳۹]

”اور جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو، اس کی جگہ وہ تم کو اور دیتا ہے، اور وہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے“۔ [سورۂ سبا:۳۹]

روزہ اور تواضع وانکساری

روزے کی وجہ سے مسلمان کے اندر متعدّد قسم کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، وہ

کیفیات، نفس کُشی اور مجاہدے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں، انہی کیفیات میں سے تواضع اور خاک ساری بھی ہے، کیوں کہ روزہ دار جب دیکھتا ہے کہ سارے مسلمان اس مبارک عمل میں شریک ہیں؛ بادشاہ ہو یا رعایا، حاکم ہو یا محکوم، مال دار ہو یا فقیر، صاحب جاہ و منصب ہو یا معمولی آدمی، ہر شخص روزہ رکھ رہا ہے، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ہم سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں، البتہ اگر کسی کو برتری حاصل ہے تو وہ صرف تقوے کی بنیاد پر ہے۔

روزہ حقیقت میں انسانی نفوس کی تربیت کرتا ہے، یہ مستقل تربیت گاہ ہے، نفس کی تمام برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے، منجملہ ان برائیوں کے کبر و غرور بھی ہے، جس سے انسانی نفس کی تطہیر ہوتی ہے، انانیت ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ تواضع آتی ہے۔

روزہ اور وحدتِ امت

پوری دنیا کے سارے مسلمان ماہ رمضان کے روزے ایک ہی ساتھ رکھتے ہیں، اگر کچھ فرق ہوتا ہے تو وہ ایک دو روز کا یا دن رات کی توقیت کا، لیکن مہینہ ایک ہی ہوتا ہے، یہ اشتراک فی العمل یعنی عبادت میں ایک ساتھ سب کی مشارکت، وحدتِ قلوب کا بھی ذریعہ ہے، دنیا کے چپے چپے میں بسنے والے مسلمان اسی ماہِ مبارک میں دن کے روزے رکھتے ہیں اور رات میں تراویح اور تلاوت و تہجد کا اہتمام کرتے ہیں، سحر کے وقت سارے سحری کھاتے ہیں اور افطار کے وقت مل کر افطار کرتے ہیں، سب کا مقصد بھی ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی خوش نودی کی طلب، لہٰذا پوری امت اسلامیہ کا ایک ہی عمل کو ایک ہی مقصد کے لیے انجام دینا، دلوں میں الفت و محبت اور اخوّت کے

جذبات پیدا کرنے کے لیے کافی ہے، بشرطے کہ امت اپنے مقصد کو پہچانے، اپنے مرتبے ومقام کو جانے اور وحدت ویکجہتی کی طاقت کو سمجھے۔

روزہ اور طاعات کی رغبت

روزے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دیگر نیک اعمال کی رغبت پیدا ہوتی ہے، دوسرے احکام پہ عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ دار خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، فرائض کے ساتھ ساتھ نفلی عبادتوں کا بھی عادی بن جاتا ہے، گناہوں سے تائب ہوجاتا ہے؛ بلکہ گناہوں سے نفرت کرنے لگتا ہے، پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے تاکہ کسی معصیت میں نہ مبتلا ہوجائے، یہ سب روزے کے فوائد میں سے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾﴾

[البقرة: ١٨٤]

”اور اگر تم کو سمجھ ہو تو روزہ رکھنا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے“۔[سورۂ بقرہ:۱۸۴]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الصِّيَامُ جُنَّةٌ يَسْتَجِنُّ بِهَا الْعَبْدُ مِنَ النَّارِ» [مسند أحمد]

”روزہ ڈھال ہے جس کے ذریعے بندہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاتا ہے“۔[مسند احمد]

روزہ اور جسمانی صحت

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا روزہ جس طرح روحانی صحت کے لیے مفید ہے، اسی طرح

جسمانی صحت کے لیے بھی نفع بخش ہے، روزہ، نظامِ ہضم کو راحت پہنچاتا ہے، اس کو مرتب کرتا ہے، ہاضمے کو صاف کرکے اسے تازہ دم کردیتا ہے۔ روزے کی وجہ سے جسم کا دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے، یعنی قوتِ مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے، جب دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے تو دوسرے بہت سارے امراض سے حفاظت ہوجاتی ہے۔ روزہ بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے، جسم میں اگر زائد چربی ہو تو اس میں کمی اور تخفیف کا ذریعہ بنتا ہے، اسی طرح جسم سے فاسد مادوں کو اور سموم کو خارج کرتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ بہت سارے منافع ہیں جو روزے کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں، تاہم سب سے اہم اور سب سے اعلیٰ نفع وہی ہے جسے حق تعالیٰ شانہ نے خود بیان فرمایا ہے، یعنی تقوے کا حصول، بلکہ یہی مقصودِ اصلی ہے، دوسرے منافع ضمنی طور پر حاصل ہوتے ہیں، لیکن اصل مقصود تقویٰ شعاری، پرہیز گاری اور قربِ الٰہی کا حصول ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ ﴾ [البقرة: ١٨٣]

”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کردیے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو“۔

[سورۂ بقرہ: ۱۸۳]

روزے کے آداب

وہی روزہ اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے جس کے آداب کی رعایت کی گئی ہو، جس روزے کی ادائیگی میں تمام اعضائے جسم کی حفاظت کی گئی ہو، جس طرح معدے اور شرم گاہ کی

حفاظت کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی بھی حفاظت کی جائے ہر طرح کی فحش گوئی سے، دروغ گوئی اور سب وشتم سے اور لایعنی باتوں سے، اسی طرح غیبت سے اور تہمت وغیرہ سے بھی، نیز اپنے کان کی حفاظت کی جائے ناجائز چیزوں کے سننے سے، گانے اور آلاتِ موسیقی وغیرہ سے بھی مکمل پرہیز کرے۔ اگرچہ یہ چیزیں ہر حال میں ناجائز ہیں، لیکن روزے کی حالت میں ان کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَمْ يَدَعِ قَوْلَ الزُّورَ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لله حَاجَةٌ بِأَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». [رواه الترمذي]

”جو شخص (روزے دار) جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے، تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“۔[ترمذی شریف]

بلکہ روزے دار کو چاہیے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ ناروا سلوک کرے، یا گالی گلوچ کرے یا لڑائی کرے تو بہ جائے اس کے ساتھ ٹکرانے کے یہ کہے کہ میرا روزہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ، وَلَا يَصْخَبْ، فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ: إِنِّي امْرُؤٌ صَائِمٌ».

[صحيح البخاري]

”اگر تم میں سے کوئی روزے سے ہو تو اسے بدزبانی نہیں کرنی چاہیے، نہ ہی شور شرابا کرنا چاہیے، اگر کوئی شخص اسے گالی دے یا اس سے جھگڑنا چاہے تو اسے کہنا چاہیے کہ: میں روزے سے ہوں“۔[بخاری شریف]

روزے کی حالت میں اگر اس کے آداب کی رعایت نہ کی جائے تو نہ ہی اس کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں نہ ہی اجر و ثواب ملتا ہے، بلکہ روزے دار کو بھوکا پیاسا رہنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ارشاد نبوی ہے:

«رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ». [أحمد ونسائي]

”بعض روزے دار ایسے ہیں کہ انھیں بھوک کے سوا کچھ نہیں ملتا“۔ [احمد و نسائی]

لیکن اگر آداب کی رعایت کی جائے تو یہ روزہ انسان کو روحانیت اور تقوے کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

سحر میں تاخیر اور افطار میں جلدی

روزے کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ جب تک صبح صادق کے طلوع ہونے کا یقین نہ ہو اس سے پہلے تک سحر کھائے، لیکن صبح صادق سے پہلے فارغ ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَكُلُواْ وَٱشْرَبُواْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّواْ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيْلِ﴾ [البقرة: ١٨٧]

”اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح نہ ہو جائے۔ اس کے بعد رات آنے تک روزے پورے کرو“۔

[سورۂ بقرہ: ۱۸۷]

سحر ضرور کھائیں، کیوں کہ سحور میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے، البتہ یہ خیال رہے کہ مقدار میں اعتدال ہو، اتنی زیادہ مقدار میں نہ کھائے کہ عبادت میں سستی ہونے لگے اور دن

بھر کھٹی ڈکاریں آتی رہیں، پھر روزے کا لطف ہی ختم ہوجائے گا۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

«مَا مَلَأَ ابْنُ آدَمَ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنِهِ» [ترمذي]

''کسی آدمی نے کوئی برتن پیٹ سے زیادہ برا نہیں بھرا''۔ [ترمذی شریف]

آدابِ صیام میں یہ بھی ہے کہ جب سورج غروب ہونے کا یقینی علم ہوجائے تو فوراً اِفطار کرے، اس کے بعد تاخیر کرنا ''غلو'' کہلائے گا، اسی لیے حضورؐ نے فرمایا:

«لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ» [رواه البخاري]

''لوگ اس وقت تک خیر و بھلائی میں رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کریں گے''۔ [بخاری شریف]

اتباعِ سنت اسی میں ہے کہ وقت ہوجائے تو افطار میں دیر نہ کی جائے، حضورؐ کا معمول بھی ایسا ہی تھا کہ افطار میں دیر نہیں فرماتے تھے اور صحابۂ کرامؓ کا معمول بھی یہی تھا۔

مبارک راتیں

رمضان کی راتوں کا کیا کہنا، یہ وہ مبارک راتیں ہیں جن کی قدر وہی لوگ کرتے ہیں جو باتوفیق ہوتے ہیں، ورنہ بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی دیکھے گئے ہیں جو دن میں روزہ رکھ کر رات میں اتنی کثیر مقدار میں کھالیتے ہیں کہ رات کی عبادت اور شب گزاری ان کے لیے مشکل ہوجاتی ہے، لیکن قدر دانوں کو دیکھا گیا کہ پوری رات یا رات کا اکثر حصہ نماز، تلاوت اور ذکر اذکار میں گزار دیتے ہیں، بالخصوص تراویح کی نماز نہایت بشاشت اور شوق وذوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں، کیوں کہ یہ نماز رسول اکرم ﷺ کو بھی محبوب تھی، اسی لیے آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ یہ نماز چند راتوں میں ادا فرمائی، لیکن ان کے شوق واہتمام کی و

جہ سے آپؐ کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہ نماز واجب نہ ہو جائے، اس لیے آپؐ نے اس پر مداومت نہیں فرمائی، لیکن آپؐ کی وفات کے بعد جب یہ اندیشہ ختم ہو گیا تو حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس نماز تراویح کا باجماعت احیاء کیا گیا اور بقول علامہ ابن تیمیہؒ کے بیس رکعت تراویح کی نماز پر صحابۂ کرام کا اجماع ہو گیا، لہٰذا تراویح کا اہتمام کرنا چاہیے، اسی طرح تہجد کا بھی اہتمام کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». [متفق عليه]

”جو شخص رمضان میں قیام اللیل ایمان اور امید اجر کے ساتھ کرے تو اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں“۔[متفق علیہ]

خصوصیت کے ساتھ آخری عشرے کی راتوں میں عبادات کا اہتمام کیا جائے، ان راتوں میں بھی طاق راتوں کا خاص خیال رکھا جائے، اور ستائیسویں شب کو تو قطعاً غفلت میں نہ گزاریں، کیوں کہ شب قدر کی تعیین اگرچہ اٹھ چکی ہے، تاہم روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے، بالخصوص اس کی طاق راتوں میں اور بالاخص ستائیسویں رات میں۔ اس رات کی فضیلت میں پوری سورۃ القدر اللہ نے نازل فرمائی ہے، وہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے، جسے وہ رات نصیب ہوگئی وہ خوش نصیب ہے۔

* * *

۲۰/رجب ۱۴۲۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِسراء اور معراج کی حقیقت

ایک عجیب سوال

مجھ سے ایک عجیب سوال کیا گیا، ایک صاحب نے کہا: ہم نے رجب کی ۲۷ویں تاریخ شادی کے لیے طے کی ہے، تو اس دن شادی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ میں نے ان سے حیرت کے ساتھ پوچھا: آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ ہم سے کسی نے کہا کہ آپ نے ۲۷ویں تاریخ کیوں طے کی ہے، حالاں کہ اس مبارک تاریخ میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج نصیب ہوئی تھی، لہٰذا اس رات میں قیام کرنا ہے اور دن کو روزہ رکھنا ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسراء اور معراج کے سن، ماہ اور رات کی تعیین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، یعنی یقین کے ساتھ رجب کی ستائیسویں شب کی تعیین نہیں ہے، اسی طرح کس سال ہوئی تھی اس میں بھی اختلاف ہے؛ لیکن اگر ہم فرض کرلیں کہ ۲۷ رجب کو ہوئی تھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالی کا ہمارے نبیؐ کے اوپر بڑا انعام تھا، لیکن اس رات کو خصوصیت کے ساتھ قیام اللیل اور دن کو روزہ رکھنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، نہ تو رسول اکرم ﷺ

نے یہ عمل کیا نہ ہی صحابۂ کرامؓ نے کیا۔ اگر کوئی مخصوص عبادت مشروع ہوتی تو اس کا ثبوت ضرور ملتا، لہٰذا اسراء اور معراج کی وجہ سے، اپنی طرف سے کسی خاص عمل کا اہتمام کرنا بدعت ہوگا، اسی طرح اس تاریخ میں شادی وغیرہ کرنے کو منع کرنا دین میں مداخلت ہے جو ایک سنگین جرم ہے۔

اسراء اور معراج دو چیزیں ہیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی شب میں دو بڑی نعمتوں سے نوازا، ایک کا نام ہے "اسراء" دوسری کا نام ہے "معراج"۔

اسراء اس سفر کا نام ہے جو آپؐ نے ایک زمین مقدس سے دوسری زمین مقدس تک طے فرمایا یعنی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، اس زمینی سفر کو اسراء کہا گیا ہے، اس کا ثبوت قرآنِ کریم کی صریح آیت سے ہے، بلکہ اسی کی مناسبت سے قرآن کی ایک سورت کا نام ہی "اِسراء" رکھا گیا ہے (اس کا دوسرا نام سورۂ بنی اسرائیل ہے)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿سُبْحَٰنَ ٱلَّذِىٓ أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ إِلَى ٱلْمَسْجِدِ ٱلْأَقْصَا ٱلَّذِى بَٰرَكْنَا حَوْلَهُۥ لِنُرِيَهُۥ مِنْ ءَايَٰتِنَآ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ۝١﴾ [الإسراء: ١]

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے"۔

[سورۂ بنی اسرائیل:۱]

سورۃ النجم کی آیات میں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

حضور ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے، ایک مرتبہ زمین پر، مقامِ بطحاء میں، جس کی طرف یہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے:

﴿وَلَقَدْ رَءَاهُ بِٱلْأُفُقِ ٱلْمُبِينِ ﴿٢٣﴾﴾ [التكوير: ٢٣]

"اور یہ بات بالکل سچی ہے کہ انہوں نے اس فرشتے کو کھلے ہوئے افق پر دیکھا ہے"۔[سورۂ تکویر:۲۳]

جب کہ دوسری بار آپ نے ان کو ان کی اصلی ہیئت میں "سدرۃ المنتہی" کے قریب دیکھا یعنی معراج کی رات میں۔

معراج وہ سفر ہے جس کی ابتداء زمین سے ہوئی اور انتہا آسمان پہ ہوئی، عروج کے معنی ہیں اوپر کی طرف چڑھنا اور جانا، چناں چہ مسجد اقصیٰ سے آپ کا سفر آخری آسمان تک ہوا، اسے معراج کہتے ہیں، مسجد اقصیٰ میں کبارِ انبیاء علیہم السلام آپ کے انتظار میں تھے، انھوں نے آپؐ کا استقبال کیا اور آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو مختلف آسمانوں پر بھیج دیا جنہوں نے سید الاولین والآخرین ﷺ کا استقبال کیا، پھر حضرت جبریل علیہ السلام آپ کو لے کر ساتویں آسمان کے اوپر پہنچے اور ربّ ذوالجلال کی بارگاہ تک راہنمائی کرکے پیچھے ہٹ گئے۔

راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو اِسراء کہا گیا ہے، جب کہ مسجد اقصیٰ سے عرش معلّیٰ تک کے سفر کو معراج کہا گیا ہے، پہلے سفر کا ثبوت صریح قرآنی آیت سے ہے، جب کہ دوسرے سفر کا ثبوت قرآنی اشارات اور احادیثِ صریحہ سے ہے۔

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی

رسول اکرم ﷺ نے نبوت ورسالت کے عظیم مرتبے سے شرف یاب ہونے کے بعد دعوت وتبلیغ کا کام شروع فرمایا تو آپؐ کی قوم نے نہ صرف یہ کہ آپ کی دعوت کو ٹھکرادیا، بلکہ نہایت بدسلوکی سے پیش آئے، چند خوش نصیب حضرات نے آپ کی دعوت پہ لبیک کہا، لیکن قریش نے ان کی زندگی بھی اجیرن بنا کے رکھ دی، کسی نہ کسی درجے میں آپ کی خاندانی شرافت نے انھیں ذلیل ترین حرکتوں سے باز رکھا، مزید یہ کہ آپ کے چچا ابوطالب کی حمایت کی وجہ سے بھی لوگ بدتمیزی کرنے سے جھجھک محسوس کرتے تھے؛ لیکن جب آپؐ کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا، تو قریش کی جرأت بڑھ گئی، اس کے بعد آپؐ کی زوجۂ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کا بھی وصال ہوگیا جو آپ کو تسلی دیتیں اور غم خواری اور دل داری کرتی تھیں، چناں چہ آپ کے اوپر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، یہاں تک کہ اس سال کا نام ”عام الحزن“ یعنی غم کا سال رکھ دیا گیا۔ یہ اور دیگر اسباب کی وجہ سے حضور ﷺ بہت دل شکستہ ہوگئے تھے، بہت غم زدہ رہنے لگے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تکریم کے لیے اوران اذیتوں پر صبر کی وجہ سے انعام سے نوازنے کے لیے یہ مبارک سفر کرایا، یہاں تک کہ عرش معلیٰ پر بلایا اور ہم کلامی سے شرف یاب فرمایا۔

طائف کا دعوتی سفر اور اہل طائف کی سنگ دلی

اپنی قوم کے ظلم وستم سے تنگ آکر حضور ﷺ نے طائف کا ارادہ فرمایا، کہ شاید وہاں کے لوگ آپؐ کی دعوت پر لبیک کہیں، چناں چہ آپ اپنے غلام زید بن حارثہ کے

ساتھ طائف تشریف لے گئے، جہاں بنوثقیف کا قبیلہ آباد تھا، لیکن وہاں آپؐ کے ساتھ ایسی بدسلوکی کی گئی جو قریش کی بدسلوکی سے زیادہ گھناؤنی تھی، آپؐ نے جب ان کے سامنے اپنی نبوت ورسالت اور اللہ کی وحدانیت کی بات کی تو ایک شخص نے کہا: کیا پورے جزیرۃ العرب میں اللہ کو تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ملا جسے نبی اور رسول بناتا؟ — دوسرے شخص نے کہا: اگر تم سچے ہو تو تمہارا مرتبہ یقیناً اتنا بلند ہے کہ میں بات کرنے کے قابل نہیں، لیکن اگر تم جھوٹے ہو تو تم اس قابل نہیں کہ میں تم سے بات کروں، یعنی ان سنگ دل لوگوں نے صرف گفتگو کرنے سے بھی آپ کو محروم رکھا۔

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان ظالموں نے احمقوں، غلاموں اور بچوں کو آپؐ کے پیچھے لگادیا جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکنا شروع کردیا، اتنا پتھر مارا کہ آپ "لہولہان" ہوگئے، مجبوراً آپؐ واپس ہوگئے، لیکن اپنی بے بسی اور قوم کی سنگ دلی اور بدمعاملگی کا شکوہ اپنے رب سے کیا، دعا کے ایسے کلمات کہے جن کا ایک ایک لفظ معنی خیز ہے، اپنے رب کی بارگاہ میں شکستہ خاطر ہوکر اس طرح اپنی فریاد پیش کی:

«اللَّهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي، وَقِلَّةَ حِيلَتِي، وَهَوَانِي عَلَى النَّاسِ، أَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ، وَأَنْتَ رَبِّي، إِلَى مَنْ تَكِلُنِي؟ إِلَى بَعِيدٍ يتجَهَّمني؟ أَمْ إِلَى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ أَمْرِي؟ إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عليَّ غَضَبٌ فَلَا أُبَالِي، غَيْر أَنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ أَوْسَعُ لِي، أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظلماتُ، وَصَلُحَ عَلَيْهِ أمرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، مِنْ أَنْ تُنزل بِي غَضَبَكَ، أَوْ يَحِلَّ عليَّ سُخْطُك، لَكَ العُتْبَى حَتَّى ترضَى، وَلَا حولَ وَلَا قوةَ

إِلَّا بِكَ». [رواه الطبراني والخطيب البغدادي وسيرة ابن هشام]

"اے اللہ! میں تجھ سے اپنی کمزوری، بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے وقعتی کی شکایت کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے، اور تو ہی میرا رب ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ کسی اجنبی کے حوالے جو میرے ساتھ ترش روئی سے پیش آتا ہے، یا کسی ایسے دشمن کے حوالے کرتا ہے جسے تو نے میرے معاملے کا مالک بنادیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے (کسی اذیت کی) کوئی پرواہ نہیں، لیکن پھر بھی تیری عافیت میرے لیے زیادہ دل کشا ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہوئیں اور جس سے دنیا اور آخرت کا معاملہ درست ہوا کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تو مجھ پر اپنی ناراضگی اتارے۔ تجھے میں اس وقت تک راضی کرتا رہوں گا جب تک کہ تو راضی نہ ہوجائے۔ تیری ذات پاک کے بغیر نہ طاقت ہے نہ قوت"۔ [طبرانی، سیرت ابن ہشام، خطیب بغدادی]

آپؐ کو لوگوں کی ناراضگی یا ان کی بدسلوکی کی کوئی پرواہ نہیں، اگر فکر ہے تو صرف اس کی کہ اللہ راضی رہے، پھر بھی آپ اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ آپؐ کی اس دعا کے بعد جلالِ الٰہی جوش میں آیا، فرشتوں کو حکم دیا گیا، وہ حضورؐ کی خدمت میں آکر آپؐ کے اشارے کا انتظار کررہے ہیں، اگر آپ چاہیں تو دونوں طرف سے پہاڑوں کو ملاکر ان بدبختوں کو ہلاک کردیا جائے، یا زمین میں انھیں دھنسا دیا جائے، لیکن قربان جائیں رحمتِ عالم کی شانِ رحیمی پہ، فرماتے ہیں:

"بلکہ مجھے امید ہے کہ ان کی پشت سے ایسی قوم نمودار ہوگی جو صرف اللہ وحدہ لاشریک کہ عبادت کرے گی"۔ [صحیح البخاری]

لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت دیکھیے کہ اس نے آپ کا یہ سفر ضائع ہونے نہیں دیا، چناں چہ، جب آپ مکہ مکرمہ واپس ہو رہے تھے، تو تکان کی وجہ سے ایک باغ میں بیٹھ گئے، باغ کے مالک نے آپ کو دیکھا تو اپنے نصرانی غلام کے ذریعہ انگور کا ایک خوشہ آپ کے پاس بھیجا، آپؐ نے انگور لیا اور بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کیا، یہ سن کر اس غلام کو تعجب ہوا اور اس نے کہا: اس ملک کے لوگ تو یہ بسم اللہ نہیں کہتے؟ آپؐ نے اس سے فرمایا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: نینوی کا رہنے والا ہوں، آپ نے فرمایا: مردِ صالح: یونس بن متّی کے شہر کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: آپ کو ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ آپؐ نے فرمایا: وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔ پھر حضورؐ نے اس کے سامنے قرآنِ پاک کی تلاوت فرمائی اور اسلام پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔

اس سفر کا پہلا ثمرہ اس غلام کے اسلام میں داخل ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسی سفر کی واپسی میں اللہ تعالیٰ نے جنات کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں بھیجی، جنھوں نے آپ سے قرآن کی تلاوت سنی اور اسلام لائے۔

﴿وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ ٱلْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ ٱلْقُرْءَانَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓا۟ أَنصِتُوا۟ ۖ فَلَمَّا قُضِىَ وَلَّوْا۟ إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ﴿٢٩﴾﴾

[الأحقاف: ۲۹]

”اور (اے پیغمبر) یاد کرو جب ہم نے جنات میں سے ایک گروہ کو تمہاری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، چناں چہ جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ: خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس انہیں خبردار کرتے ہوئے واپس پہنچے“۔ [سورۂ احقاف:۲۹]

اکرامِ مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اسراء اور معراج کے ذریعہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس عظیم نعمت سے آپ کو سرفراز فرمایا جسے ہم اسراء اور معراج کہتے ہیں؛ آپؐ حطیمِ کعبہ میں سوئے ہوئے تھے کہ فرشتہ آیا، اس نے آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا، پھر قلبِ مبارک کو نکال کر آبِ زمزم سے دھوکر اسے ایمان وحکمت سے پُر کیا، اس کے بعد ایک سفید سواری کا جانور لایا جس کا قد خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا، جسے بُراق کہا جاتا ہے، اس پر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ سوار ہوئے، یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچے، وہاں اتر کر آپؐ نے دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی نماز کی امامت فرمائی، جب نماز سے فارغ ہوگئے تو حضرت جبریل علیہ السلام کی معیت میں آسمان کی طرف پرواز کی، جب آسمان پر پہنچے تو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے آپ کا استقبال کیا اور آپ کو خوش آمدید کہا— سفر کے دوران اللہ تعالیٰ نے مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرایا، بندوں کے گناہوں پر مرتب ہونے والی سزائیں دیکھائیں، الگ الگ گناہوں کے مختلف قسم کے دردناک اور الم ناک عذاب ہوتے ہوئے دیکھے؛ آپؐ نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے ہیں، تو حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوکر سوال کیا: جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ جواب دیا: یہ آپ کی امت کے وہ خطبا اور مقررین ہیں جو لوگوں کو بھلائی اور خیر ونیکی کا حکم کرتے تھے اور خود کو فراموش کرتے تھے، حالاں کہ وہ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے تھے —غیبت کرنے والوں کی سزا یہ دیکھی کہ وہ اپنے جبڑوں کو تانبے کے ناخنوں سے نوچ رہے ہیں، پھر دوبارہ چہرہ اپنی پہلی شکل میں واپس آجاتا ہے، پھر وہ نوچ رہے ہیں اور یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ یہ اور اس طرح

کے اور بھی مناظر آپؐ نے راستے میں دیکھے — آخر میں آپؐ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے، اس پر حسن وجمال اور رعنائی کی ایسی نورانیت چھاگئی کہ کسی بھی قادر الکلام کے لیے اس کا وصف بیان کرنا محال ہے۔ اس کے بعد رب ذوالجلال والاکرام کے ساتھ ہم کلامی ہوئی، اللہ پاک نے نمازیں فرض فرمائیں، پہلے پچاس نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض فرمائیں، لیکن حضورؐ اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے اپنے رب سے بار بار تخفیف کی درخواست کرتے رہے، حتیٰ کہ پانچ نمازیں رہ گئیں، آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ، هِيَ فِي الْعَمَلِ خَمْسٌ، وَفِي الْأَجْرِ خَمْسُوْنَ».

"میرے یہاں بات بدلتی نہیں، یہ نمازیں عمل میں تو پانچ ہیں، لیکن اجر میں پچاس ہیں"۔ یعنی پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر ہے۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

محققین اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو معراج روحانی اور جسمانی دونوں ایک ساتھ حاصل ہوئی، یہی وجہ ہے کہ قریش مکہ نے اس کا مذاق اڑایا تھا اور قسم قسم کا طنز کیا تھا، اگر صرف روحانی معراج ہوتی تو اس میں نہ کوئی حیرت تھی نہ اس پر کسی مسخرے کا امکان تھا۔ جو لوگ جسمانی معراج کو مُستَبعَد سمجھتے ہیں وہ گویا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں، جس قادر مطلق نے اپنے بعض بندوں کو اتنا علم دیا کہ وہ مہینوں کی مسافت گھنٹوں اور منٹوں میں طے کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ چاند تک پہنچ جاتے ہیں، کیا وہ خدائے ذوالجلال اس پر قادر نہیں ہے کہ راتوں رات اپنے محبوب کو اپنے پاس

بلائے اور ہم کلامی سے مشرّف کرنے کے بعد پھر ان کی قیام گاہ پہ واپس پہنچادے؟ یقیناوہ ہر چیز پہ قادر ہے، زمین وآسمان میں کوئی چیز اسے عاجز نہیں کرسکتی۔

قصۂ اسراء و معراج کے دروس ونتائج

اسراء اور معراج کے عظیم ترین واقعے سے بہت سارے دروس اور راہ نما خطوط ملتے ہیں، ان میں سے ایک درس ہمیں یہ ملتا ہے کہ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیان مضبوط رابطہ ہے، اس رابطے کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل (سورۂ اسراء) کی پہلی آیت میں واضح طور پر ذکر فرمایا ہے، اس رابطے کو بیان کرکے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں مقدس مقامات میں سے کسی بھی مقام کی تعظیم و تکریم اور اس کے تحفظ کے سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

مسجد اقصیٰ جس کے اندر اور جس کے اردگرد برکتوں کا نزول ہوا ہے، اس کی اہمیت اور عظمت ذہن سے نہ نکلے، اس کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی لاپرواہی نہ کی جائے — اس مسجد کی اہمیت حضورؐ نے اپنی اس مبارک حدیث میں بھی بیان فرمائی ہے جس میں مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کو باہم مربوط کرتے ہوئے ان تینوں کی فضیلت ایک ساتھ یوں بیان فرمائی ہے۔

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي، وَمَسْجِدِ الْأَقْصَى». [صحيح البخاري]

”تین مساجد کے علاوہ کسی (مسجد) کے لیے کجاوے نہ باندھے جائیں (یعنی رخت سفر باندھ کر سفر نہ کیا جائے): مسجد حرام، میری مسجد اور مسجد اقصیٰ“۔[بخاری شریف]

لہٰذا تمام مسلمانوں کی یہ ذمے داری ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقام و مرتبے کو پہچانیں، اور اس کی اہمیت کو سمجھیں اور دشمنانِ اسلام، غدّار و خیانت کار یہودیوں کے ناپاک و ناجائز قبضے سے اس کی بازیابی کے لیے مجاہدانہ و دانشمندانہ کردار ادا کریں۔

تحفۂ نماز اور ہماری ذمے داری

اس مبارک اور انوکھے سفر کا سب سے بڑا تحفہ پانچ نمازوں کی فرضیت ہے، یہ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرمؐ کو عرش پر بلا کر عنایت فرمائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نماز مؤمن کی معراج ہے، جس طرح رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے عرش پر بلا کر مناجات کا شرف بخشا، اس طرح دوسرا کوئی آسمان پر نہیں جاسکتا، لیکن زمین پر رہتے ہوے اسے روحانی معراج نصیب ہوسکتی ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ اچھی طرح وضو کرکے، دنیا سے بے خبر ہوکر، نہایت خشوع و خضوع اور اخلاص کے ساتھ نماز کی نیت باندھے اور صفتِ احسان کے ساتھ نماز ادا کرے، یعنی اس طرح گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، لیکن اگر یہ چیز حاصل نہ ہو تو یہ یقین رکھے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، اس طرح اپنے رب سے مناجات کرسکتا ہے، گویا کہ اسے روحانی معراج اس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔

اس حدیثِ قدسی کا استحضار اس کے اندر لذتِ مناجات اور احساسِ معراج پیدا کرے گا:

«قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ وَلِعَبْـدِي مَـا

سَأَلَ. فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ﴿الْحَمْدُ للهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: حَمِدَنِي عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ قَالَ: مَجَّدَنِي عَبْدِي، فَإِذَا قَالَ: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ قَالَ: هَذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۞ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلا الضَّالِّينَ﴾ قَالَ: هَذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ». [صحيح مسلم]

"میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کی ہے، اور میرے بندے نے جو مانگا وہ اس کو ملے گا۔ جب بندہ «الْحَمْدُ للهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ» کہتا ہے: تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری تعریف کی ہے۔ اور جب کہتا ہے: «الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ» تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری ثناخوانی کی ہے، پھر جب وہ کہتا ہے: «مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ» تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے۔ پھر جب وہ کہتا ہے: «إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ» تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور میرے بندے نے جو طلب کیا ہے وہ اس کا حصہ ہے۔ اور جب وہ کہتا ہے: «اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۞ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلا الضَّالِّينَ» تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے نے جو مانگا

وہ اس کو ملے گا"۔ [مسلم شریف]

اس قصے میں رسول اللہ ﷺ کا دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت کرنا، آپ کی عظمتِ شان اور امام الانبیاء ہونے کے عقیدے کو مزید پختہ کرتا ہے، نیز اللہ جل جلالہ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے کہ راتوں رات اس نے اپنے محبوب کو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ پر بلایا اور پھر مکہ مکرمہ واپس پہنچا دیا جو نہایت غیر معمولی واقعہ ہے جسے صرف خدائے ذوالجلال ہی اپنی قدرت سے انجام دے سکتا ہے۔ اس قصے کے دروس میں سے غیب پر پورا ایمان لانا اور اعمالِ صالحہ کے بدلے انعامات کی نوازش اور بداعمالیوں کی پاداش میں عذاب و سزا میں مبتلا ہونا بھی شامل ہے۔

نبی آخر الزماں ؐ کی سخت آزمائش اور بے پناہ صبر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بے مثال تکریم و اعزاز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦﴾ [الشرح: ٥ – ٦]

"حقیقت یہ ہے کہ مشکلات کے ساتھ آسانی بھی ہوتی ہے، یقیناً مشکلات کے ساتھ آسانی بھی ہوتی ہے"۔ [سورۂ شرح: ۵-۶]

لہٰذا اگر کوئی خدانخواستہ مصائب میں گھرا ہوا ہے، یا گردشِ ایام کا شکار ہے، تو اس کو تقویٰ اور صبر کا دامن تھامے رہنا چاہیے، صبر دراصل کشادگی کی کنجی ہے، اس کے بدلے میں آخرت کا اجر تو یقینی ہے ہی، دنیا میں بھی بندے کو انعامات سے نوازا جاتا ہے، خواہ فوراً ہو یا کچھ تاخیر سے ہو — یہ خدائی نظام ہے جو شخص اس نظام کو سمجھ لیتا ہے، وہ ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ اتباعِ سنت میں اپنا مدعی مالک الملک، رب العالمین کی

بارگاہ میں پیش کرکے یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ وقتی مصیبت عن قریب دور ہوگی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

وصلى الله وسلم وبارك على سيدنا ونبينا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين.

❊ ❊ ❊